ISSN : 2455-0248

ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل

ادب و ثقافت ⑧

مارچ 2019

ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

5 نومبر 2018: ''یومِ آزاد تقاریب 2018'' کے افتتاحی اجلاس میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کا خطاب۔

15 نومبر 2018: مہمان خصوصی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے سبکدوش پروفیسر ایس اے آر بلگرامی
دوسری ''قومی اردو سماجی علوم کانگریس 2018'' کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے۔

22 نومبر 2018: ایک روزہ قومی سمینار ''احساس کا سفیر: گلزار'' میں کلام و پیام پیش کرتے ہوئے جناب گلزار۔

ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل

ادب و ثقافت

8

مارچ 2019

مدیر

پروفیسر محمد ظفرالدین

ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Directorate of Translation & Publications
Maulana Azad National Urdu University

Adab-o-Saqafat

(Bi-Annual Research & Refereed Journal)

Issue: 8 March, 2019

ISSN : 2455-0248 UGC Approved Journal

ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کا تحقیقی اور ریفریڈ جریدہ

ششماہی **ادب وثقافت** حیدرآباد

ناشر : ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد - 500032 (تلنگانہ)

طباعت : پرنٹ ٹائم اینڈ بزنس انٹرپرائزز، حیدرآباد

رابطہ : 09347690095

ای میل : *dtpmanuu@gmail.com*

مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

سرپرست اعلیٰ

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، شیخ الجامعہ

ایڈیٹوریل بورڈ

پروفیسر شمیم حنفی، نئی دہلی

پروفیسر شارب ردولوی، لکھنؤ

پروفیسر عتیق اللہ، نئی دہلی

پروفیسر بیگ احساس، حیدرآباد

پروفیسر نسیم الدین فریس، حیدرآباد

پروفیسر عبدالستار دلوی، ممبئی

پروفیسر اشرف رفیع، حیدرآباد

پروفیسر م۔ن۔سعید، بنگلور

پروفیسر وہاب قیصر، حیدرآباد

پروفیسر محمد فاروق بخشی، حیدرآباد

جناب انیس اعظمی، حیدرآباد

فہرست

	شذرات	ایڈیٹر	6-10
1۔	پنجابی آمیز اردو کے چند قدیم رسائل	پروفیسر فیروز احمد	11-28
2۔	آگرہ بازار: نقد کے میزان میں	پروفیسر محمد شاہد حسین	29-45
3۔	1857ء کے غدر سے قبل اردو کی غیر افسانوی نثری اصناف	پروفیسر مجید بیدار	46-55
4۔	مولانا آزاد اور علامہ شبلی نعمانی	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	56-67
5۔	قمر رئیس کا تنقیدی سفر (شاعری اور شاعروں کے حوالے سے)	پروفیسر علی احمد فاطمی	68-98
6۔	لِسانی اور فنی ہُنر مندی کا با کمال نمونہ فیاض رفعت کا ناول ''بنارس والی گلی''	پروفیسر شہزاد انجم	99-115
7۔	1857ء اور خواجہ الطاف حسین حالی	پروفیسر سراج الدین اجملی	116-122
8۔	کہ زمانہ اُس کو بھلا نہ دے	ارمان نجمی	123-161
9۔	مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی و بااختیاری میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کا رول۔ ایک تحقیقی جائزہ	ڈاکٹر آمنہ تحسین / آمنہ تبسم	162-189
10۔	مقبولِ عام ادب ابنِ صفی اور صنفی مساوات	ڈاکٹر اقبال النساء	190-199
11۔	مولانا گیلانی اور سیرت رسولؐ	ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی	200-210

12۔ علامہ سید مناظر احسن گیلانی کے محققین، ناقدین اور مبصرین: ایک تجزیاتی مطالعہ	فاروق اعظم قاسمی	211-227
13۔ قطب شاہی عہد کا تاریخی، تہذیبی و ادبی پس منظر	ڈاکٹر نشاط احمد	228-242
14۔ سورت کی کہانی۔ شاعروں کی زبانی	ڈاکٹر سعیدہ پٹیل	243-256
15۔ دَکن کا شعری نابغہ: نصرتی	ڈاکٹر غضنفر اقبال	257-264
16۔ فراقؔ گورکھپوری: ایک نفسیاتی مطالعہ	ڈاکٹر مزمل سرکھوت	265-276
17۔ میر تقی میرؔ کی ایک غزل کی دو قرائتیں	ڈاکٹر علی عباس	277-291
18۔ غالب اور غالبیات : ایک مطالعہ	ڈاکٹر سرفراز جاوید	292-325
19۔ ترجمہ اور نظریۂ مداخلت	محمد طارق	326-344

شذرات

انسٹرکشنل میڈیا سنٹر کی بلند پروازی

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے تحقیقی جریدے 'ادب و ثقافت' کا آٹھواں شمارہ پیش ہے جس میں حسبِ سابق ادب کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل مضامین پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

****

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں ایک پُروقار انسٹرکشنل میڈیا سنٹر بھی قائم ہے جس کا مقصد آڈیو ویژول سطح پر تدریسی اور معلوماتی مواد فراہم کرنا ہے۔ یہ کام یہاں جدید تکنالوجی کی مدد سے سرانجام دیا جارہا ہے اور علمی وفنی سطح پر ندرت پیدا کی جارہی ہے۔ حالیہ عرصے میں اس سنٹر نے کئی معرکے سرانجام دیے جس کی پذیرائی علمی حلقے میں کی جارہی ہے۔ وگیان پرسار' محکمہ سائنس وٹکنالوجی حکومت ہند نے انسٹرکشنل میڈیا سنٹر کی تین فلموں کو نویں قومی سائنس فلم فیسٹول 2019 کے لیے منتخب کیا۔ یہ فیسٹول 27 تا 31 جنوری 2019 موہالی، چنڈی گڑھ میں منعقد ہوا۔ ان تینوں فلموں کا تعلق میڈیا سنٹر کی ''مانو نالج سیریز'' سے ہے جو اُردو میں تیار کی گئی ہیں۔ یہ تین فلمیں ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام، پروفیسر یو آر راؤ اور اسٹیفن ہاکنگ سے متعلق ہیں جو فیسٹیول کے انٹرفیس زمرہ میں منتخب ہوئی ہیں۔ اس زمرہ میں مجموعی طور پر 15 میں سے 3 فلموں کا تعلق اُردو یونیورسٹی سے ہے گویا 20 فیصد فلمیں مانو کی ہیں۔ یہ یونیورسٹی کے لیے اعزاز اور افتخار کا باعث ہے۔ اب اُردو زبان میں تیار یہ فلمیں وگیان پرسار کے ذریعہ پوری دنیا میں بھیجی جائیں گی۔

انسٹرکشنل میڈیا سنٹر نے فروری 2019ء میں فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹیٹیوٹ آف انڈیا، پونے کے اشتراک سے 5 روزہ فلم اپریسی ایشن کورس کا انعقاد کیا جس میں 84 شرکا موجود تھے۔اس مختصر مدتی کورس کا ایف ٹی آئی آئی کے پروگرام SKIFT (ہندوستان میں فلم اور ٹیلی ویژن کی مہارت) کے تحت مختلف شہروں میں اہتمام کیا جارہا ہے۔اسی اشتراک کے تحت دوسرا کورس موبائل فلم میکنگ پر منعقد کرنے کا بھی منصوبہ ہے۔ اس کے علاوہ اکتوبر 2018 میں انسٹرکشنل میڈیا سنٹر نے ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی کے تعاون سے چار روزہ فیسٹول کا انعقاد کیا تھا جس میں سنٹر کے فلم کلب ''سنیما تھک مانو'' کا افتتاح بدست وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز عمل میں آیا۔قونصل خانہ ایران کے قونصل اور کلچرل اتاشی نے اس پروگرام میں شرکت کی۔ اس فیسٹول میں ممتاز ایرانی فلم ساز رضا میر کریمی کی فلم 'اے کیوب آف شوگر' سمیت 11 فلموں کی نمائش کی گئی اور میڈیا سنٹر میں مشہور ایرانی آرٹسٹ محمود فرشیان کی پینٹنگس اور دیگر دستکاری مصنوعات پر مشتمل نمائش کا کا اہتمام کیا گیا۔

****

یونیورسٹی نے ماہ جنوری 2019 میں اپنے قیام کے مقاصد کے حصول کی جانب ایک زبردست جست لگائی جب اس نے اقوام متحدہ پاپولیشن فنڈ کے اشتراک سے ریاست بہار کے دینی مدارس کے نوبالغ طلبا کے تعلیمی پروگرام (اے ای پی) کے تجرباتی پراجکٹ کا آغاز کیا۔اس پراجکٹ کا مقصد طلبا کی تربیت، صلاحیت میں اضافہ اور تاحیات اکتساب کی سہولت کی فراہمی ہے۔ابتدا میں اس پراجکٹ کی مدت ایک سال ہوگی اور اس کے لیے 1,11,595 امریکی ڈالر کا بجٹ مختص کیا گیا ہے۔اس کے تحت بہار کے 4 اضلاع کشن گنج،ارریہ، پورنیہ اور کٹیہار میں جملہ 757 مدارس کا احاطہ کیا جائے گا۔

****

یونیورسٹی میں 28/ فروری 1/ مارچ کو دو روزہ ''قومی اُردو سائنس کانگریس'' کا انعقاد ہوا۔اس پروگرام میں ''اُردو ماہنامہ سائنس'' کے 25 سال مکمل ہونے پر اس کے رسمِ اجرا کا ایک سیشن رکھا گیا۔ پروگرام کے افتتاحی اجلاس میں ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کی

سائنسی موضوعات پر شائع شدہ تین کتابوں کا بدستِ وائس چانسلر اجرا عمل میں آیا۔ ان میں سے پہلی کتاب ڈاکٹر عابد معز کی تحریر شدہ ''توضیحی فرہنگ (غذا اور تغذیہ)'' دوسری کتاب ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی کی تحریر شدہ 'بنیادی اصول حشریات' اور تیسری کتاب ''ڈیجیٹل الکٹرانکس اینڈ کمپیوٹر آرکیٹکچر'' محبوب الحق کی تصنیف ہے۔ یہ کتابیں اردو میں سائنسی مواد میں دلچسپی رکھنے والے قارئین اور گریجویٹ و پوسٹ گریجویٹ طلبا کے لیے کافی کارآمد ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈائرکٹوریٹ میں سائنس کے موضوعات پر کتابوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ شعبے کی جانب سے کتابوں کی اشاعت کے اس تسلسل میں مزید تیزی آئے گی اور شعبے کے قیام کا وہ بنیادی مقصد پورا ہوتا جائے گا جس کے تحت اُردو کو سائنس اور ٹکنالوجی کی زبان بنانا ہے۔

****

ادب و ثقافت کا یہ آٹھواں دیدہ زیب شمارہ مختلف موضوعات پر مبنی مضامین کے ساتھ آپ کے سامنے موجود ہے۔ مقام مسرت ہے کہ ادب و ثقافت کو بے شمار قیمتی مضامین موصول ہورہے ہیں جن سے جریدے کی مقبولیت اور اس کے تئیں لوگوں کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر ہماری مجبوری ہے کہ ہم جریدے کی تنگ دامانی کے سبب منتخب مضامین ہی شائع کر سکتے ہیں۔

پروفیسر فیروز احمد نے اپنے مضمون میں پنجابی آمیز اردو کے چند قدیم رسائل کو اپنا موضوع بناتے ہوئے مخطوطات کی شکل میں موجود گیارہ رسائل کا تفصیلی اور تحقیقی تجزیہ کیا ہے۔ اس تجزیہ میں ان رسائل کے مصنفین' طرز تحریر' زمانہ تحریر' کاغذ' اندازِ کتابت' مصنفین کی جائے رہائش اور محققینِ اردو کے کلام میں ان مصنفین کے ذکر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر محمد شاہد حسین اپنے مضمون میں حبیب تنویر کے خوبصورت ڈرامے 'آگرہ بازار' کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک ڈرامہ نہیں بلکہ ایک عہد کا رزمیہ ہے جس میں عوامی زندگی تہذیبی' تاریخی اور سماجی شعور کو پیش کیا گیا ہے اور ڈرامے میں ایسے کردار تخلیق کیے گئے ہیں جو حقیقی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ پروفیسر مجید بیدار نے اپنے مضمون میں 1857ء کے غدر سے قبل اُردو کی غیر افسانوی نثری اصناف کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ مضمون نگاری' مکتوب نگاری اور سفر نگاری کی اصناف غدر سے

پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں اور یہ ایک غلط تصور ہے کہ انگریزوں کی توجہ سے اُردو کی شعری و نثری اصناف کو فروغ حاصل ہوا۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے اپنے مضمون میں ''مولانا آزاد اور علامہ شبلی نعمانی'' میں ان دو نابغۂ روزگار شخصیات کے درمیان تعلقات کا ذکر کیا ہے اور حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ عمروں میں تفاوت کے باوجود دونوں میں دوستانہ بے تکلفی تھی اور دونوں نے ایک دوسرے سے اثرات قبول کرنے کے باوجود اپنی اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کا مضمون ''قمر رئیس کا تنقیدی سفر (شاعری اور شاعروں کے حوالے سے)'' قمر رئیس کے چند اہم شاعروں پر لکھے گئے مضامین کا تجزیہ ہے۔ مضمون نگار کہتے ہیں کہ قمر رئیس کے ادارے ادبی و تنقیدی نظریے کے مطابق خاص اہمیت کے حامل ہیں اور انہیں یکجا کرنا اور ان کا تجزیہ کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم اپنے مضمون میں فیاض رفعت کے ناول ''بنارس والی گلی'' کی منظر کشی، جزئیات نگاری، اندازِ بیان، فنی ہنرمندی کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فیاض رفعت نے کہانی کو سحر انگیز ناول کا روپ دیا ہے اور اس ناول کی علمی و ادبی حلقوں میں اچھی پذیرائی ہوگی۔ پروفیسر سید سراج الدین اجملی نے اپنے مضمون میں 1857ء کے واقعات کے تئیں خواجہ الطاف حسین حالی کے ردعمل کو بتایا ہے اور کہا ہے کہ ان کا ردعمل غالب، سرسید، فضل حق خیر آبادی اور امام بخش صہبائی سے مختلف تھا۔ جناب ارمان نجمی نے اپنے مضمون ''کہ زمانہ اس کو بھلا نہ دے'' میں مشہور شاعر کلیم عاجز کی زندگی کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے لیے ان کی خودنوشت 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' کو بنیاد بنایا ہے۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین اور آمنہ تبسم نے مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی و بااختیاری میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے رول کا تحقیقی جائزہ لیا ہے اور اعداد و شمار کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کا قیام اس مقصد کے حصول کے لیے معاون و مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر اقبال النساء نے اپنے مضمون میں اُردو کے مشہور جاسوسی ناولوں کے خالق ابن صفی کو موضوع بنایا ہے اور ان کے ناولوں میں صنفی مساوات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ ابن صفی نے کبھی بھی عورت کو مرد سے کمتر نہیں سمجھا۔ ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی نے سیرت نبویؐ کے موضوع پر لکھی گئی مولانا گیلانی کی کتاب ''النبی الخاتم'' کے حوالے سے مصنف کے اندازِ تحریر کا جائزہ لیا ہے۔ جناب فاروق اعظم قاسمی نے علامہ سید مناظر احسن گیلانی کی حیات و خدمات پر

تحقیق، تنقید اور تبصرہ کرنے والے مضامین کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر نشاط احمد نے اپنے مضمون میں قطب شاہی عہد کے تاریخی، تہذیبی اور ادبی پس منظر کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر سعیدہ پٹیل نے ہندوستان کے مغربی ساحلِ سمندر پر واقع خوبصورت بندرگاہی شہر سورت کی تاریخ کو شاعری کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال نے اپنے مضمون میں دکن کے عادل شاہی دور کے مشہور سخنور نصرتی کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر مزمل سرکھوت نے فراق گورکھپوری کی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فراق کی شاعری قدیم ہندوستانی ادب کے ساتھ ساتھ اُردو اور انگریزی ادب کی درخشاں شعری روایت سے بھی استفادہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر علی عباس اپنے مضمون ''میر تقی میر کی ایک غزل کی دو قرائتیں'' میں میر کی اُس غزل کو موضوع بنایا ہے جس کے متن کی قرات پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر انیس اشفاق نے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر سرفراز جاوید نے اپنے مضمون ''غالب اور غالبیات: ایک مطالعہ'' میں پروفیسر عبدالحق کا بطور ماہر غالبیات جائزہ لیا ہے۔ جناب محمد طارق نے علمِ ترجمہ کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ترجمہ میں نظریۂ مداخلت پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ ترجمہ میں مداخلت کا عمل شعوری طور پر ہونا چاہیے۔

****

اس جریدے کے سبھی شمارے اُردو یونیورسٹی ویب سائٹ پر بھی ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کے تحت بتدریج اپ لوڈ کیے جاتے ہیں۔ قارئین مزید استفادہ کر سکتے ہیں۔ شکریہ!

پروفیسر محمد ظفر الدین

ایڈیٹر

(ڈائرکٹر۔ ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز)

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:11-28
Prof. Feroz Ahmad, Punjabi Amez Urdu ke Chand Qadeem Rasail

فیروز احمد

پنجابی آمیز اردو کے چند قدیم رسائل

راقم کے پاس چند ایسے مخطوطات موجود ہیں جن سے اردو کی ادبی تاریخ کے تسلسل اور ترقی کی داستان وابستہ ہے۔ اس قسم کے دو مخطوطات کتابی صورت میں شائع بھی کیے جا چکے ہیں۔ ان میں ایک باغ و بہار (خطی نسخہ) مطبوعہ 2012 ہے اور دوسری بکٹ کہانی (قدیم ترین متن) مطبوعہ 2017 ہے۔ پیش نظر مضمون میں ایسے ہی ایک قدیم مخطوطہ کا تعارف مقصود ہے جس میں ایک یا دو نہیں بلکہ تیرہ (13) منظوم رسائل ہیں۔ یہ سبھی رسالے تین مختلف مصنفین کے تصنیف کردہ ہیں جن کے نام یہ ہیں: عبداللہ، محمد جان اور نورالدین متخلص بہ حافظ۔ ان میں محمد جان اور حافظ کے ایک ایک رسالے ہیں جب کہ عبداللہ کی دو مناجات کے علاوہ ان کے رسائل کی تعداد گیارہ ہے۔ فی الوقت محمد جان اور حافظ کے رسائل سے قطع نظر، یہی گیارہ رسائل ہمارے پیش نظر ہیں جو مذہب ہونے کے ساتھ انتہائی خوش خط بھی ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں:

(1) کتاب نصِ فرائض (2) انواع العلوم (3) رسالہ حصار الایمان (4) رسالہ تحفۃ الفقہ (5) رسالہ معرفۃ الایمان (6) رسالہ خیر العاشقین خورد (7) کتاب مستطاب خیر العاشقین کلاں (8) رسالہ خلاصۃ المعاملات (9) کتاب فرائض شرح سراجی (10) رسالہ فرائض (11) رسالہ صیقل دلہائے موموناں

آخر الذکر رسالہ ناقص آلاخر ہے باقی تمام لوح سے تمت تک محفوظ اور مکمل ہیں۔

عبداللہ کے یہ رسائل موٹے کاغذ پر جواب گدلا ہو چکا ہے، سیاہ و سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ سرخ روشنائی کا استعمال زیادہ تر رسائل کے نام، ان میں درج عنوانات/ابواب یا

شاعر کے نام اور تخلص کے لیے کیا گیا ہے۔ اکثر ترقیمہ بھی سرخ روشنائی سے ہی لکھا گیا ہے۔ ان ترقیموں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ رسالے اور اس کے مصنف کا نام کیا ہے یا یہ کہ ان کی تصنیف کب اور کس سنہ میں عمل میں آئی، لیکن یہ رسائل خود مصنف کے تحریر کردہ ہیں یا بعد ازاں ان کی افادی و مقصدی حیثیت کے پیش نظر کسی دوسرے شخص نے انہیں نقل کر دیا۔ اگر ایسا ہے تو کاتب کون ہے اور اس نے ان رسائل کو کب، کہاں اور کس نسخے سے نقل کیا، اس کا کوئی ثبوت عبداللہ کے رسائل سے ملتا ہے اور نا ہی ان دوسرے رسالوں سے جو محمد جان اور نورالدین حافظ کے تصنیف کردہ ہیں۔ ان تینوں مصنفین کے رسائل کا کاتب بھی کوئی ایک ہی شخص ہے۔ اس کاتب نے محمد جان اور حافظ کے لیے تو نہیں البتہ عبداللہ کے لیے دعائیہ کلمہ ''غفراللہ تعالےٰ لہٗ/ یا غفراللہ تعالےٰ لہ ولوادیہ'' لکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبداللہ کے یہ رسائل مصنف کی حیات میں نہیں بلکہ بعد ازاں نقل کیے گئے۔ اب اگر ان رسائل کے کاغذ اور کتابت کے انداز کو پیش نظر رکھا جائے تو قیاساً انہیں اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل کا مکتوبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ سبھی رسائل جیسا کہ ذکر کیا گیا، منظوم اور مذہّب ہیں۔ ان کے آغاز اور اختتام پر مصنف کے نام کے ساتھ اس کی وطنی نسبت بھی ظاہر کی گئی ہے۔ چنانچہ عبداللہ کو 'لاہوری' اور آخرالذکر رسالے مسمی فرائض میں 'واعظ ملتانی' (1) لکھا گیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عبداللہ کا تعلق پنجاب کے شہر لاہور اور ملتان دونوں سے رہا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ لاہور میں زیادہ وقت گزارنے کے بعد وہ ملتان منتقل ہو گئے ہوں اور وہاں ایک واعظ کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہوں۔ وقتاً فوقتاً لکھے گئے ان رسالوں میں انہوں نے جو تخلص اختیار کیا وہ عبدؔ، عبدیؔ اور کہیں کہیں اصل نام عبدؔاللہ ہے۔ اس کے علاوہ دو مزید الفاظ 'عاصی' اور 'فقیر' بھی موجود ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ عجز و انکسار کا بدل ہیں، تخلص نہیں۔

محمود شیرانی جو پنجاب کو اردو کا مولد و مسکن قرار دیتے ہیں، ان عبداللہ متخلص بہ عبدیؔ سے واقف ہیں۔ ایک مقام پر پنجاب کے ابتدائی شعرا کی خدمات کے ذیل میں وہ لکھتے ہیں:

''پنجاب کے علما نے بے شمار کتابیں اور رسالے اس نظر سے تصنیف کیے ہیں کہ مسلمان جماعت کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ احکام دین روزے، نماز اور مسائل شریعہ سے ضروری واقفیت

حاصل کر سکے۔ایسی کتابیں اکثر مختصر نظم کی صورت میں ہوتی تھیں تا کہ لوگ آسانی سے یاد کر سکیں۔جاہل طبقہ کے لیے یہ طریقۂ تعلیم مسلمانوں نے ہندوستان کی باقی زبانوں میں بھی اختیار کیا ہے۔پنجابی میں ایسی تالیفات کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔اگرچہ تحقیق معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ کس زمانے سے شروع ہوتا ہے لیکن اس کے قدیم ہونے میں کوئی شک نہیں کیوں کہ عہد اکبری کی ایسی تالیفات اب بھی موجود ہیں۔ان میں مولانا عبدی ابن محمد ساکن باتو کا رسالہ مہتدی سب سے مقدم ہے جو 997ھ کی تصنیف ہے.........مولانا عبدی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو جہانگیر کے عہد سے شروع کر کے شاہجہاں کے آخر ایام تک برابر چالیس سال تک تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔شرعیات ان کا میدان ہے اور اسی میں تمام عمر گزار دی۔ان کی پہلی تصنیف تحفہ 1025ھ میں اور آخری کتاب خیر العاشقین 1065ھ میں ختم ہوتی ہے۔خلاصہ 1034ھ میں،انواع العلوم 1044ھ میں،خیر العاشقین کلاں 1054ھ میں اور سراجی 1058ھ نظم ہوئی۔مولانا عبدی کے حالات زندگی سے ہم ناواقف ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے علوم دین اور فقہ کی زبردست خدمت کی ہے۔''(2) پنجاب میں اردو ص 53

اس اقتباس میں دو عبدی تخلص کے شاعروں کا ذکر ہے۔ان میں سے ایک رسالۂ مہتدی کا مصنف ہے اور دوسرا پانچ مختلف رسائل کا۔محمود شیرانی نے اس دوسرے عبدی کے تصنیف کردہ رسائل کے جو نام لکھے ہیں، کسی قدر اختلاف کے ساتھ وہی ہمارے پیش نظر رسالوں میں بھی موجود ہیں۔شیرانی کے حوالے سے ہی عبدی کے ان پانچ رسائل کا ذکر جمیل جالبی نے بھی کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''شاہ حسین کے بعد پنجاب میں مولانا عبداللہ عبدی کی آواز سنائی دیتی ہے۔اپنی صلاحیتوں کے قلم کو تبلیغ دین اور عام آدمی کی تعلیم اور اصلاح کے لیے استعمال کرتے ہیں۔''(3)

اس کے بعد جمیل جالبی نے محمود شیرانی کے مندرجہ بالا اقتباس کی آخری چند سطور جو 'جہانگیر کے عہد سے شروع ہو کر...........زبردست خدمت کی ہے'۔تک پھیلی ہوئی ہیں، درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ان کا سارا کلام پنجابی میں ہے اور اس کے اکثر اشعار پر وہی رنگ چڑھا ہے جو قدیم اردو کا رنگ ہے۔ جہاں علاقائی رنگ گہرا ہوتا ہے وہ پنجابی بن جاتا ہے اور جہاں وہ

ملک گیر سطح پر اٹھتے ہیں وہاں ان کا رنگ قدیم اردو کا ہو جاتا ہے۔"(4) اردو ادب کی تاریخ جلد پنجم ص 624..

عبداللہ کے رسائل کی زبان بلاشبہ پنجابی یا پنجابی آمیز اردو ہے جس کا اندازہ آگے چل کر ان مثالوں سے ہوگا جو ان رسائل کے اجمالی جائزے میں پیش کی گئی ہیں، یہاں مقصود یہ ہے کہ محمود شیرانی اور جمیل جالبی دونوں نے عبداللہ کے رسائل کے جو نام لکھے ہیں وہ درست نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً تحفہ کا اصل نام تحفۃ الفقہ، خلاصہ کا نام خلاصۃ المعاملات (خلاصۂ معاملات)، خیر العاشقین کا نام خیر العاشقین خورد ہے۔ سراجی کے نام سے فی نفسہ کوئی رسالہ نہیں۔ البتہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ عبداللہ کا رسالہ 'کتاب فرائض' ہی سراجی ہے اور یہ اصلاً فارسی کی مشہور کتاب سراجی کی شرح ہے۔ ہمارے پیش نظر رسالے 'کتاب فرائض' میں اس کا نام اس طرح درج ہے؛

'کتاب فرائض شرح سراجی تصنیف و تالیف میاں عبداللہ غفر اللہ تعالےٰ لہٗ'

اسی رسالے کا درج ذیل شعر بھی اس پر دال ہے:

اس ناؤ فرائض شرح سراجی جیں وچ تر کا علم
جو اس پہرے سو کرے نہ دعوا دایم پکرے حلم

معلوم ہوتا ہے کہ محمود شیرانی اور ان کے بعد جمیل جالبی کو عبداللہ کے مذکورہ پانچ رسائل کے علاوہ دوسرے کسی رسالے کا علم نہیں ہو سکا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ محمود شیرانی کے یہ دوسرے عبدیؔ اب تک کی معلومات کے مطابق پانچ نہیں بلکہ بیک وقت گیارہ (11) رسائل کے مصنف تھے۔ ان کے یہ رسائل شائع ہوئے یا نہیں، اس کا ہمیں علم نہیں لیکن گمان یہ ہے کہ اگر یہ شائع ہوتے تو محمود شیرانی یا جمیل جالبی کے یہاں ان کا ذکر ضرور ہوتا کہ ان رسائل سے اردو زبان کے تشکیلی دور میں پنجابی کے غالب اثرات کے مزید شواہد سامنے آتے ہیں۔

محمود شیرانی نے یہ صحیح لکھا ہے کہ عبداللہ کا تعلق عہد جہانگیر اور شاہجہاں سے تھا۔ ان کے اس بیان کی تائید جہاں عبداللہ کے رسالوں میں درج سنہ تصنیف سے ہوتی ہے وہیں 'کتاب مستطاب خیر العاشقین کلاں' کے درج ذیل اشعار بھی اس پر دال ہیں:

واجب اوپر رعیت ایہی ہر مہر کریئی دعا

شاہ جہانَ دِپی عاقبت خیر کرتوں رب خدا
عاصی عبدؔ سوال کریندا خالق تیرے در
عاقبت خیر ایمان سلامت شاہ جہاں دا کر

عبداللہ عبدؔی کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں۔ ان کے جن رسالوں کا ذکر کیا جا رہا ہے ان میں عبداللہ کو 'واعظ' بھی لکھا گیا ہے۔ ایک واعظ کی حیثیت سے ان کی زندگی کا واحد مقصد دین اسلام کی تعلیم و تربیت تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے دور کی اس زبان سہارا لیا جو کہنے کو تو اردو کا ابتدائی روپ ہے مگر اصلاً اس پر پنجابی زبان اور لہجے کا گہرا اثر ہے۔ اسلامی اقدار کی ترویج و اشاعت کے لیے انہوں نے وقتاً فوقتاً جو رسائل تصنیف کیے، ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وسیع المطالعہ تھے، ان کے ہر رسالے میں قران و حدیث کے علاوہ سابق میں مرتب شدہ دینی اور فقہی مسائل کی کتابوں سے استنباط کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبدؔی ان کتابوں کے حافظ تھے۔ وہ جب اور جس طرح چاہتے ہیں ان کتابوں کے مضامین کو نظم کر دیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی زبان اور بیان کا انداز اس درجہ پنجابی سے متاثر ہے کہ صحیح طور پر انہیں سمجھنا تو دور پڑھنا بھی مشکل ہے۔ ذیل میں ہم نے انہی رسائل کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان کی ترتیب اور اشعار کے متن کا اندراج مخطوطے کے عین مطابق ہے۔

(1) کتاب نصؔ فرائض تصنیف و تالیف حضرت میاں عبداللہ لاہوری غفراللہ تعالےٰ لہ

مخطوطے میں موجود یہ عبداللہ عبدؔی کا پہلا رسالہ ہے۔ 19 رسطری مسطر کے 58 صفحات پر پھیلے اس رسالے کی جدول سنہری ہے۔ اس میں اشعار کی جملہ تعداد 1083 ہے۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں اور یہ جن موضوعات پر محیط ہے ان کے نام یہ ہیں:

حمد، در بیان ثناء باری تعالےٰ عزاسمہ، در بیان نعت حضرت سید المرسلین و خاتم النبین محمد رسول اللہ صل اللہ و علیہ سلم، در بیان شانزدہ صفت مومن، در بیان صفت ایمان، در بیان اقسام فرائض، در بیان حد و تعزیر، در بیان اقسام رجعی و غیر، در بیان حیض و نفاس و فرض کفایہ، باب در سنت و احکام شریعت، در بیان وضو و غسل و موزہ مسافر و صاحب عذر، باب در غسل، باب در تیمّم

فرمایند، باب درمسح وموزہ، درفرض کفایہ گوید، درواجبات نماز گوید، درواجبات کہ موجب سجدۂ سہو نہ اند، در بیان سجدہ ٔ تلاوت گوید، در بیان سنت نماز گوید، در مستحبات نماز گوید، درمفسدات نماز گوید، درمکروہات نماز گوید، درمواضع کہ مکروہ است درآنجا نماز، در بیان اوقات نماز، در بیان آں کہ اذان اومکروہ است، در بیان امامت مکروہ، در بیان آں کہ امامت روا نیست، درحقیقت امام گوید، در بیان شناختن اوقات نماز، در روزۂ ماہ رمضان گوید، درسوگندوظہار وسیر فانی، در بیان مسائل ذبح وحلال، مکروہ، در بیان غسل میّت وکفن، درغسل وکفن میّت، درمسائل عیدین گوید، در نماز جمعہ گوید، در بیان آب مطلق دقید ومستعمل وغیرہ گوید، در بیان مسائل متفرقات گوید، در بیان مخالف شرع گوید، درمذمت شعر گوید، در بیان کوتاہ گردن وریش گوید، در بیان زکوٰۃ گوید، در بیان روزہ نہ داشتن، در بیان ہفتادوسہ فرقہ گویدوغیرہ وغیرہ

نصّ فرائض میں حمدیہ اشعار کی تعداد 28/ ہے۔اس کے ابتدائی دوشعر یہ ہیں:

اللہ واحد ربّ توں سچّا تیرائ راج (تیرائی۔ تیراہی)

جو کچھ کل جہان ہے سبّہہ تیرا محتاج (سبّہہ۔سب ہی)

الٰہی آدم حیّ کیتوئی آبوں خا کی تہیں کُل جُسّہ (کذا)

بادی تہیں دَم آدم تائیں آتش کنوں غصہ (کذا)

ذیل کا آخری شعر رسالے کے نام کی وضاحت کرتا ہے:

اس رسالے ناوٴ فرائض نَصّ تہیا تحقیقی

جواس پہرے تس اندر روشن رب دور کرتا ریکی (پہرے۔ پڑھے)

مندرجہ ذیل اشعار کے آخری شعر میں سنہ تاریخ بھی موجود ہے۔

کاتقصیر فقیر نوں اس وچ رسالیں ہوء (رسالیں۔رسالے)

معاف کرو تقصیر کل عیب نہ دہریوکوء (عیب نہ دہریوکوء۔کوئی ان پر عیب نہ دھرے)

کرہو دعاء فقیر نوں جلی ناوٴ خداء

رب فضل کریہی مومنا ایمان رہے بقاء

پیتریہ وَرہی ہزار یک ماہ اٹھّی شب راۃ

ایہہ ہجرت بعد رسالہ تم بجھو لیھونجات

قیاس ہے کہ اس آخری شعر کے الفاظ 'پیتر یہ وَرہی ہزار ہک' کا مطلب 1045ھ ہے۔گویا یہی نصّ فرائض کے لکھے جانے کی تاریخ ہے۔

(2) کتاب انواعِ العلوم تصنیف حضرت میاں عبداللہ غفراللہ تعالےٰ لہٗ ولوالدیہ

انواع العلوم کی ضخامت نص فرائض سے زیادہ ہے۔یہ سابق میں مذکور مسطر کے 140 رصفحات پر مشتمل ہے اور اس میں مجموعی طور پر 2751 اشعار ہیں۔اس میں موضوعات کے باب الگ الگ نہیں بلکہ مختلف کتابوں سے منتخب عقائد و مسائل نظم کیے گئے ہیں۔جن کتابوں کا نام بار بار آتا ہے وہ یہ ہیں؛

تحفۃ الفقہا،فتاویٰ،صحیح مسلم،کنز العباد،مفتاح الخیرات،نافع المسلمین،نصاب الاحتساب،غرائب،خلاصی،کنز الدقائق،شرح عقائد،حصن حصین،فصول عمادی،تنبیہ ابواللیث، شرح ملا اور انیس الواعظین وغیرہ۔

حمد (14 شعر) اور نعت (37 شعر) کے بعد درج ذیل اشعار آتے ہیں:

عاصی دا پیٔو والدہ کل فرزند نساء (پیٔو۔پتا یعنی باپ)
ہر استاد ہر مومن تائیں عاصی کریی دعاء
کرتوں فضل الٰہی انہاں کفریی وہم نہ آء
جنت جا ہک انہاں ہوویی ایمان رہے بقاء
انواعِ العلوم کتاب ایہہ اللہ دا فرمایا
رضا حقانی ظاہر ہویا جو عاصیؔ سمجھایا

نصّ فرائض کی طرح انواع العلوم پنجابی سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔یہ اشعار دیکھئے:

وت صلوٰۃ کہیو بیی پایاں جو اولا د رسول
وت اصحاباں ہر ہر مومن اکھو تہئیو قبول
چاری یار رسول دیی ہر جانیی سلطان
نوبت آیو آپنی اپنوین فضل بیان

وت حضرت نعمان جو شافعی احمد مالک بُجھہ (بُجھہ ۔ بوجھو، سمجھو)
مذہب سنّی ایہی جو خارج باطل اتھی شک نہ کُچھہ
موزہ مسح جنازہ میت روا جماعت
سنّی مذہب ایہی مومن بجھو لہو نجات (لہو ۔ جان لینا)

شاہجہانی دور کا ذکر بھی ضمناً آ گیا ہے:

ستّہ کران دی چوری ہالہ کیتی دین ~
شاہجہانی چار سیر ہکّو دِزِم بہترین
شاہجہانی پنج من چالیہ ہووے اَنّ (چالیہ ۔ چالیس) ~
عشر دوائیں صاحب اتھی اس کم تر نہ ظنّ
ایہی ضعیف روایت ایہی فتویٰ کہے امام ~
جیکو ہووی عُشر سلطانی دِیوِی کرِی تمام

انواع العلوم کے سنہ تصنیف سے متعلق اشعار یہ ہیں:

عاصی طمع دعاءدا کرِ ی رضا خداء
عاصی اکھے رب مومناں رب ایمان دہی لقاء
ہزار ہکّ وچوتالیہ ورہیاں ماہ اُتھی دِہ ضم
ہجرت بعد پچھان توں ایہہ رسالہ تم (تم ۔ تمام، مکمل)

ہمارے خیال میں انواع العلوم کا سنہ تصنیف 'ہزار ہک وچوتالیہ' یعنی 1044ھ ہے۔

(3) رسالہ حصار الایمان تصنیف و تالیف حضرت میاں عبداللہ غفراللہ تعالےٰ لہ

حصار الایمان 734 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

اللہ خالق کل خلائق واحد جیند اناؤ
ناتس عورت پتی پتا ماؤ پوناہِ گرانو (ناہِ ۔ نہ ہی)
بہن نہ اتھن صورت نہ اعضاء نہ خواب
ہن قراء نہ آون جاون حاجت ناہِ خطاب

ایک دوسرے مقام پر رسالے کا نام اس طرح درج ہے:

اس کہہ عبداللہ ناؤ کتابی کرسی رب عیان (کتابی۔کتاب)

حصار الایمان ناؤ اسی اللہ دا فرمان

انواع العلوم کی طرح حصار الایمان میں ابواب/عنوانات کی وضاحت الگ سے نہیں بلکہ اشعار کے ذریعہ کی گئی ہے۔ مثلاً اصل موضوع کے بیان سے قبل چند اشعار کچھ اس طرح ہیں ۔

ے اللہ باب آسان کر ایمانی مذکور

رکن ایمان تصدیق اقرار ایہہ مخلوق ظہور

ے اللہ باب طہارت ظاہر ہر غسل تیمّم کر

موزہ مسح مسافر ظاہر صاحب عذروں سر

ے اللہ باب مسافر ظاہر کر آسان الٰہی

مقصد او ہو ظاہر ہووی جو ارادہ آہی

حصار الایمان کے اختتامی اشعار یہ ہیں:

کا تقصیر فقیر نوں اس وچ رسالیی ہوء

جو دیکھے سو کریی صلاح عیب نہ رکھی کوء

ایہہ قدرت ہوویی جی کہیں دیوی اجر خداء

تس نوں دعاء فقیر کریندا ایمان رہس بقاء

عیب نہ رکھیی اس وچ جو نفسوں فرماء

دشمن نفسوں دین دا خبر کتابیں آء

عاصی طمع دعاء دا جی کر ناؤ خداء

راضی ہوئی رب تس بجہہ رسول خداء

لکھا اکہر جی رہیی جی رکھہ سنکھی کوء

لکھن ہارا پاپرا کل کل ماتیی ہوء

(4) رسالہ تحفۃ الفقہ تصنیف حضرت میاں عبداللہ غفر اللہ تعالےٰ لہ

محمود شیرانی اور جمیل جالبی کے یہاں اس کا ذکر ہے مگر نام صحیح نہیں ہے۔ یہ رسالہ 237 اشعار پر مشتمل ہے۔اس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے:

اللہ حمد ہمیشہ آیا ناہیں تس نہایت

تس ذات شروع خبر نہ ہووی ناہیں خبر نہایت

....

ایہہ کیتی تم کتاب ربّ مومن دل تہیں بُجّھہ

ایہہ حق ہک تہا اللہ کیتا اتھی شک نہ کُچّھہ

اس کے نام اور تاریخ کے اشعار یہ ہیں:

اس تحفہ نام کتاب دا کہد اعبدؔ فقیر

نزد الٰہی فاسداں نظری اندر تیر

....

کا تقصیر فقیر نوں اس وِچ رسالیی آء

جی کو دیکھو سو ہی غلط قلم اُپر چلاء

کتبوں دیکھی صحیح کریی دیوّس اجر خداء (دیوّس۔اس کو دیوے)

عاصیؔ کر دیی دعاء تس ایمان بخش خداء

عبد اللہؔ اکہی موموناں ایمان بخش خداء

ہجرت بعد ہزار ہک پنجونجہ سال فناء

سال شروع اَستھین پچھی ہک روز کیا دورات

ہور روز دو جھابڈ ہوار دا ہو یا تم نجات

'ہزار ہک پنجونجہ' سے مراد غالبًا 1055ھ ہے۔محمود شیرانی کے یہاں اس کا سنہ 1025ھ ہے۔ممکن ہے کہ راقم کا خیال غلط ہو۔

(5) رسالہ الٰہی معرفتؔ ایمان تصنیف و تالیف میاں عبداللہ لاہوری غفر اللہ لہ

محمود شیرانی اور جمیل جالبی کے یہاں اس کا ذکر نہیں ہے۔اس رسالے میں کل 218

اشعار ہیں۔موضوعِ کتاب نام سے ظاہر ہے۔اس کے آغاز و اختتام کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اللہ واحد خالق رازق اوسو ربّ غفور
ناتس ماؤ پیؤ عورت پتی دِیرا ناہ ظہور
ناتس کمر زیادتی جنبش ناہ قرار
ناتس کہاون پیون پوشش ناہیں خواب ظہار (کہاون پیون۔کھانا پینا)

....

اورک ناہیں فضل دا کیا کچھ عبد سناء
مقصد کل تس ہے جنہی کسی یاد خداء
استہیں نافع مردکو جی کسیی نفع نساء
عاصی طمع دعاء دا کرنیں ناؤ خداء
عاصی کریی دعاء انہاں نوں ایمان رہے بقاء
انہاں راضی اللہ جنّت جا ہِک کریی فضل خداء

معرفت ایمان کے زمانۂ تصنیف سے متعلق شعر یہ ہے:

دَہے ورہیاں پنج تی چالیہ ہِک ماہینا ضم
تاریخ ہستو یہوین ہجرت بعد ایہ رسالہ تم

'دہے ورہیاں پنج تی چالیہ' سے مراد غالباً 1054ھ ہے۔

(6) رسالہ خیر العاشقین خورد تصنیف حضرت میاں عبداللہ لاہوری غفر اللہ تعالیٰ لہ

مخطوطے میں خیر العاشقین کے نام سے دو رسائل ہیں۔ایک تو یہی جسے خیر العاشقین خورد کہا گیا ہے اور دوسرا خیر العاشقین کلاں۔محمود شیرانی اور جمیل جالبی کے یہاں ان دونوں رسالوں کے نام آئے ہیں۔خیر العاشقین خورد 371 اشعار پر مشتمل ہے۔اس کے ابتدائی چند اشعار یہ ہیں:

کہہ عبد اللہ اللہ کیسا ہَو رنہ کوء (اللہ کیسا۔اللہ جیسا)
اللہ لاشریک ہمیشہ، خیر ہمیشہ ہوء

اوّل آخر ظاہر باطن کردا ربّ فناء

اوّل آخر ظاہر باطن خلقت رب اوتہاء

جنّت دوزخ کُرسی عرش لوح قلم ارواح

ایہہ باقی کچھ وچ اُنہاں دی رکھّی رب الٰہ

عبدؔ ہمیشہ ہیں شرمندہ خالق تیری در

جو حق تیری بندگی عاصیؔ کیا نہ کر

....

اس ناوَ خیرؔ العاشقین آوے جس یقین

جو اس پَر یہی بُجھہ اللہ تس دا محکم رکھی دین

خیر العاشقین خورد کی تصنیف سے متعلق شعر یہ ہے:

ہجرت بعد ہزار ہِک پِچّھی ہَت وَرہی ضمّ

بُد ہوا ردہاری پیشی بعد ایہہ رسالہ تم

ہمارے خیال میں 'ہزار ہِک پِچّھی ہَت وَرہی' کا مطلب 1071ھ ہے۔

(7) کتاب مستطاب خیر العاشقین کلاں تالیف میاں عبداللہ غفراللہ تعالےٰ لہٗ خیر العاشقین کلاں کا یہ نسخہ 728/ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ بھی سابقہ رسائل کی طرح مذہّب ہے۔ اس کے متعدد اشعار اور مصرعے عبداللہ کے دوسرے رسائل اور خود زیرِ نظر خیر العاشقین کلاں میں بھی نظر آتے ہی۔ چند ابتدائی اور آخری اشعار درج ذیل ہیں:

اللہ خالق خلقت ہر ہر ربّ رزاق

ہر ہر خلقت رب غفار ہر ہر حاجت پاک

رب سمیع بصیر حلیم کریم رحیم

غفور غفار ستار عفو ہادی حیّ قدیم

باقی حق فتاح لطیف ملک عزیز حکیم

جبّار قہّار رضا روہّاب قادر حیّ قدیم

ربّ ودود ایہی موجود رحمان رحیم

اللہ واحد لاشریک خالق ربِّ کریم

....

کا تقصیر فقیر نوں اس وچ رسالیی آء

معاف کرہو تقصیر کل جملیی ناؤ خداء

خطا سواری سمجھ کیی تُساں دیویی اجر خداء (تُسّاں ۔ تجھے)

عاصی اکھیی رب ایمان اِنہاں نوں رکھہ بقاء

ایہہ علم کتابیی وچ اصولؔ وچ تہذیبؔ حسامی

وچ مسعودیؔ ہَور ہدائیی کیتا رب تمامی

انواع العلوم کی طرح اس رسالے میں بھی شاہؔ جہاں کا ذکر ہے ۔

واجب اوپر رعیت ایہی ہر مہر کرِیی دعاء

شاہجہانَ دِیی عاقبت خیر کرتوں رب خداء

عاصی عبد سوال کریندا خالق تیرے در

عاقبت خیر ایمان سلامت شاہجہاں دا کر

خیر العاشقین کلاں کا درج ذیل شعر تاریخ تصنیف سے متعلق ہے ۔

چورنجہ وَرہی ہزار یک حضرت بعد تمام

ہَور دِہ باوِیہواں ظہر وقت ایہہ کتب تمام

غالباً 'چورنجہ ورہی ہزار یک' کا مطلب 1045ھ ہے۔

(8) رسالہ خلاصۃؔ المعاملات (خلاصۂ معاملات) تصنیف حضرت میاں عبد اللہ غفر اللہ تعالےٰ لہ

نصّ فرائض اور انواع العلوم کی طرح خلاصۃ المعاملات بھی ایک ضخیم رسالہ ہے۔اس میں دین اسلام کے معاشرتی نظام اور اس کے فقہی مسائل کا ذکر بیشتر البیرونی کی کتاب قانن مسعودی (جو زیادہ تر مسعودیؔ کے نام سے معروف ہے) کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔جن

دوسری کتابوں سے بھی استنباط کیا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں؛ جامع رموز، فصول عمادی، مختار الفتاویٰ، نوادر، سراجی وغیرہ۔ اشعار کی تعداد 1150 ہے۔ عنوانات کی سرخیاں الگ سے نہیں بلکہ موضوع کو ہی نظم کر دیا گیا ہے۔ جیسے

ے اللہ باب آسان کر حضرتؔ دا مذکور (حضرت۔یعنی رسول اللہ)

ے اللہ باب آسان کر نکاحؔ دا مذکور

ے اللہ باب وکالتؔ ظاہر کر آسان الٰہی

رسالے کے اصل نام سے متعلق شعر یہ ہے

اس کتابی ناؤ خلاصہ مُعاملات مذکور

دو جہا وجہ عبادت ایہی جیی دل ترک خطور

ذیل میں چند ابتدائی اور آخری اشعار درج ہیں:

اللہ اکبر قولوںؔ فعلوں اول حمد مدام

حمد بجائیی نہ آوَیں جستھیی ناہیں اوہ تمام

اللہ واحد خالق رازق او ہور رب غفور (ہَور۔اور)

نال ارادت کلی عالم کیتس آپ ظہو (نال۔ساتھ)

اول آخر ظاہر باطن دایم رب ثناء

اول آخر ظاہر باطن حکم ربیّ دا آء

....

کا فقیر نوں اس وچ رسالیی آء

جیکو مومن ویکہ سواری راضی تس خداء (جیکو۔جس کو، ویکو۔اس کو)

ہزار یک تری تالیہ ورہیاں سادی دِہ ماہینی

ایہہ ہجرت بعد رسالہ تم کیتیی رب نہ کینیی

اغلباً 'ہزار یک تری تالیہ' کا مطلب 1033ھ ہے۔

(9) کتاب فرائض شرح سراجی تصنیف وتالیف میاں عبداللہ غفر اللہ تعالےٰ لہ وستر عیوبہ

عبداللہ نے اس رسالے کے اصل نام کا ذکر اس شعر میں کیا ہے:

اس ناؤ فرائض شرح سراجی جیں وچ ترکا علم
جو اِس پڑھے سو کریں نہ دعوا دائم پکریں حلم

اسی سلسلے کے بعض اشعار یہ بھی ہیں:

عبؔداللہ نوں فرمایا فقراں جوں صالح صحرا
ہِک نیت ترکا لیندی ایہن جنہاں کچھ نہ آ
عبؔداللہ سایل یارب خالق ایہہ کرتم کتاب
جو اس پڑھے رب رکھس عذابوں دیکھی ناہ عذاب

فرائض شرح سراجی 642 اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں بھی ابواب یا عنوانات کی سرخیاں الگ سے نہیں بلکہ سابق میں مذکور رسائل کی طرح اصل موضوع کو ہی نظم کر دیا گیا ہے اور چونکہ یہ رسالہ فارسی تصنیف سراجی کی شرح ہے، اس لیے اس میں جا بجا سراؔجی کے حوالے سے خاندانی وراثت اور ترکے کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔اس کے ابتدائی تین اشعار یہ ہیں:

اللہ اکبر حمد ہمیشہ اورک ناہیں کچھہ
اللہ بعد درود محمد کہن شمار نہ کچّھہ
وت درود اولا د رسول دیں ماؤ پیؤ ہر اصحاب
وت ہر استاد ہر مؤمن خالق بخش حساب
علم فرائض پڑھا ہو پڑھ ہو حضرت ایہہ فرمایا
علم کلّی اس ادہا فضل وچ کتاباں آیا

ذیل کے اشعار سنہ تصنیف سے متعلق ہیں:

ہزار ہک اُتہہ ونجہ وَر ہیاں ہکو ماہ بقاء فناء
چھہ روز تم ہَو رستواں دِیہہ وقت پشی در آء
ایہہ ہجرت بعد کتاب تم کیتا فضل خداء
اینہہ کہہ عاصی دعاء کریئں تس دیویں اجر خداء

ہمارا خیال ہے کہ 'ہزار ہک اتھہ (آٹھ) ونجہ (نو) ورہیاں' کا مطلب 1089ھ ہے۔

(10) رسالہ فرائضؔ تصنیف حضرت فضیلت دستگاہ، مقبول درگاہ سبحانی حضرت میاں عبداللہ واعظ ملتانی غفراللہ تعالےٰ

فرائض کے موضوع پر عبداللہ کے دو رسائل ہیں۔ ایک تو نصّ فرائض جس کا ذکر پہلے کیا گیا اور دوسرا زیرِ نظر رسالہ۔ یہ دوسرا رسالہ 218/اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا 'در بیان نکاح گویدؒ' سے ہوتی ہے۔ بعض اعتبار سے یہ رسالہ خاصا اہم ہے۔ اس کا درج ذیل شعر ملاحظہ کیجیے:

خصم فیر جی پہلا آیا اوہ دندہی دہونا رھیا (کذا)

وچ رسالیے ہندوی شیخ عبداللہ کہیا

یہ 'شیخ عبداللہ' کون ہیں۔ کیا وہی جن کا تخلص عبدؔ، عبدیؔ اور کہیں کہیں عبداللہؔ بھی ہے اور جو اکثر خود کو عاصیؔ اور فقیرؔ بھی لکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اب تک ہم نے عبداللہ کے جن رسالوں کا ذکر کیا، ان کا اصل نام شیخ عبداللہ ہے محض عبداللہ نہیں۔۔ دوسری بات یہ کہ ترقیمہ میں اس رسالے کی زبان کو 'ہندی' کہا گیا ہے۔ زبان کے لحاظ سے 'ہندوی/ ہندی' جیسے الفاظ عبداللہ کے کسی دوسرے رسالے میں نہیں آئے۔ یہی نہیں بلکہ عبداللہ کا یہی وہ رسالہ ہے جس میں انھیں 'واعظ ملتانی' بھی لکھا گیا ہے۔ ذیل میں اس کا ترقیمہ ملاحظہ کیجیے:

'تمت تمام شد ایں رسالہ گلگوں پیالہ در زبان ہندی تصنیف و تالیف فضیلت و کمالات دستگاہ مقبول درگاہ سبحانی حضرت میاں عبداللہ واعظ ملتانی غفراللہ تعالےٰ لہٗ'

عبداللہ کے اس رسالے میں سنہ تصنیف کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

وچ شرع دی جائز ناہیں اکّیی آکھہ نکاح

ست نسبتی ست سبی ایہن ست رضاع (کذا)

جیکو پچھہ اکھہ توں دیہہ جواب شتاب

شرع وقائی لکھیا وچ لکھیا وچ کنز کتاب

....

عورت کہندی کدھسیم مسئلے دااتفاق (کذا)

نقل تحفۃ الفقہا داواقع ہوئی طلاق

....

حیلہ ایہی شرع دااس وچ ناہیں شکّ

لکھیا ایہی متفرقات مسلہ ایہی حقّ

محمود شیرانی اور جمیل جالبی کے یہاں اس رسالے کا ذکر نہیں ہے۔

(11) رسالہ صیقل دلہائے موموناں تصنیف وتالیف حضرت میاں عبداللہ غفراللہ تعالےٰ

عبداللہ کا یہ آخری اور ناقص آلاخر رسالہ ہے۔ اس کے صرف چار اشعار باقی رہ گئے ہیں، اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کتنے اشعار پر مشتمل ہے یا یہ کہ اس کی تصنیف کب عمل میں آئی۔ صرف ترک 'الٰہی عبدی' موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آئیند ہ صفحے پر جواشعار ہوں گے ان کی ابتدا 'الٰہی عبدی' سے ہوئی ہوگی۔ رسالے کے ابتدائی چار اشعار درج ذیل ہیں:

اوّل اللہ حمد ہیی ناتس حمد شمار (ہیی ۔ ہے)

ربَّ خلقت نوں علم پچھایا ذاتی علم ظہار (پچھایا ۔ پنہچایا، عطا کیا)

رب تہیی پچہیی بہت درود حضرت بجہہ رسول (تہیی ۔ تھے؛ پچہیی ۔ پیچھے)

کرم تنہاں تی بہی شمار کیتا ربّ نزول

ظاہر باطن علم اوس جیی کچھہ فرع اصول

اوس دا ثانی ہور نہ کوئی کیتس آپ قبول

ایہہ دلدی صیقل کتاب فوائد جیی کسی روزیی ہوء (کذا)

فکر کریی اس لہر حقیقت توبہ کر کیی روء

اردو کے آغاز اورس کے ابتدئی گہوارے کے متعلق محمود شیرانی کے نظریے سے خواہ اتفاق نہ کیا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اردو پر پنجابی کے اثرات کی جو مثالیں فراہم کی

ہیں،ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔صرف ونحو، ذخیرۂ الفاظ، تلفظ، لہجہ اور آہنگ کے اعتبار سے اردو نے اپنے ابتدائی زمانے میں پنجابی سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔نہ صرف شمال بلکہ جنوب کے شعرا کے یہاں بھی پنجابی کے اثرات موجود ہیں۔محمود شیرانی اور ان کے بعد جمیل جالبی کی تاریخ ادب سے متعلق کتابوں میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔عبداللہ عبدیؔ ابتداً انہی محققین کی نظروں میں آئے اور اب چونکہ وہ ادبی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں،اس لیے ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم ان سے منسوب ایسے حقائق کو بھی سامنے لائیں جو اب تک نگاہوں سے پوشیدہ رہے۔

پروفیسر فیروز احمد (دہرہ دون)، صدر شعبہ اردو و فارسی، راجستھان یونیورسٹی رہ چکے ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:29-45
Prof. Mohd. Shahid Hussain, Agra Baazaar: Naqd ke Meezan mein

محمد شاہد حسین

آگرہ بازار: نقد کے میزان میں

''آگرہ بازار'' نظیر اکبرآبادی کی شاعری اور زندگی کو بنیاد بنا کر تیار کیا گیا ایک خوبصورت ڈراما ہے جس کو حبیب تنویر کی خوبصورت تحریر اور بے مثال ہدایت کاری نے آگرہ کی لوک روایات اور تہذیبی حسیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک بصری مرقع بنا دیا ہے۔ پیش کش کا منفرد انداز ناظرین کے دلوں پر ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ گوکہ اس میں سکہ بند پلاٹ نہیں جس میں ابتدا، وسط اور اختتام ناگزیر ہوتا ہے لیکن چھوٹے چھوٹے واقعات کو اس ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک عہد کا رزمیہ بن گیا ہے۔ اس میں عوامی زندگی کے نشیب وفراز کو تاریخی وسماجی شعور کے ذریعے مؤثر بنایا گیا ہے۔ حبیب تنویر نے اس میں عوامی زندگی کے جس تہذیبی، تاریخی اور سماجی شعور کو پیش کیا ہے وہ حقیقت نگاری کا بھی ایک نمونہ ہے۔ اس کا مشاہدہ یا قرأت انسان کو اسی عہد میں پہنچا دیتا ہے۔ کہنے کو تو یہ آگرہ کی کناری بازار کے ایک چوراہے کا مرقع ہے لیکن یہ پورے ہندوستان کی تہذیبی وسماجی اور اقتصادی حالت کا آئینہ دار ہے۔

14/ مارچ 1954ء کو یوم نظیر کے موقعے پر اسے پہلی بار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کھلے اسٹیج پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے پیش کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک نے جامعہ کی مٹی کو نم کرنا شروع کر دیا تھا اور پروفیسر محمد مجیب کے ثقافتی شعور نے اسے مزید سیرابی عطا کی۔ اداکاروں میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ دلی کے قرب وجوار کے دیہاتوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ تغلق آباد، بدرپور اور اوکھلا کی ناٹک منڈلیوں نے بھی اس میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

''آگرہ بازار'' کی ابتدااس طرح ہوتی ہے کہ آگرہ کے کناری بازار میں دوطرفہ دکانیں لگی ہوئی ہیں۔کمہار، پنواڑی، رنگ ریز، درزی، پنساری اور طبیب کی دکانیں مگران میں سے تین دکانوں کومرکزی حیثیت حاصل ہے۔کتب فروش کی دکان، پتنگ فروش کی دکان اور پان فروش کی دکان،ان کے علاوہ کچھ پھیری والے جیسے ککڑی والا،لڈو والا،تربوز والا، کان کی میل نکالنے والا، برف والا آواز لگالگا کر اپنا سامان فروخت کررہے ہیں یا اپنی خدمات پیش کررہے ہیں۔

بازار میں متوسط طبقے کے دیہات کے کچھ لوگ چل پھر رہے ہیں۔خرید وفروخت ایک طرح سے نہیں کے برابر ہے۔کچھ دکاندار حقے سے شوق کررہے ہیں، کچھ سورہے ہیں، کچھ بیٹھے کوئی کھیل کھیل رہے ہیں،ایک طرف بچے کھیل رہے ہیں۔

ابتدامیں دوفقیراسٹیج پرآتے ہیں اوراس پس منظر کی ترجمانی نظیر کی یہ نظم گاکر کرتے ہیں کہ:

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند رہتی ہے طبع سوچ میں لیل ونہار بند

دریا سخن کی فکر کا ہے موجدار بند ہوکس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند

جب آگرے کی خلق کا ہوروزگار بند

نظم ختم ہونے کے بعد مداری بندر کے ساتھ بازار میں آتا ہےاور بندر سے مزے مزے کی نقلیں کرواتا ہے۔بچے بوڑھے راہ گیرسب اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔جب پیسہ مانگنے کا وقت آتا ہےاور بندر مداری کے کہنے پر جاجا کرلوگوں کے پیر پر پیسے کے لئے سر رکھتا ہے۔تب ہی لڈو، ککڑی اورتربوز والے اپنا اپنا سامان فروخت کرنے کے لئے آواز لگانا شروع کردیتے ہیں اورلوگ ادھرادھر منتشر ہوجاتے ہیں۔پھر مداری،لڈو والا اور ککڑی والا آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔مداری کا کہنا تھا کہ تم لوگوں کی وجہ سے ہمارے تماشائی بغیر پیسہ دیئے چلے گئےلیکن دکاندار ایک ہوجاتے ہیں اور مداری اکیلا پڑ جاتا ہے۔مداری فضا اپنے خلاف دیکھ کر دھیرے سے نکل لیتا ہے۔پھر دکاندار آپس میں ہی الجھ جاتے ہیں اور باتوں ہی باتوں میں بات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی ہے۔کچھ خوانچوں کولوگ لوٹنے لگتے ہیں بہت سے دکاندار اپنی دکانیں بند کرنے لگتے

ہیں، بڑی مشکل سے ہنگامہ فروع ہوتا ہے۔سکون ہو جانے پر ککڑی والا، لڈو والا، تربوز والا آواز لگاتے ہوئے ہر آنے جانے والے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔لیکن کوئی ان کا سامان نہیں خریدتا۔ دوسرے لوگوں کے بھی کاروبار بند ہیں۔فقیر نظیؔر کی نظم ''روٹیاں'' گاتے ہوئے آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔اس سے ککڑی والے کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ اگر ہماری ککڑی پر بھی کوئی نظم لکھ دے تو یہ بکنے لگیں گی۔اور ہماری روزی روٹی کا انتظام ہو جائے گا۔ایک اجنبی کو گزرتا ہوا دیکھ کر اس کی طرف بڑھتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے پھر شاعر اور اس کے ساتھی کو آتا ہوا دیکھ کر ان سے بڑی لجاجت سے اپنی بات کہتا ہے مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کتابوں کی دکان پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔پھر شاعر کتب فروش کی دکان سے ایک کتاب اٹھا کر یہ شعر پڑھتا ہے ؎

تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج وتخت کا ۔۔۔ دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں

یہیں سے کتب فروش، شاعر اور ہمجولی کے درمیان میر تقی میؔر کے حالات زندگی پر گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔دورانِ گفتگو دلی کی بدحالی کا نقشہ بھی سامنے آتا ہے۔میؔر کے قیام لکھنؤ کے بیان کے ساتھ فرنگیوں کی لکھنؤ کی غارتگری کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔سلطنت مغلیہ کی حالت پر کتب فروش تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

کتب فروش: ....مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلطنت مغلیہ نہیں ہے،ایک قوی ہیکل شیر ببر ہے۔جس پر سیکڑوں کتے بلیوں نے حملہ کر دیا ہے۔اور اسے زخموں سے چور اور لاچار دیکھ کر آسمان سے چیل اور گدھ بھی جمع ہو گئے ہیں اور ٹھونگیں مار مار کر اس کا تکا بوٹی کر رہے ہیں۔اور وہ شیر ہے کہ نہ تو اسے کراہنے کی مہلت ہے اور نہ مرجانے کا یارا۔

شاعر اور ہمجولی دونوں کتب فروش کے فقروں کی خوب تعریف کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ شاعر کا دیوان چھاپنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔تب فقیر نظیر کی یہ نظم گاتے ہوئے گزرتے ہیں۔

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے ۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پھر غزل کی تنگ دامانی اور نظم کی وسعت داماں کا بھی ذکر آتا ہے تبھی ایک تذکرہ نویس آتا دکھائی دیتا ہے۔ ککڑی والا دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہے اور اس سے بھی ککڑی پر نظم لکھنے کی استدعا کرتا ہے مگر وہ جواب تک نہیں دیتا اور کتاب کی دکان پر چلا جاتا ہے۔ شاعر تذکرہ نویس سے کہتا ہے بیچارہ ککڑی والا صبح سے آپ کا انتظار کر رہا تھا کہ اپنی ککڑیوں پر نظم لکھوائے اور آپ نے جواب تک نہیں دیا۔ تذکرہ نویس کہتا ہے کہ میں ایسے ویسے لوگوں سے بات کر کے اپنی زبان خراب کرنا نہیں چاہتا۔ کتب فروش کہتا ہے کہ گویا آپ بھی میر صاحب کے نقش قدم پر چل رہے ہیں کہ انھوں نے ایک لکھنوی باشندے کے ساتھ دلی سے لکھنؤ کا سفر کیا اور پورے راستے بات نہیں کی کہ زبان خراب ہو جائے گی۔

پھر زبان کے رو بہ زوال ہونے کا ذکر چل نکلتا ہے۔ بدلتے زمانے کی بات ہوتی ہے۔ مشینوں کے آجانے اور چھاپہ خانے کھل جانے کی بات ہوتی ہے۔ تاسف تو انھیں اس بات پر ہے کہ قرآن پاک کا ترجمہ ریختے میں ہو رہا ہے۔ فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کی کارکردگی پر تبصرہ ہوتا ہے۔

کتب فروش ان تمام تبدیلیوں سے نالاں ہے۔ کہتا ہے کہ یہ کفر و الحاد کا دور ہے جسے بدلنے کے لئے کسی مجاہد کی ضرورت ہے۔ ہمجولی ان تبدیلیوں کے حق میں ہے وہ کہتا ہے کہ مولانا مجاہد کی نہیں انسان کی ضرورت ہے۔ انسان کہیں نظر نہیں آتا۔ نئے کالجوں سے کم از کم یہ تو ہوگا کہ کچھ لوگوں کی روٹی روزی کا حیلہ نکل آئے گا۔ کتب فروش اخبار جاری کرنے کی بات کرتا ہے۔

پھر دلی کی تباہی و بربادی کا ذکر ہوتا ہے۔ میر امن کی بربادی پر افسوس کرتے ہیں کہ کس طرح سورج مل جاٹ نے ان کا گھر برباد کیا اور ان کی جائیداد پر قابض ہوا۔

پھر غالب کا ذکر آتا ہے، تذکرہ نویس کہتا ہے کہ عجیب ذہین لڑکا ہے۔ اس کم عمری میں فارسی میں شعر کہتا ہے اور خود میری سمجھ میں نہیں آتا، تذکرہ نویس دلی کے روز روز لٹنے اور برباد ہونے کا ذکر بڑے دردانگیز لہجے میں کرتا ہے۔

اب ایک طرف سے کچھ لوگوں کی ٹولی رنگین کپڑا پہنے نظیر کی نظم ''بلدیو جی کا میلہ'' گاتی ہوئی

آتی ہے۔ دوسری طرف سے سکھوں کی ٹولی ''مدح نانک شاہ گرو'' گاتی ہوئی آتی ہے۔ دونوں کی مڈبھیر ہونے پر تناؤ کی فضا قائم ہوجاتی ہے لیکن پھر دونوں گاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

اب ایک حسینہ سجی دھجی سامنے سے آتی ہے، اس کے ساتھ ایک نوجوان ہے جسے حبیب تنویر نے شہدے کا نام دیا ہے۔ دونوں بڑے رومانوی قسم کے مکالمے بولتے ہوئے چلے جاتے ہیں آگے چل کر پتہ چلتا ہے کہ وہ حسینہ کوٹھے والی ہے جس کا نام بے نظیر ہے اور وہ نوجوان کوئی پردیسی ہے۔

اس دوران کتب فروش، شاعر اور تذکرہ نویس کے درمیان گفتگو جاری رہتی ہے اور ککڑی والا ہر آنے جانے والے کے پیچھے دوڑتا ہے پھر مایوس ہوکر بیٹھ جاتا ہے۔

اب مخنثوں کی ایک ٹولی آتی ہے اور رامو کے گھر کے سامنے دستک دیتی ہے، رامو کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے۔ رامو پہلے تو مخنثوں کی ٹولی کو ڈانٹ کر بھگانا چاہتا ہے لیکن وہ سب اڑ جاتے ہیں۔ مخنث ٹولی کی ایک فرد کریمن جب یہ کہتی ہے کہ ''اے ہے آج کے دن یہ ڈانٹ ڈپٹ کیسی۔ ایک ایک ایسی موٹی سناؤں گی جو نہ رکھی جائے نہ اٹھائے جائے'' تو رامو کچھ نرم پڑتا ہے۔ گانا شروع کرنے کی بات ہوتی ہے تو جو دکاندار وہاں اکٹھا ہو گئے تھے وہ رامو سے گانا شروع کرنے کو کہتے ہیں۔ برتن والا اپنی دکان سے ایک گھڑا اٹھا کر بجانا شروع کر دیتا ہے۔ رامو نظیر کی نظم گاتا ہے۔ ''واہ کیا بات کورے برتن کی۔'' پھر درزی کہتا ہے ہاں تو اب کوئی دھارمک چیز ہو جائے، تو مخنثوں کی ٹولی نظیر کی نظم ''کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا بال پن'' گاتی ہے۔

نظم ختم ہوتی ہے تو داروغہ آجاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سب ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں۔ داروغہ جھگڑے فساد کی تفتیش کرتا ہے اور تمام دکانداروں اور پھیری والوں پر ایک ایک روپیہ جرمانہ لگاتا ہے۔ سارے دکاندار پریشان ہوجاتے ہیں کہ ہم لوگوں کی کیا غلطی ہے، یہ سارا جھگڑا پھیری لگانے والے رذیلوں کا ہے۔ لیکن داروغہ کسی کی نہیں سنتا اور چلتے چلتے تربوز والے کا ایک تربوز اٹھا کر ہاتھ پر اچھالتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔

تب ہی نظیر کی نواسی (نو دس سال کی عمر ہے) اچھلتی کودتی کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا

بال پن گنگناتی ہوئی پنساری کی دکان پر آتی ہے اور پنساری سے کہتی ہے چاچا، نانا نے آم کا اچار منگایا ہے۔ پنساری اسے اچار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے نانا کہاں ہیں ان سے کہو اس ظلم کے خلاف بھی ایک نظم لکھیں جو یہاں ہو رہا ہے۔

نواسی : نانا رائے صاحب کے یہاں بیٹھے ہیں۔

پنساری : رائے صاحب نے کھانے پر روک لیا ہوگا۔

نواسی : میں بتاؤں، رائے صاحب نے نانا کے لئے بیسن کی روٹی پکوائی ہے۔

پنساری : اچھا اسی لئے اچار کی یاد آئی، ان سے کہنا ذرا ادھر تشریف لائیں۔

نواسی چلی جاتی ہے اور ہمجولی اور تذکرہ نویس نظیر کے بارے میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ وہ نظیر کو بہت اچھا انسان مگر بہت خراب شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ نظیر کی شاعری کو ہرزہ گوئی، ابتذال اور عامیانہ مذاق کی تک بندی کہتے ہیں۔

نواسی پھر آتی ہے اور کہتی ہے، چاچا، نانا نے اچار واپس کر دیا ہے اور ساتھ ہی ایک پرچہ بھی دیتی ہے کہ یہ پڑھ لیجئے۔ پنساری پرچہ پڑھتا ہے اور ہنستا جاتا ہے۔ اس پر نظیر نے ایک نظم ''کیا زور مزے دار ہے اچار چوہوں کا''۔ پنساری دونے سے ایک مرا ہوا چوہا مصالحے میں لت پت نکال کے پھینکتا ہے۔ پنساری، برتن والا، درزی سب ہنسنے لگتے ہیں۔

اب کتاب فروش کی دکان پر بیٹھے لوگوں کی گفتگو کا مرکز نظیر ہو جاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے دیکھ لیا حضور یہ ہے میاں نظیر کا معیارِ سخن۔ وہ اس لئے قابل مذمت ٹھہرتے ہیں کہ ان کی چیزیں جاہل اور گداگر گاتے پھرتے ہیں۔ نظیر ان کے نزدیک اس لئے قابل ملامت ہیں کہ ان کی تمام عمر پتنگ بازی، میلوں ٹھیلوں کی سیر، ہولی کے دنوں میں رنگ کھیلنے اور ہر رسم میں شریک ہونے میں گزری ہے۔

اب شام کا وقت ہے، کوٹھے پر محفل جمنے لگی ہے۔ لوگ دھیرے دھیرے آ رہے ہیں۔ ایک شخص ہری کفنی پہنے ہوئے ہاتھ میں جلتی ہوئی لوبان کی تھالی لئے آتا ہے اور دھواں کمرے میں پھیلا کر ایک طرف بیٹھ جاتا ہے، پھول والا آتا ہے اور لوگوں کی کلائیوں پر گجرے باندھ کر پیسے

وصول کرتا ہے۔

شہدا بے نظیر سے گانے کی فرمائش کرتا ہے۔نظیر کی یہ نظم ''خوں ریز کرشمہ، ناز ستم، غمزوں کی جھکاوٹ ویسی ہے''۔ یہ کہہ کر سناتی ہے کہ اسے میری آپ بیتی ہی سمجھ کر سنیے گا۔گانے کے دوران داروغہ بھی آ کر بیٹھ جاتا ہے۔گانا ختم ہونے کے بعد داروغہ بے نظیر کو کنارے بلا کر تخلیے میں ملنے کے لئے کہتا ہے۔مگر بے نظیر طبیعت کی خرابی کا ذکر کر کے معذرت کر لیتی ہے۔ داروغہ شہدے کو دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ کوئی نیا گاہک آ گیا ہے، اس لیے اسے ٹال رہی ہے، وہ کافی جز بز ہوتا ہے، مگر بے نظیر اپنی بات پر قائم رہتی ہے۔داروغہ چلا جاتا ہے۔

شاعر کتاب فروش سے اپنے دیوان کی اشاعت کے سلسلے میں کچھ ایڈوانس مانگتا ہے۔ وہ اپنی مفلسی کا رونا روتے ہوئے چودھری گنگا پرشاد سے بات کرنے کو کہتا ہے۔تب ہی فقیر نظیر کی یہ نظم گاتے ہوئے آتے ہیں۔

پیسا ہی رنگ روپ ہے پیسا ہی مال ہے　　　　پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

فقیر چلے جاتے ہیں۔ککڑی والا جو فقیروں کی نظم بڑے غور سے سن رہا تھا اسے یکا یک کچھ خیال آتا ہے اور وہ فقیروں کے پیچھے آواز لگاتا ہوا دوڑتا ہے مگر وہ نکل جاتے ہیں۔

یہاں ڈرامے کا پہلا ایکٹ ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے ایکٹ کی شروعات فقیروں کے گانے سے ہوتی ہے، جس میں وہ نظیر کی نظم ''بنجارہ نامہ'' گاتے ہیں۔نظم ختم کر کے وہ اسٹیج سے چلے جاتے ہیں۔

صبح کا وقت ہے۔ کچھ دکاندار آ چکے ہیں، کچھ دکانیں کھول رہے ہیں۔ پھیری والے آواز لگاتے ہیں۔شاعر اور ہم جولی کتاب فروش کی دکان پر آتے ہیں۔اسی وقت دو سپاہی بازار میں نمودار ہوتے ہیں۔ پتنگ والا طوطے کا پنجرہ ہاتھ میں اٹھائے آتا ہے اور دکان کھولتا ہے۔ برتن والے کے استفسار پر بتاتا ہے کہ میاں نظیر کے ساتھ پیرا کی کا میلہ دیکھنے گئے تھے۔ پھر وہ میلے کی پوری تفصیل بیان کرتا ہے کہ دریا کے کنارے عوام کا کتنا ہجوم تھا۔ تیرنے والے کیسے کیسے فن کا

مظاہرہ کر رہے تھے۔کوئی طوطے کو سر پر بٹھا کر دریا پار کرتا ہے۔کوئی حقہ پیتے ہوئے دریا پار کرتا ہے۔تبھی ایک لڑکا حمید نامی پتنگ خریدنے آتا ہے۔ یہاں پتنگ کی قسموں کا بیان ہے۔حمید بہت خوش گلو ہے اور اساتذہ کے کلام بھی اسے یاد ہیں۔

کتاب فروش حمید کو اپنی دکان پر بلاتا ہے اور کچھ سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔حمید نظیر کی ایک مرصع غزل سناتا ہے۔سب حیرت زدہ ہو جاتے ہیں کہ نظیر کے ایسے کلام کا تو ہمیں پتہ ہی نہیں تھا۔ پھر حمید سے اور فرمائش ہوتی ہے تو وہ نظیر کی نظم ''پیراکی کا میلہ'' سناتا ہے۔ وہ سب پھر بہت جز بز ہوتے ہیں۔تذکرہ نویس تو اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ پتنگ والا حمید کو اپنی دکان پر لاتا ہے پھر وہی تیراکی والی نظم سنتا ہے۔ بہت سارے لوگ اکٹھا ہو کر خوب محظوظ ہوتے ہیں۔

ایک اندھا فقیر کٹورا لئے ایک عورت کو ساتھ لئے آتا ہے اور نظیر کی نظم گاتا ہے جس کا پہلا شعر ہے۔

پہلے ناؤ گنیس کا لیجئے سیس نوائے　　　جاسے کارج سدھ ہوں،سدا مہورت لائے

سب اسے بھی بہت توجہ سے سنتے ہیں۔ پتنگ والا کچھ پیسے اس کے کٹورے میں ڈالتا ہے۔ککڑی والا ایک ککڑی پیش کرتا ہے۔

یہاں ایک کیریکٹر منظور حسین کا متعارف ہوتا ہے جو پہلے گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا۔ راستے میں کہیں لٹ پٹ جانے کے بعد یا کسی وجہ سے اب فقیر ہو گیا ہے۔خاموشی اختیار کر لی ہے۔ بنی پرشاد اور پتنگ والا اس سے متعلق کافی گفتگو کرتے ہیں۔ پتنگ والا، میاں نظیر سے اپنے اور منظور حسین کے قریبی روابط کے بارے میں بتاتا ہے۔

اس موقع پر ہولی گانے والوں کی ٹولی آتی ہے اور نظیر کی ہولی سے متعلق یہ نظم گاتی ہے۔

کچھ گھنگھرو تال چھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

بنی پرشاد اور پتنگ والا پھر حمید سے کچھ سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔حمید نظیر کی وہ نظم سناتا ہے جس میں نظیر نے اپنے قلم سے اپنی تصویر کھینچی ہے۔نواسی پھر دکھائی دیتی ہے۔ پتنگ والا اسے

بلاتا ہے، ابھی آئی کہہ کر وہ دوسری طرف چلی جاتی ہے۔

سپاہی مجمع میں کھڑے نظمیں سن رہے ہیں اور بار بار کوٹھے کی طرف دیکھ رہے ہیں، وہ پریشان ہیں کہ دن چڑھ آیا ابھی تک شہدا نیچے کیوں نہیں اترا۔

پھر نواسی پتنگ والے کی دکان پر آتی ہے اور دونوں کی گفتگو کا ماحصل یہ نکلتا ہے کہ نظیر مال و دولت سے بالکل بے نیاز ہیں اور صوفیانہ روش رکھتے ہیں۔ اب ککڑی والے کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میاں نظیر شاعر ہیں اور پتنگ والے سے ان کا کافی ربط وضبط ہے۔ وہ پتنگ والے سے نظیر کا پتہ دریافت کرتا ہے اور سیدھے نظیر کے یہاں بھاگتا ہے۔

گنگا پرشاد جو کتابوں وغیرہ کی اشاعت میں سرمایہ لگاتے تھے، کتاب فروش کی دکان پر آتے ہیں۔ اور دونوں میں یہ طے ہوتا ہے کہ اردو فارسی کا کاروبار چھوڑ کر انگریزی میں دہلی سے اخبار نکالا جائے۔ کتب فروش اردو میں بھی اخبار نکالنے کا مشورہ دیتا ہے مگر وہ مسترد کر دیتے ہیں کہ اب اردو فارسی کا زمانہ چلا گیا، نیا زمانہ ہے، اردو پڑھنے والے ہیں کتنے؟

گنگا پرشاد جیسے ہی روانہ ہوتے ہیں شہدا بے نظیر کے کوٹھے سے نیچے اترتا ہے۔ سپاہی ایک طرف دبک جاتے ہیں، جیسے ہی شہدا سامنے آتا ہے اسے دبوچ لیتے ہیں۔

شہدا سپاہیوں سے کہتا ہے کہ آخر کس جرم میں پکڑ رہے ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ کل فساد کرانے کے جرم میں۔ شہدا کہتا ہے کہ میں نے تو فساد نہیں کروایا۔ کوئی گواہ ہے۔ سپاہی کہتے ہیں تھانے چلو، وہیں گواہ دکھا دیں گے۔ سارے دکاندار شہدے کی طرف داری کرتے ہوئے اسے بے گناہ بتاتے ہیں مگر سپاہی اسے نہیں چھوڑتے اور تھانے لے جاتے ہیں۔

ککڑی والا بہت ہشاش بشاش ککڑی پر لکھی نظیر کی نظم گاتا ہوا آتا ہے اور اس طرح اپنی کچھ ککڑیاں بیچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ نظیر کی نظم ہے:

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی   اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

دوسری طرف سے تربوز والا نظیر کی یہ نظم گاتا ہوا آتا ہے:

کیوں نہ ہو سبز زمرد کے برابر تربوز　　　کرتا ہے خشک کلیجے کے تئیں تر تربوز

لڈو والا بھی ایک نظم گاتا ہوا آتا ہے:

ہم کو تو ہیں گے دل سے خوش آئے تل کے لڈو　　　جیتے رہے تو یارو پھر کھائے تل کے لڈو

پھر تینوں مل کر ناچتے گاتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں۔داروغہ آتا ہے اور کوٹھے پر اڈا جما لیتا ہے۔فقیر ''آدمی نامہ'' گاتے ہوئے آتے ہیں:

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی　　　اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظم ختم ہونے پر پردہ گرتا ہے اور یہی ڈرامے کا اختتام ہے۔

ڈرامے کے اجزائے ترکیبی میں سب سے اہم پلاٹ ہوتا ہے۔ارسطو بھی ڈرامے کا ذکر کرتے ہوئے اسے اولیت دیتا ہے۔ پلاٹ میں ایک ایسا واقعہ یا قصہ ہوتا ہے جس کی ابتدا، وسط اور اختتام ہو۔اچھے پلاٹ میں واقعات کی ترتیب ایک خاص ڈھنگ کی ہوتی ہے۔واقعات ایک کے بعد ایک اس طرح آگے بڑھتے ہیں کہ ان میں منطقی ربط و تسلسل تو ہوتا ہی ہے دل چسپی میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

آگرہ بازار میں اس طرح کا باقاعدہ پلاٹ نہیں ہے۔اس میں مختلف واقعات تو ہیں مگر ان میں ایسا کوئی بامعنی و منطقی ربط و تسلسل نہیں ہے جس سے ایک مکمل واقعہ،قصہ یا کہانی بنتی ہو۔صرف ایک ککڑی والے کا قصہ ایسا ہے جس کا سلسلہ شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ککڑی والا شروع سے آخر تک جدوجہد کرتا رہتا ہے اور آخر میں کامیاب ہوتا ہے۔اسی کے طفیل میں تربوز والے اور لڈو والے کا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔حبیب تنویر یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ طبقہ اشرافیہ کے لوگ پھیری لگانے والوں کو کتنی ہی گری ہوئی نظروں سے دیکھیں اور انھیں کتنا ہی رذیل سمجھیں مگر وہ بھی انسان ہیں۔نظیر طبقہ اشرافیہ سے ہونے کے باوجود ان کا دکھ درد سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ ہیں۔اگر ایک طرف نظیر کے روابط رائے صاحب کے ساتھ ہیں تو وہ پتنگ والے کے بھی دوست ہیں اور اس کے ساتھ تیراکی کا میلہ دیکھنے جاتے ہیں۔

مزید یہ کہ اس سب کے پردے سے ترقی پسندی بلکہ انسانیت کے نظریے کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں اور نظیر بھی اسی انسانیت کے علم بردار ہیں۔

حبیب تنویر اس ڈرامے کے ذریعے نظیر کی اس شاعرانہ عظمت کو بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جس کا اعتراف طبقہ اشرافیہ نے نہیں کیا۔ وہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انھیں کسی بھی موضوع پر بہترین، معیاری نظم لکھنے میں ملکہ حاصل ہے تو وہ مرصع غزل لکھنے پر بھی قادر ہیں۔ عوام کے جتنے بڑے حلقے میں نظیر کی مقبولیت ہے کیا وہ کسی دوسرے شاعر کا مقدر بنی؟

حبیب تنویر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مختلف واقعات کو اس انداز سے منظّم کیا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی ابتدا تا انتہا برقرار رہتی ہے۔ اس میں انھوں نے دلی اور ملک کی تباہی و بربادی، سیاسی وسماجی صورت حال، معاشی بدحالی اور ثقافتی عوامل کا نقشہ اتنے حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ اس عہد کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اور ناظرین کی توجہ پوری طرح مرکوز رہتی ہے۔ پھیری لگانے والوں کی آپسی لڑائی جھگڑا ہو، بندر کی نقلیں ہوں، حمید کی گائیکی ہو، کتاب کی دکان پر ہونے والی ادبی گفتگو ہو، اندھے فقیر کا داخلہ ہو، طوائف کا کوٹھا ہو یا پولیس کی دھاندلی۔ سب حقیقی زندگی کے گواہ ہیں اور دلچسپی قائم رکھنے کے ذرائع۔

کردار نگاری کی بات کریں تو حبیب تنویر نے کوئی شائی لاک یا ہیملٹ تخلیق نہیں کیا ہے اور نہ یہ ان کا مقصد تھا لیکن انھوں نے جو کردار تخلیق کیئے وہ لازوال ہیں۔ دراصل کسی فن پارے کے ایسے کردار جن کی گفتگو، افعال و اعمال، حرکات وسکنات اور جذباتی حالت کے اظہار میں زندگی کی حقیقی عکاسی پائی جاتی ہو۔ معیاری کردار کہے جاسکتے ہیں۔ ''آگرہ بازار'' کے زیادہ تر کردار اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ ککڑی والا ہو، لڈو والا ہو، تربوز والا ہو، سب اپنی بولی ٹھولی، زبان اور گفتگو کا بے ساختہ پن، طور طریقے، انداز و ادا سب سے اس ماحول اور فضا سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔

پتنگ والے کا کردار لے لیجئے۔ وہ نظیر سے اپنے دوستانہ روابط پر بہت نازاں ہے، ہولی

گانے والوں کی ٹولی جب ہولی کے موضوع پر نظم گا چکتی ہے تو بینی پرشاد سے کہتا ہے:

''سن لیا بینی پرشاد۔ اب بتاؤ ہولی پر اس سے بہتر نظم ہوسکتی ہے۔ یہ صنائع بدائع، یہ تشبیہیں، استعارے، تلمیح یعنی شعروشاعری اور علم وادب میں جسے حسن بیان کہتے ہیں یہ کیا ہے۔''

کتاب فروش کی دکان پر جب لوگ نظیر کا کلام سن کر تیوریاں چڑھاتے ہیں اور مولانا خفا ہوکر چلے جاتے ہیں۔ تو پتنگ والا حمید کو اپنی دکان پر لاتا ہے۔ حمید اس سے پوچھتا ہے کہ کیا سناؤں تو کہتا ہے ''نظیر کا کلام سناؤ اور کیا سناؤ گے۔ اس کا ہر شعر بے نظیر ہے۔'' حمید نظیر کی نظم سنانے کی اجازت مانگتا ہے تو پتنگ والا کہتا ہے۔''اجازت؟ اماں تم شعروشاعری کا کاروبار کرنے والے کی دکان پر نہیں بیٹھے ہو، شعروشاعری پر جان دینے والے کی دکان پر بیٹھے ہو۔ سناؤ اور کھلے بندوں سناؤ۔''

یہ ہے تو پتنگ والا، مگر میاں نظیر کا دوست ہے۔ ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور میلوں ٹھیلوں میں جاتا آتا ہے۔ لہٰذا اس کے اندر اس قدر ادبی ذوق کا پیدا ہو جانا ایک فطری امر ہے۔

کتاب کی دکان پر بیٹھنے والوں کی گفتگو کا انداز اور ان کی طبقاتی عصبیت اس عہد کا عام طریقہ تھا۔

بچے کی پیدائش پر مخنثوں کی ٹولی کا آنا اور ناچ گا کر انعام حاصل کرنا شاید بڑی پرانی رسم ہے جو آج تک قائم ہے۔ اس ڈرامے میں بھی ان کا رول بہت حقیقت پسندانہ ہے۔ شہدے کا کردار بھی بہت تھوڑی دیر کے لئے سامنے آتا ہے لیکن ناظرین کے دلوں پر اپنی جواں مردی اور بے باکی کا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ وہ طوائف کے کوٹھے پر آتا ہے تو وہاں وقوع پذیر ہونے والی کسی بھی صورت حال سے نپٹنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ کوٹھے پر داروغہ آجاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ تم ہمیں پہچانتے نہیں تو شہدا بڑی بے ساختگی سے جواب دیتا ہے کہ ''بھانپ رہا ہوں، موقع دیجئے تو ابھی پہچانے لیتا ہوں۔ آیئے ہوجائے دو دو ہاتھ۔'' داروغہ چلا جاتا ہے تو بے نظیر شہدے سے کہتی ہے ''جانتے نہیں شہر کا داروغہ ہے۔'' تو شہدا جواب دیتا ہے ''داروغہ ہے تو کیا گھول کر پی جائے گا۔'' دوسرے دن صبح جب داروغہ کے بھیجے ہوئے سپاہی شہدے کو پکڑ لیتے ہیں تو وہ شہدا کہتا ہے۔

''ابے بڑا نامرد نکلا تہار داروغہ کا بچہ، ہم سمجھے مقابلہ راون سے ہے۔ سیتا
ہرن ہوگا۔ دو دو ہاتھ ہوں گے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ تمہارا شہر جنت کی
چڑیوں سے بھرا پڑا ہے۔''

داروغہ کا کردار دیکھ لیجئے۔ داروغہ نے جو کچھ کیا وہ آج تک ہوتا آرہا ہے اور کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔

خاص بات یہ کہ آگرہ بازار کے تمام کرداروں کی زبان و بیان کا اسلوب حقیقت پسندانہ ہے جو جس طبقے یا سماج سے تعلق رکھتا ہے زبان بھی اسی کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔ ان کی گفتگو سے ہی ان کا طبقاتی فرق واضح ہو جا رہا ہے۔ کردار موقع و محل کی موزونیت کے ساتھ ساتھ اپنے مرتبے اور ماحول کے مطابق ہی گفتگو کر رہے ہیں۔ ان میں انفرادیت کے باوجود ایک ایسی عمومیت ہے کہ وہ اپنے سماج کے کسی طبقے کی روایات و نظریات کے ترجمان بن گئے ہیں۔ یہ کردار نہ صرف جیتے جاگتے زندہ سانس لیتے ہوئے کردار ہیں بلکہ انھوں نے اپنے خالق کو بھی زندگی جاوید عطا کر دیا ہے۔

مکالموں پر بات کریں تو حبیب تنویر کے ڈراموں کا مجموعہ ''دو رنگ'' ہمارے پیش نظر ہے جو 2005ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں جو آگرہ بازار ہے اس میں مکالموں کی بہتات بار خاطر ہوتی ہے۔ حبیب تنویر اسی مجموعے کے مقدمے/ہدایت نامے میں لکھتے ہیں:

''تخفیف کے لئے سب سے زیادہ گنجائش ان مکالموں میں ہے جو کتب
فروش کی دکان پر بولے جاتے ہیں۔''

تلاش بسیار کے باوجود اس کے علاوہ اور کوئی خامی اس ڈرامے کے مکالموں میں نظر نہ آئی۔ خامی اس لئے کہ ڈراما نظری آرٹ ہے سمعی نہیں، اس میں مکالمے صرف اتنے ہونے چاہئیں جتنے ایکشن کی وضاحت کے لئے ضروری ہوں۔ ڈرامے میں ''کیا کہا'' سے زیادہ ''کیا کیا'' اہم ہوتا ہے۔ ڈرامے میں وقت محدود ہوتا ہے اس لئے Economy of Word

ضروری ہے۔

اس ایک کمی سے صرف نظر کریں تو آگرہ بازار کے مکالموں میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک اچھے ڈرامے کے لئے لازمی ہیں مثلاً اس کے زیادہ تر مکالمے کرداروں کی ذہنی سطح اور معاشرت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جس طرح ہر شخص کا طرز عمل مختلف ہوتا ہے اس طرح ہر شخص کی زبان بھی مختلف ہوتی ہے۔ اور نہ صرف لب ولہجہ بلکہ الفاظ ومحاورات پیشہ ورانہ اصطلاحیں اور تکیہ کلام بھی مختلف ہوتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کی نجی زبان ہوتی ہے۔ حبیب تنویر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہر کردار کی نجی زبان تک رسائی حاصل کی ہے اور اسے برتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زبان کے پیچھے جو تہذیبی عوامل کام کرتے ہیں حبیب تنویر کی دسترس اس پر بھی ہے۔

دوسرے یہ کہ ان کے یہاں طویل مکالمے بہت کم ہیں۔ زیادہ تر مکالمے مختصر اور جامع ہیں اور ان میں بول چال کی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان مکالموں میں موزونیت ہے۔ یہ بے ربطی، تکرار اور ابہام سے پاک ہیں، صاف اور واضح ہیں۔ ہر کردار بہترین الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتا ہے۔ یہ مکالمے ڈرامے کی مطلوبہ فضا بندی میں پوری طرح معاون ہیں۔

آگرہ بازار کے مکالموں میں کہیں کہیں ادبی شان بھی پائی جاتی ہے۔ شہدے اور بے نظیر کے یہ مکالمے دیکھیں:

شہدا : اے دل آرام، جے سیتا رام۔

بے نظیر : (مسکرا کر) کیا چاہتے ہو؟

شہدا : عرض حال۔

بے نظیر : فرماؤ۔

شہدا : شری رام چندر نے لنکا فتح کیا، اور تمہارے سور ما حسن نے میرے دل کا گڑھ۔
بود درز ود دل من راون - رام کردند بتاں رام کی سوں

بے نظیر : اس بات کا گواہ۔

شہدا : ہنومان (حسینہ ہنس دیتی ہے)۔اے چھیل چھبیلی، رنگ رنگیلی، گانٹھ گٹھیلی، تجھے کس نام سے پکاریں۔

بے نظیر : لونڈی کو بے نظیر کہتے ہیں۔کیا میں جناب کا اسم شریف دریافت کرسکتی ہوں۔

شہدا : مجھے بدر منیر کہتے ہیں اور رہنے والی تم کہاں کی ہو؟

بے نظیر : میں حسن پورہ کی رہنے والی ہوں،اور سرکار؟

شہدا : ناچیز عشق نگر میں رہتا ہے۔

کتاب فروش کی دکان پر بیٹھے لوگ تو سب ادب کی بات کرتے ہیں اور ادبی زبان میں ہی کرتے ہیں۔ایک اور اقتباس دیکھیں:

تذکرہ نویس : میاں اب کیسی دلی، کہاں کا دربار اور کون سے اکبر ثانی؟ اکبر عالمگیر وغیرہ کے بعد عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی اور اکبر ثانی، لوح سلطنت مغلیہ پر حرف مکرر کی طرح آتے ہیں اور اجڑی ہوئی دلی کے خرابہ وحشت ناک میں جس کا نام کبھی قلعہ معلیٰ تھا اب لٹا پٹا دربار جم جاتا ہے پھر وہی وحشیوں کا حملہ اور وہی ہو کا عالم، لوگ اودھ کی طرف یا دکن کی طرف بھاگ نکلے ہیں اور دلی کے گورستان شاہی میں پھر وہی کتے لوٹتے ہیں اور الو بولتا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آگرہ بازار کے مکالمے مکالمہ نگاری کی اچھی مثال ہیں۔

ڈرامہ کرداروں کے عمل اور گفتگو کے ذریعے وجود میں آتا ہے اور گفتگو کسی نہ کسی زبان میں ہوتی ہے۔آگرہ بازار میں استعمال ہونے والی زبان کی بات کریں تو جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا حبیب تنویر نے ہر کردار کی نجی زبان تک پہنچنے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان حقیقی اور فطری زبان ہے۔وہ عام فہم، سادہ اور سلیس ہے۔یہ روزمرہ بول چال کی زبان ہے۔حبیب تنویر کہیں محاورے، ضرب الامثال، مصرعے اور شعر کے برمحل استعمال سے اسے خوبصورت بنانے کی کوشش کی ہے۔

آگرہ بازار میں اصل کمال پیش کش کا ہے۔حبیب تنویر نے اس میں پیش کش کی بالکل الگ تکنیک اپنائی ہے۔اس میں ہر سین میں یا ہر ایکٹ میں منظر نہیں بدلتا بلکہ ایک بار جو منظر بنا دیا گیا یعنی بازار کا منظر جس میں طرح طرح کی دکانیں سجی ہیں، بیچ میں جگہ ہے جس میں آنے جانے کے راستے ہیں۔ یہ ہی ایک منظر ابتدا تا انتہا قائم رہتا ہے۔دکانیں کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔راہ گیر گزرتے ہیں۔پھیری والے وہیں آواز لگاتے اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔بندر والا اور مداری وہیں اپنے تماشے دکھاتے ہیں۔فقیر نظیر کی نظمیں گاتے ہوئے وہیں سے گزرتے ہیں۔مخنثوں کی ٹولی اپنا گانا بجانا وہیں پیش کرتی ہے۔شاعر،ہمجولی اور تذکرہ نویس کتاب کی دکان پر آکر شعر وادب اور زبوں حالیٔ روزگار وہیں بیان کرتے ہیں۔نظیر کی نواسی وہیں اپنے نانا کے لئے آم کا اچار لینے آتی ہے اور پتنگ والے کے ذریعے نظیر کے حالات وہیں بیان ہوتے ہیں۔اسی میں ایک بالاخانہ بھی ہے جس میں شہدے اور داروغہ کا واقعہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔غرض یہ کہ منظر ایک ہی رہتا ہے تمام کردار آآ کر اپنا اپنا رول کرتے رہتے ہیں۔

حبیب تنویر تمام واقعات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تسلسل کہیں نہیں ٹوٹتا اور بازار کا پورا سماں بنا رہتا ہے اور جو واقعات وہاں پیش نہیں ہو سکتے جیسے تیراکی کا میلہ، اسے کرداروں کے ذریعے بیان کروا دیتے ہیں۔فقیروں کے گانے اور ککڑی والے کے عمل کے دھاگے میں تمام واقعے کو تسبیح کے دانوں کی طرح پرو دیتے ہیں۔حبیب تنویر کی پیش کش کا اسلوب اتنا حقیقت پسندانہ ہے کہ اس وقت کے آگرہ کی کناری بازار کا منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔اور خاص بات یہ کہ اس میں عوام اور خواص دونوں کی دل چسپی اور تفریح کا پورا سامان مہیا کرا دیا گیا ہے۔پھر یہ کہ اصل واقعات کو متاثر کئے بغیر اس ڈرامے کو ضرورت کے مطابق چھوٹا کیا جا سکتا ہے۔طویل گفتگو کو مختصر کرکے اور طویل نظموں کے کچھ بند حذف کرکے۔اس سلسلے میں خود حبیب تنویر لکھتے ہیں:

> ’’اگر پورا ڈراما نہ کھیل سکیں تو اسے جتنا چاہیں چھوٹا کرلیں۔اور ضرورت ہو تو ایک سین کا بنالیں۔نظموں کے بارے میں میرا تجربہ یہ ہے کہ اسٹیج پر

سوائے ''شہر آشوب'' اور '' آدمی نامہ'' کے جن کے پانچ یا چھ بند ڈرامے کو بوجھل نہ بنائیں گے۔ دوسری کوئی نظم چار بند سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ اور ان میں بھی بیشتر نظموں کے صرف تین بند گائے جائیں تو مناسب ہوگا۔ اختصار و تخفیف کے لئے سب سے زیادہ گنجائش ان مکالموں میں ہے جو کتب فروش کی دکان پر بولے جاتے ہیں۔''[1]

[1] حبیب تنویر۔ دو رنگ۔ مقدمہ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی۔ 2005ء۔

پروفیسر شاہد حسین، سنٹر فار انڈین لینگویجز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:46-55
Prof. Majeed Bedar, 1857 ke Ghadar se Qabl Urdu ki Ghair Afsanavi Nasri Asnaaf

مجید بیدار

1857ء کے غدر سے قبل اردو کی غیر افسانوی نثری اصناف

ہندوستان گیر سطح پر انگریزوں کی حکمرانی کا خاتمہ کرنے کے لئے میرٹھ کی سرزمین سے 10 مئی 1947ء کو شروع ہونے والی تحریک نے ملک کی تاریخ کا رخ بدل دیا اور سارے ملک کے باشندوں کو متحد کر دیا۔ غرض شمالی ہند ہی نہیں' بلکہ جنوبی ہند میں بسنے والے ہندوستانیوں نے آزادی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس اہم جدوجہد میں ابتدائی طور پر ہندوستان کی مختلف قوموں کی فوجوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور ان فوجوں نے دلی کا رخ کر کے مغل آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنے شہنشاہ تسلیم کر لیا۔ ملک کے باشندوں کی یہ خوشی زیادہ دن نہ رہ سکی' کیونکہ انگریزوں کی سازش کے نتیجے میں 1857ء میں ملک کے طول وعرض میں برپاء ہونے والی یہ انقلابی جدوجہد تھوڑے سے وقفہ کے بعد شکست سے دوچار ہوگئی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑی جانے والی پہلی جنگ جو 1857ء میں وقوع پذیر ہوئی' جس کے خلاف اپنی کامیابی کو اہمیت دیتے ہوئے انگریزوں نے 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کو غدر کے نام سے شہرت دی۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بسنے والے طبقات اور مذاہب سے وابستہ حکمرانوں کی طرف سے اس جدوجہد کو پہلی جنگ آزادی کا موقف حاصل ہے۔ اس پہلی جنگ آزادی میں مرہٹہ قوم' شمالی ہند کی ریاستیں اور مہارانی جھانسی کے علاوہ دیگر راجے اور رجواڑے ہی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے سربراہوں نے بھی انگریزوں کے خلاف متحدہ جنگ کا اعلان کیا تھا' تاکہ اقتدار کو ملک سے ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے۔ ہندوستانیوں کی اس انقلابی تحریک کو انگریزوں نے اپنی جارحانہ سازش سے ناکام بنادیا

اور آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج دیا' ملک کے مختلف خطوں میں سولیاں گاڑ دی گئیں اور جس پر بھی غداری کا شک ہوتا انہیں برسر عام سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ پہلی جنگ آزادی اور اس کے انجام سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں موجود انگریز اقتدار نے سازشی عناصر کو کام میں لاتے ہوئے غلامی کا طوق ہمیشہ کے لئے ہندوستانیوں کے گلے میں ڈال دیا۔ اس طرح ملک کی سیاست انقلابی کروٹ سے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے انجام سے دور ہوگئی۔ غرض اسی مرحلہ کو 1857ء کا غدر قرار دیا جاتا ہے' حالانکہ اسی مرحلہ کو ہندوستان کی سرزمین میں پہلی جنگ آزادی کا بگل بجانے کا موقف دیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی سرزمین میں جنگ آزادی کے دوران ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو زبان ہی نے اپنے نعروں اور حریت کے کارناموں کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ 1857ء کے غدر میں مسلمانوں بہادری کے کارنامے اور اردو زبان کے نعرے ہی نہیں' بلکہ اس کی شاعری کی وجہ سے سارے ملک کے ماحول میں انقلابی نئی زندگی پیدا ہوگئی' ان حقائق کی موجودگی میں اگرچہ ہر علاقہ میں علاقائی زبان کو فروغ حاصل رہا تھا' چنانچہ ہندی کے علاوہ گجراتی' مرہٹی' کنڑی اور اودھی زبانوں کو بھی اپنی شناخت کا درجہ حاصل تھا' لیکن سارے ملک میں اردو زبان اور اس کے شعر وادب ہی نہیں' بلکہ اس کے عملی اقدامات کی وجہ سے ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ اسی دور میں مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی نے اردو شاعری کے علاوہ اردو خطوط کے ذریعے غیر مسلم طبقے میں اس زبان کی پذیرائی کا حق ادا کیا۔ ان کے خطوط اردو میں لکھے ہوئے ہیں' جو مسلم طبقے کے علاوہ ہندو طبقے کے افراد بھی نمائندگی کرتے ہیں' جس سے صاف ظاہر ہے کہ 1857ء کی غدر میں مسلمان ہی نہیں' بلکہ ملک کے ہندو طبقے کی حددرجہ پسندیدہ زبان اردو تھی' چنانچہ اردو شاعری سے شغف رکھنے والے غیر مسلم شعراء بھی مرزا غالب سے فیض حاصل کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مرزا غالب کے شاگردوں میں انگریز طبقہ کے افراد بھی موجود ہیں' جنہوں نے اردو میں شعر گوئی کا درس حاصل کیا اور مرزا غالب سے اصلاح لینے کا فریضہ انجام دیا۔ غرض غالب کے غدر کے دور میں سارے ملک کی زبان اردو تھی اور ہر ذات اور فرقے اور مذہب کے لوگ اردو زبان پڑھنے لکھنے اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے' اس اعلیٰ معیار پر ہندوستان کے تمام علاقوں میں سے کسی

بھی علاقہ کی زبان کو اردو کے جیسے عوامی وقار کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ بعض گوشوں میں یہ تصور عام ہے کہ اردو کی نثر اور شاعری کی ترقی میں انگریزوں قوم نے بہت بڑا حصہ ادا کیا۔ یہ غلط خیال بھی موجود ہے کہ انگریز طبقے کی توجہ کی وجہ سے ہی اردو کی شعری اور نثری اصناف میں فروغ حاصل ہوا۔ اس خام خیالی کا ازالہ اس طرح ہوتا ہے کہ غدر کے آغاز سے قبل ہی ہندوستان کی سرزمین میں اردو کے نثر نگاروں نے افسانوی نثر Fiction کے علاوہ غیر افسانوی نثر یعنی Non Fiction کے ذریعے اظہار کے نئے طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ جس کے توسط سے غدر کے بعد اردو کی ترقی اور نثر کے فروغ کا نظریہ باطل قرار پاتا ہے۔ غدر سے پہلے ہی اردو کے نثر نگاروں نے معیاری نثر اور نثر کی غیر افسانوی خصوصیات کو ادب کے اظہار کا وسیلہ بنانے پر مکمل توجہ دی' جس کا عملی ثبوت یہی ہے کہ 1857ء میں غدر کے آغاز سے قبل اردو نثر میں ماسٹر رام چندر نے ''مضمون نگاری'' کی بنیاد رکھی تھی۔ (1) مضمون نگاری کو غیر افسانوی نثر کی ایک عمدہ' کارآمد اور مقبول ترین صنف کا درجہ حاصل ہے' جس کا آغاز دہلی میں انگریزوں کی جانب سے قائم کردہ دلی کالج 1824ء کے بعد ہوا۔ ماسٹر رام چندر جیسے دہلی کے باشندے نے دہلی کالج میں ریاضی کے استاد کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور سائنسی موضوعات کا احاطہ کرنے کے لئے اردو میں مضمون نگاری کی بنیاد رکھی۔ (2) اس طرح 1857ء کے غدر سے قبل اردو میں پہلی غیر افسانوی نثری صنف مضمون نگاری کے آغاز کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ غرض 1857ء کے آغاز سے زائد از دس سال پہلے 1847ء میں محمد یوسف کمبل پوش نے اپنا مشہور سیاحت نامہ ''عجائبات فرنگ'' تحریر کیا' جو اردو کے پہلے ''سفر نامہ'' کا مرتبہ رکھتا ہے' جس کی اشاعت بھی 1857ء کی غدر سے بہت پہلے ہوئی۔ (3) مضمون نگاری کے لئے انگریزی میں متبادل کے طور پر Article یا پھر Essay کی اصطلاح مروج ہے' اسی طرح سفرنامے کے لئے انگریزی میں Travelogue کی اصطلاح کا چلن عام ہے۔ ان دونوں نثری اصناف کا سلسلہ اردو کی غیر افسانوی نثر نگاری سے ہے' جو غدر سے پہلے پیش کی گئیں۔ غرض یہ عملی ثبوت موجود ہے کہ غدر کے آغاز سے بہت پہلے ہی اردو ادب میں غیر افسانوی نثر کا آغاز ہو چکا تھا' جس کی وجہ سے اردو کی دو غیر افسانوی نثری اصناف یعنی مضمون نگاری اور سفرنامہ نگاری کو غدر سے پہلے وجود میں آنے کا شرف حاصل ہے۔ اردو زبان و ادب

سے دلچسپی رکھنے والے اور نثر کو فروغ دینے والے اہل قلم حضرات نے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ 1857ء سے قبل اردو میں مزید ایک تیسری نثری صنف کو فروغ حاصل ہوا۔ اردو دنیا میں اپنی سادگی اور فطری نثر کی وجہ سے مرزا غالب کے خطوط کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ غالب کے خطوط کے دو مجموعے ''اردوئے معلیٰ'' اور ''عود ہندی'' کی اشاعت عمل میں آچکی ہے' جس میں انہوں نے بے ساختہ نثری اسلوب اختیار کر کے غیر افسانوی نثر کی صنف کو فروغ دیا۔ مولانا حالی نے اپنے استاد کی نثری خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ مرزا غالب نے 1850ء کے بعد اردو میں نثر نگاری کا آغاز کیا' (4) لیکن ان کے مرتب کردہ خطوط میں 1846ء کے دو ابتدائی خطوط دستیاب ہیں' (5) اس سے پہلے غالب فارسی زبان میں خطوط لکھا کرتے تھے۔ اس حقیقت کے اظہار سے غالب کی خطوط نگاری کا آغاز 1846ء میں ہونے کا ثبوت ملتا ہے' جو ہندوستان کی غدر یعنی 1857ء سے گیارہ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اردو کی غیر افسانوی نثر میں مرزا غالب کی تحریروں سے مکتوب نگاری کا آغاز ہوا۔ انگریزی زبان میں عام طور پر مکتوب نگاری کو Letter Writing کہا جاتا ہے' لیکن ادبی اعتبار سے مکتوب نگاری کو Epistle کا درجہ حاصل ہے۔ (6) غرض مضمون نگاری اور سفر نامہ نگاری جیسی دو غیر افسانوی اصناف کے علاوہ اردو میں 1857ء کے غدر سے قبل مکتوب نگاری کی صنف کا آغاز ہوا۔ اس طرح ہندوستان میں پہلی جنگ آزادی کے آغاز سے قبل ہی ہندوستان کے اردو کے چاہنے والے نثر نگاروں نے غیر افسانوی نثر کی آبیاری کی طرف توجہ دی' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلاشبہ غدر کے بعد ہی اردو کی نثری اصناف کو فروغ حاصل نہیں ہوا' بلکہ غدر سے پہلے ہی اردو نثر میں غیر افسانوی نثری اصناف کا سلسلہ جاری تھا' جس کا ثبوت 1857ء سے قبل مضمون نگاری' سفر نامہ نگاری اور مکتوب نگاری کی اصناف اور اس کے آغاز کی سنین سے ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو میں افسانہ نگاری کے آغاز سے بہت پہلے اردو میں مضمون نگاری کے نثری اظہار کو فروغ حاصل ہوا۔ جس کی وجہ سے پہلے مضمون نگار ماسٹر رام چندر اور ان کی خدمات کو بہر حال اہمیت حاصل ہے۔ ماسٹر رام چندر نے اپنی زندگی میں دو اخبارات ''فوائد الناظرین'' اور ''خیر خواہ ہند'' کا اجراء کیا۔ (7) انہوں نے ہندوستان میں بے

شمار خدمات انجام دیں جن کی تفصیلات کو پیش نظر رکھ کر جامع اردو انسائیکلوپیڈیا کی جلد اول (ادبیات) میں ان حقائق کی نمائندگی کی گئی ہے۔

> ''رام چندر، ماسٹر (1880-1821ء): دلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کالج میں زیر تعلیم رہے اور وہیں بحیثیت معلم ملازم ہوے۔ علم ریاضی میں مہارت رکھتے تھے۔ ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے لئے الجبرا اور علم مثلث کی کتابیں تیار کیں، جو شامل نصاب ہوئیں۔ اعظم ترین اور اقل ترین (A treatise on Maxima and Minima) اور تفرقی احصاء پر جو کتابیں لکھیں، انہیں یوروپ میں بہت سراہا گیا۔ عیسائی ہوجانے کی وجہ سے بعض اوقات وہ پریشان رہے۔ 1858ء میں پہلے تھامس انجینئرنگ کالج اور پھر دہلی ڈسٹرکٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ 1862ء میں خرابی صحت کی بناء پر وظیفہ لے لیا۔ صحت یاب ہوئے تو دو ہزار روپے ماہوار پر ریاست پٹیالہ کے ڈائرکٹر تعلیمات اور مہاراجہ کے اتالیق مقرر ہوگئے۔ ان کی تصانیف متنوع ہیں۔ ریاضی میں اصول جبر و مقالہ، اول علم ہیئت، سوانح و تاریخ میں ''تذکرۃ الکاملین''، علم معلومات میں ''عجائبات روزگار'' مناظرہ میں ''اعجاز قرآن'' اور سماجیات میں ''بھوت نہنگ'' شامل ہیں۔ وہ اچھے صحافی بھی تھے۔ سائنسی معلومات پر مبنی اردو کا پہلا باتصویر پرچہ ''فوائد الناظرین'' جاری کیا۔ دوسرا ماہنامہ '''''خیر خواہ ہند'' بعد کو ''محبّ ہند'' کے نام سے نکلتا رہا۔ ان کا انداز تحریر نہایت سلجھا ہوا اور سلیس ہے۔ کہیں کہیں قدامت کا اندازہ جھلکتا ہے۔ وہ قدیم اور جدید نثر کی درمیانی کڑی ہیں۔''(8)

ان حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ ماسٹر رام چندر نے دہلی میں زندگی گزارتے ہوئے، دہلی کالج کی خدمت ہی انجام نہیں دی، بلکہ اردو میں ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ ترجمہ کی روایت کو فروغ دیا۔ انہوں نے انجینئرنگ کالج کے علاوہ ضلعی اسکول کی نصابی کتابوں اور ریاست کی اہم

تدریسی کتابوں کو اردو میں پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ جس کے ساتھ ہی سائنسی معلومات کو منظر عام پر لا کر مضمون نگاری کو باضابطہ طور پر صنف کا درجہ دے دیا' جس کے نتیجہ میں 1857ء سے قبل اردو مضمون نگاری کی شروعات کا ثبوت ملتا ہے۔ غرض ماسٹر رام چندر کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور عمدہ کارکردگی کی وجہ سے سرکاری سطح پر ہی نہیں' بلکہ عوامی سطح پر بھی ان کی خدمات قابل اعتراف رہے۔ غرض اردو کے اس اولین مضمون نگار اور سائنس کے مترجم کی حیثیت سے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

غدر کی جدوجہد سے پہلے ہی ''مضمون نگاری'' کے بعد سفر نامہ کی روایت کو فروغ دینے والے مصنف کی حیثیت سے مرزا یوسف کمبل پوش کی زندگی کے حالات اور ان کی زندگی کے تفصیلات کے بارے میں معلومات فراہم نہیں ہوتے' البتہ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا جلد اول کے ادبیات کے صیغے میں مرزا یوسف کمبل پوش اور ان کے سوانح کی کارناموں کو مختصر انداز میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ جسے درج کیا جا رہا ہے۔

> ''کمبل پوش' مرزا یوسف (م۔ 1847ء): حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ سیاحت کا شوق تھا' اس لئے 1828ء میں حیدرآباد سے نکلے اور ہندوستان کے اکثر شہروں کا سفر کرتے ہوئے نصیر الدین حیدر کے دور میں لکھنؤ پہنچے' جہاں فوج میں وہ پہلے جمعدار اور پھر صوبہ دار مقرر ہوئے۔ یوسف خاں نے یہاں انگریزی سیکھی اور 1837ء میں انگلستان کے لئے چل پڑے۔ دورانِ سفر یوروپ کے اکثر مقامات کی سیاحت کی۔ ہندوستان واپس آکر ''عجائبات فرنگ'' کے نام سے اپنا سفر نامہ لکھا۔ یہ اردو زبان میں پہلا سفر نامہ ہے' جو یوروپ کی سماجی زندگی کا عکاس ہے۔ زبان میں قدرے پرانا پن ہے۔ عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی بھی ہے' لیکن سفر نامہ اس انداز سے لکھا گیا کہ شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔''(9)

غدر سے قبل مضمون نگاری کے علاوہ سفر نامہ نگاری کی صنف کی روایت کو فروغ دینے

والے ادیبوں کے بعد 1846ء میں غیر افسانوی نثر کی ایک اور صنف یعنی مکتوب نگاری کا آغاز کرنے والا ے اہم نثر نگار کی حیثیت سے مرزا اسداللہ خاں دہلوی کا مقام و مرتبہ کافی بلند ہے۔ اردو شاعری میں ہی نہیں، بلکہ نثر نگاری میں بھی اپنی اہمیت کا لوہا منواتے ہے۔ غالب نے شاعری کو جس طرح پیچیدہ انداز سے وابستہ کیا، اس کے برعکس نثر میں مکتوب نگاری کے دوران سادہ اور فطری انداز کو فروغ دے کر غیر افسانوی اردو نثر کی آبیاری کا فریضہ انجام دیا۔ غالب نے اپنے خطوط میں اختیار کردہ سادہ اور عام فہم نثر کی حمایت کرتے ہوئے ایک خط میں بطور خاص لکھا ہے ''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مکاتبہ کو مکالمہ بنالیا، ہزاروں میل دور بیٹھا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو'' غالب کے اس انداز سے خود پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے نامور شاعر ہی نہیں ہیں، بلکہ اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز کرتے ہوئے خط نویسی کے ذریعے اعلیٰ اخلاقی اقدار اور مکتوب نگاری کے فطری اسلوب کو نمائندگی دینے کے علمبردار قرار پاتے ہیں۔ مرزا غالب کی نثر نگاری کی امتیازی خصوصیت اور شاعری کے منفرد انداز کو واضح کرتے ہوئے ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' کی جلد اول ان کے سوانحی حالات میں اس طرح پیش کئے گئے ہیں:

> ''غالب' مرزا اسد اللہ خاں (1869-1797ء): عرفیت مرزا نوشہ۔ شاہی خطابات نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے، پھر غالب اختیار کیا۔ مقام پیدائش اکبرآباد۔ والد کا نام عبداللہ بیگ تھا۔ پانچ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو چچا نصر اللہ بیگ نے پرورش کی۔ شادی کے بعد دلی میں رہنے لگے۔ شاہان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کے لئے دربار مغلیہ سے چھ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوئے۔ ذوق کی وفات کے بعد استاد (بہادر شاہ ظفر) شاہ بن گئے۔ 1857ء کے بعد دو برس بڑی مصیبت میں گزارے۔ نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کردی تھی جو آخری عمر تک ملتی رہی۔
>
> غالب کی طبیعت میں ذہانت، ذکاوت اور طباعی بہت تھی۔ ابتداء میں انہوں نے فارسی شعراء بالخصوص مرزا عبدالقادر بیدل کی روش کو اردو میں

پسند کیا، تقلید سے انہیں نفرت تھی۔ شاعری میں اپنی راہ الگ نکالی، جو خصوصیت غالب کو دوسرے شعراء کے مقابلے میں ممتاز بناتی ہے، وہ ان کے خیال بندی، دقت پسندی، نازک خیالی اور معنی آفرینی ہے۔ انہوں نے اسلوب پر مضمون و معنی کو ترجیح دی۔ غالب کی دنیائے خیال میں غیر معمولی تنوع ہے، ہماری نظر سب سے پہلے ان کے کلام کی آفاقیت پر جاتی ہے۔ غزل کے موضوعات کو انہوں نے غیر معمولی وسعت دی۔ وہ فلسفی نہیں تھے، لیکن فلسفیانہ ذہن رکھتے تھے۔ انہوں نے حیات و کائنات کے تمام بنیادی مسائل پر غور کیا ہے، اس لئے ان کی شاعری میں ایک مربوط فکری نظام ملتا ہے۔ غالب کی عظمت اس میں بھی ہے کہ انہوں نے غزل کی روایتی علامتوں اور استعاروں کو نئی معنویت دی، نئی جہتیں پیدا کیں، ان کے فن میں روایت اور تجربے کا امتزاج ملتا ہے، غالب نے رمز وایما کو اتنا تہہ دار بنایا کہ اس کی حدیں ابہام سے جاملیں۔

غالب نے زبان کی اصلاح نہیں کی بلکہ ایک نیا شعری اسلوب وضع کیا۔ ان کی زبان عام لوگوں کی زبان نہیں، غالب نے شاعری کو فکر کی زبان دی اور غالب کی فکر نے شاعری کو مستقبل کے بعید امکانات سے روشناس کرایا۔ ان کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے شوخی، مزاحیہ اور طنزیہ انداز کو غزل کے مزاج میں داخل کیا۔ انہوں نے رعایت لفظی سے بھی اپنے کلام کے حسن کو دوبالا کیا۔

غالب کے بعد آنے والے غزل کے فنکار غالب کے انداز فن کو پوری طرح برتنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں تاہم غالب نے انہیں وہ راستے ضرور دکھائے ہیں، جن سے غزل کی صنف نئی وسعتوں سے ہمکنار ہوئی۔ جیسے جیسے ہمارا تنقیدی شعور زیادہ گہرا اور وسیع ہوتا جارہا ہے، غالب کی شخصیت اور شاعری کے نئے نئے پہلو سامنے آتے جارہے ہیں۔

غالب اعلیٰ پایہ کے نثر نگار بھی تھے۔مکتوب نگاری کا جو اسلوب انہوں نے اردو کو دیا اس کا کوئی جواب نہیں۔غالب کی تصانیف میں اردو دیوان کے علاوہ کلیات نظم فارسی، عود ہندی، اردوئے معلیٰ، قاطع برہان، پنچ آہنگ، نامہ غالب اور مہر نیم روز قابل ذکر ہیں۔'' (10)

1857ء کے غدر سے قبل اردو میں پیش ہونے والی تین اہم نثری اصناف یعنی مضمون نگاری، سفر نامہ نگاری اور مکتوب نگاری کے ذکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو میں جدوجہد آزادی کے آغاز سے قبل اور انگریزوں کی ایجادات ملک میں وسعت حاصل کرنے سے پہلے ہی اردو کے نثر نگاروں نے غیر افسانوی نثر کی روایت کو بھرپور انداز سے فروغ دیا۔اردو ادیبوں کی جدوجہد رہی کہ غیر افسانوی نثر کے ذریعہ نئے رجحانات اور نئے امکانات کو پیش کیا جائے۔لامحالہ داستانوں نثر کے بجائے مضمون نگاری کی نثر اور سفر نامہ کی نثر کے علاوہ مکتوب نگاری کے توسط سے غدر سے قبل اردو نثر کے میدان میں وسعت پیدا ہوئی۔اس دور میں چونکہ انگریزوں کے توسط سے ہندوستان میں چھاپہ خانہ کا آغاز ہو چکا تھا۔اس لئے رفتہ رفتہ طباعت اور اشاعت کے کام میں تیز رفتاری پیدا ہونے لگی۔جس کے لئے لکھنؤ کی سرزمین میں ''مطبع نولکشور'' کے علاوہ انگریزوں کے چھاپے خانے جیسے کولکتہ میں ''فورٹ ولیم کالج'' (11) بعد مدراس میں ''فورٹ سینٹ جارج کالج'' کے مطابع ہی نہیں اور کئی اخبارات اور رسائل کے چھاپے بھی ہندوستان میں اپنی کارکردگی کو نمائندگی دینے لگے، اس لئے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو نثر میں 1857ء کے غدر سے پہلے غیر افسانوی نثر کا آغاز ہوا، لیکن اس غیر افسانوی نثر کو فروغ دینے میں انگریزوں کی جانب سے ہندوستان میں لائے جانے والے چھاپے خانوں سے بڑی مدد گار حاصل ہوئی، اگر ہندوستان میں پرنٹنگ پریس کی شروعات نہ ہوتی تو لازمی طور پر اردو کتابوں کی اشاعت اور اس کا پھیلاؤ ممکن نہیں تھا۔سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور پھر دہلی کالج کے چھاپہ خانے کے علاوہ فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کا مطبع اور مختلف رسالوں کے چھاپے خانے 1857ء سے پہلے ہندوستان کے مختلف اہم شہروں میں اشاعت کے مواقع فراہم کر دیئے۔اس طرح 1857ء کے غدر سے پہلے ہندوستان میں چھاپہ خانہ کا وجود نہ ہوتا تو کتابوں کی اشاعت اور توسیع کے امکانات

کی توقع بھی باقی نہ رہتی۔غرض غدر سے قبل اردو کی غیر افسانوی نثر کی ترقی کی وجہ سے شاعری کے علاوہ نثر پر توجہ دی گئی اور غدر سے قبل چھاپے خانوں کی شروعات کی وجہ سے بھی کتابوں کی اشاعت اور مطالعہ کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔اس طرح غدر سے پہلے اردو میں شروع ہونے والی تین نثری اصناف جیسے مضمون نگاری' سفر نامہ نویسی اور مکتوب نگاری کی شروعات کی وجہ سے اردو نثر کے دامن میں وسعت پیدا ہوئی۔غرض ہندوستان کی سرزمین میں 1857ء کی غدر سے پہلے اردو نثر میں تین غیر افسانوی اصناف کے آغاز کی وجہ سے شاعری کے علاوہ نثر نگاری سے دلچسپی کا ماحول پیدا ہوا۔ اس عملی حقیقت کی وجہ سے غدر کے بعد اردو نثر کے فروغ کے نظریہ کی نفی ہوتی اور اردو مصنفین کی جانب سے غدر سے قبل نثری تصنیف و تالیف کے دلچسپی کا رجحان نمایاں ہوتا ہے' جس سے اردو کی غیر افسانوی نثر کے اصناف کے ذریعہ اردو مصنفین کی عمدہ کارکردگی کا ثبوت ملتا ہے۔

حوالہ جات

1-اردو مضمون نگاری کا ارتقاء 1950ء تک از: ڈاکٹر سیدہ جعفر نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد 1972ء

2-ماسٹر رامچند راوران کی مضمون نگاری از: پروفیسر سیدہ جعفر

3-عجائبات فرنگ از: محمد یوسف کمبل پوش مطبع نولکشور۔لکھنؤ

4-یادگار غالب از: خواجہ الطاف حسین حالؔی

5-خطوط غالب (جلد اول) از: ڈاکٹر خلیق انجم

6-آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری از: شان الحق حقی آکسفورڈ پریس پاکستان مطبوعہ 2011 صفحہ 525

7-تاریخ ادب اردو (جلد دوم) از: پروفیسر سیدہ جعفر مطبوعہ ہاشم نگر' لنگر حوض حیدرآباد 2002۔صفحہ 155

8-جامع اردو انسائیکلو پیڈیا (جلد اول) از: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جلد اول مطبوعہ 2003 صفحہ 211

9-جامع اردو انسائیکلو پیڈیا (جلد اول) از: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مطبوعہ 2003ء صفحہ 440

10-جامع اردو انسائیکلو پیڈیا۔جلد ایک ادبیات از: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مطبوعہ 2003 صفحہ 399

11-تاریخ ادب اردو (جلد دوم) از: پروفیسر جعفر مطبوعہ ہاشم نگر۔لنگر حوض۔حیدرآباد

پروفیسر مجید بیدار' سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:56-67
Prof. Zafar Ahmed Siddiqui, Maulana Azad aur Allama Shibli Nomani

ظفر احمد صدیقی

مولانا آزاد اور علامہ شبلی نعمانی

مولانا ابوالکلام آزاد بلاشبہ نابغۂ روزگار تھے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت، مسحورکن خطابت، بے مثال انشاپردازی، اس کے ساتھ ہی دانش وری اور سیاسی بصیرت کو اب مسلّمات کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی وسعتِ مطالعہ، قوتِ حافظہ اور جامعیت بھی عجیب وغریب تھی۔ اسلامیات، شعروادب، تاریخ وجغرافیہ اور طب جیسے متنوع اور مختلف الجہات علوم وفنون سے وہ نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان کی جزئیات بھی اکثر وبیشتر انھیں مستحضر رہتی تھیں۔ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر انھیں کامل عبور تھا۔ انگریزی کتابوں کے مطالعے میں بھی انھیں کوئی زحمت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

مولانا آزاد کے خاندان، آباواجداد، مولد ومنشا، سالِ ولادت اور تعلیمی مراحل جیسے احوال وکوائف پر بڑی حدتک ابہام وغموض کا پردہ پڑا ہوا ہے اور تھوڑی بہت معلومات جو اُن امور سے متعلق ہم تک پہنچ سکی ہیں وہ انتہائی محیرالعقول ہیں۔ بہرحال جناب مالک رام کی تحقیق کے مطابق 1888ء کو اگر ان کا سالِ ولادت تسلیم کرلیا جائے تو وہ علامہ شبلی نعمانی سے اکتیس سال چھوٹے تھے۔ انھوں نے علامہ کے نام پہلا خط 1901ء میں لکھا۔ اس وقت ان کی عمر محض تیرہ سال تھی۔ دوسری جانب علامہ شبلی اس وقت اپنی عمر کی 44ویں منزل میں تھے۔ ان کی تصانیف میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، سیرۃ النعمان، رسائل شبلی اور الفاروق منظر عام پر آچکی تھیں۔ اس لحاظ سے وہ ملک کے طول وعرض میں ہر طرف مشہور ہو چکے تھے اور قیامِ علی گڑھ کا دور ختم کر کے ناظم سررشتۂ علوم وفنون کی حیثیت سے ریاست حیدرآباد سے وابستہ اور شہر حیدرآباد میں مقیم تھے۔

اِدھر مولانا آزاد کا یہ حال تھا کہ باوجود کم سنی وہ نصابی و درسی تعلیم سے گزر کر اب علوم جدیدہ کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں پہلے انھوں نے انگریزی، عربی اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ان کی خواہش ہوئی کہ عربی میں ترجمہ شدہ علومِ جدیدہ کی کتابوں سے استفادہ کریں۔ غالباً وہ علامہ شبلی کی تصانیف سے واقف تھے۔ اس لیے انھیں خیال آیا کہ اس سلسلے میں علامہ ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ''آزاد کی کہانی'' میں فرماتے ہیں:

> اب مصر و شام کی کتابوں کا شوق ہوا۔ مولانا شبلی کو ایک خط لکھا اور ان سے دریافت کیا کہ علومِ جدیدہ کے عربی تراجم کون کون ہیں اور کہاں کہاں ملیں گے؟... انھوں نے دو سطروں میں یہ جواب دیا کہ مصر و بیروت سے خط و کتابت کیجیے۔[1]

جنوری 1903ء میں علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اسی سال کے آخر میں مولانا آزاد نے کلکتہ سے ''لسان الصدق'' جاری کیا۔ یہ علمی و ادبی رسالہ تھا۔ یہ علامہ شبلی سے مولانا آزاد کے غائبانہ تعارف اور قربت کا ذریعہ بنا۔ کیونکہ مولانا اس میں انجمن سے متعلق خبریں، رپورٹیں اور اس کی کارگزاریوں کی تفصیلات وغیرہ شائع کرتے رہتے تھے، جو علامہ شبلی انھیں وقتاً فوقتاً بھیجتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا کی دلچسپی اور مستعدی کو دیکھ کر علامہ نے کچھ دنوں بعد انھیں انجمن کے ارکان انتظامیہ میں شامل کر لیا اور لسان الصدق کو ایک طرح انجمن کا ترجمان بنا لیا۔ یہ سلسلہ 1904ء میں اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ علامہ انجمن کی ذمے داریوں سے سبک دوش نہ ہو گئے۔ اس پورے عرصے میں ان دونوں شخصیتوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ تو جاری رہا، لیکن ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔

مولانا آزاد کی علامہ شبلی سے پہلی ملاقات غالباً 1904ء کے اواخر یا 1905ء کے اوائل میں بمبئی میں ہوئی۔ اب مولانا سولہ سال کے تھے اور علامہ کی عمر 47 سال تھی۔ اس دوران ان کی تصانیف میں الغزالی، علم الکلام، الکلام اور سوانح مولانا روم بھی شائع ہو چکی تھیں۔ اس پہلی ملاقات میں جو لطیفہ پیش آیا، اس کا بیان مولانا آزاد کی زبانی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

> مولانا شبلی سے میں 1904ء میں سب سے پہلے بمبئی میں ملا۔ جب میں

نے اپنا نام ظاہر کیا تو اس کے بعد آدھ گھنٹے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں؟ میں نے کہا نہیں میں خود ہوں۔ 2

علامہ شبلی کے لیے دراصل باعثِ استعجاب یہ تھا کہ یہ کم سن لڑکا 'لسان الصدق' جیسے علمی و ادبی رسالے کا مدیر کیوں کر ہوسکتا ہے؟ علامہ ان دنوں دو تین ہفتے تک بمبئی میں قیام پذیر رہے۔ اس دوران مولانا کی ان سے بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان ملاقاتوں میں علامہ ان سے حد درجہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

''جب چند دنوں میں گفتگو و صحبت سے انھیں میرے علمی شوق کا خوب اندازہ ہوگیا تو وہ بڑی محبت کرنے لگے۔ بار بار کہتے کہ مجھے ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ تم اگر کسی طرح حیدرآباد آسکو تو ''الندوہ'' اپنے متعلق کرلو اور وہاں مزید مطالعہ و ترقی کا بھی موقع ملے گا۔ 3

اسی سلسلے میں مزید فرماتے ہیں:

سب سے زیادہ مولانا شبلی پر میرے شوقِ مطالعہ اور وسعتِ مطالعہ کا اثر پڑا۔ اس وقت تک میرا مطالعہ اتنا وسیع ہوچکا تھا کہ عربی کی تمام نئی مطبوعات اور نئی تصنیفات تقریباً میری نظر سے گزر چکی تھیں اور بہتیر کتابیں ایسی بھی تھیں کہ مولانا ان کے شائق تھے اور انھیں معلوم نہ تھا کہ چھپ گئی ہیں، مثلاً محصل امام رازی۔ 4

انھیں ملاقاتوں کے دوران فن مناظرہ سے متعلق ایک صاحب کی کج بحثی کا جواب دیتے ہوئے مولانا آزاد نے جب ایک مدلل تقریر کی تو اسے سن کر علامہ نے فرمایا:

تمہارا ذہن عجائب روزگار میں سے ہے۔ تمھیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بہ طور ایک عجوبے کے پیش کرنا چاہیے۔ 5

فروری 1905ء میں علامہ شبلی حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہوکر ندوۃ العلماء کے معتمدِ تعلیمات کی حیثیت سے لکھنؤ آ گئے۔ اس وقت علامہ کی پیش کش اور اصرار کی بنا پر 'الندوہ' کے

نائب مدیر بن کر مولانا آزاد نے بھی لکھنؤ کا قیام اختیار کیا۔اس طرح انھیں علامہ کے ساتھ مسلسل قیام اوران کی علمی وادبی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔لکھنؤ میں مولانا کے قیام اور 'الندوہ' کی ادارت کا زمانہ ستمبر 1905ء سے مارچ 1906ء تک متعین کیا گیا ہے۔ان صحبتوں میں وہ علامہ سے کس قدر متاثر ہوئے،اس کا بیان خود انھیں کی زبانی ملاحظہ ہو۔مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کی غزل پر علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی تحسین بڑی سے بڑی سند ہے جو اس عہد میں مل سکتی تھی۔...علامہ مرحوم کی یاد میں آپ کو کتنا برمحل شعر یاد آیا:

و لیس من اللہ بمستنکر

أن یجمع العالم فی واحد

خواجہ حالی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں

فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات نبوغ وکمالات کے رنگارنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں سرتاسر مغز بے پوست تھی۔ بہ مشکل کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہے کہ ان کی یاد ناخن بہ دل نہ ہوتی ہو۔وہ کیا گئے کہ علم وفن کی صحبتوں کا سرتاسر خاتمہ ہوگیا۔مولانا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے۔والد مرحوم کی سحر خیزی نے مجھے بھی بچپن سے اس کا عادی بنا دیا ہے۔اس اشتراکِ عادت نے ایک خاص رشتۂ انس پیدا کردیا تھا۔ جب کبھی یکجائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت ہوتا۔چائے کا دور چلتا اور علم و فن اور شعر وادب کے چرچے رہتے۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق وفکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملّا یا نہ طلب علم کے ملاّ ئیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی۔خشکیِ طبع جو اس راہ کے مہالک وآفات میں سے ہے، انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔

شاعری کے ذوق وفہم کا جو اعلیٰ مرتبہ ان کے حصے میں آیا تھا، اس کی تو نظیر ملنی دشوار ہے۔'' (مورخہ 26/ اکتوبر 1940ء)

مولانا آزاد کے قیامِ لکھنؤ کے حوالے سے جناب ضیاء الدین اصلاحی نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے سر سے ادارتِ الندوہ کا بوجھ کم کرنے کے علاوہ ''مولانا آزاد کی علمی تربیت کے خیال سے بہ اصرار انھیں لکھنؤ بلایا۔'' اس بیان پر استدراک کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کہتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم کا دور ختم ہو چکا تھا اور مطالعہ ونظر کے جس مقام پر تھے، تربیت حاصل کرنے کے خیال سے بے پروا ہو چکے تھے۔[6]

راقم حروف کے خیال میں یہ استدراک بالکل درست ہے۔ خود علامہ شبلی نے اس سلسلے میں مہدی اِفادی کے نام خط میں یہ الفاظ تحریر کیے ہیں:

آزاد کو تو آپ نے مخزن وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا۔ قلم وہی ہے، معلومات یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔ (مورخہ 6/ مارچ 1906ء)[7]

مارچ 1906ء کے بعد 'الندوہ' کی ادارت سے مولانا کا تعلق باقی نہ رہا۔ اوائل مئی 1906ء تک وہ لکھنؤ میں قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد ''وکیل'' کے مدیر ہوکر امرتسر چلے گئے۔ لیکن علامہ شبلی سے ان کا ربط وتعلق علامہ کی آخر حیات تک باقی رہا۔

بعض اہلِ علم نے اپنی تحریروں میں یہ تاثر دیا ہے کہ مولانا آزاد اگرچہ علامہ کے باضابطہ شاگرد نہ تھے، لیکن اخذ واستفادے کے لحاظ سے وہ ان کے شاگرد معنوی ضرور تھے۔ ہمارے خیال میں یہ تاثر درست نہیں۔ بلکہ اس باب میں سب سے متوازن اور حقائق پر مبنی رائے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ایک طرف بے پایاں شفقت تھی اور دوسری جانب عقیدت واحترام اور سعادت کا اظہار تھا۔ یہ ابوالکلام کی انفرادیت تھی کہ ان کا رویہ روایتی شاگرد کے بجائے برابری کا نظر آتا ہے۔ یہ حضرت شبلی کی عظمت ہے کہ

انھوں نے اپنے اس خرد کی عزتِ نفس کا ہمیشہ خیال رکھا اور ابوالکلام کی یہ سعادت مندی تھی کہ انھوں نے اپنے بزرگ کے علمی مقام کا ہمیشہ اعتراف واحترام کیا۔[8]

یہاں ڈاکٹر شاہ جہاں پوری کی تائید میں یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ علامہ شبلی اپنے مکاتیب میں عام طور پر مولانا آزاد کو ''آپ'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف سید سلیمان ندوی اور اپنے دیگر تلامذہ کو ہمیشہ ''تم'' کے صیغے سے خطاب کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شاہ جہاں پوری نے مولانا آزاد اور علامہ شبلی کے درمیان ربط و یگانگت کے اسباب اور اس کی مختلف جہات پر بھی بہت عمدہ گفتگو کی ہے۔ لکھتے ہیں:

شبلی اور ابوالکلام کے تعلقات کی... پائیداری کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ دونوں بے غرض اور ذاتی مفاد و مصالح سے نا آشنا تھے اور دونوں ایک دوسرے کے فضائل و کمالات کے قدرداں اور ذوقِ علمی اور مطالعہ ونظر کی وسعت و گیرائی کے معترف تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دونوں ہم ذوق وہم فکر تھے۔ ادب، مذہب، تاریخ، تعلیم، سیاست میں دونوں کا نقطۂ نظر یکساں یا قریب قریب تھا۔ ندوۃ العلماء دونوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ سیرۃ نبوی کے منصوبے میں ابوالکلام شبلی کے مشیر ومعاون تھے اور الہلال کی تعلیمی، سیاسی اور اصلاحی تحریک میں شبلی آزاد کے ممد ومعاون تھے، بلکہ الہلال کی سیاسی تحریک کے فروغ اور اس کے رنگ کو نمایاں کرنے میں آزاد کی تحریروں ہی کا نہیں، شبلی کی سیاسی وتاریخی منظومات کا حصہ بھی ہے۔[9]

یہیں سے ان حضرات کے نقطۂ نظر کی بھی تردید ہوجاتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا آزاد کی سیاسی فکر علامہ شبلی سے ماخوذ تھی، کیونکہ یہاں بھی معاملہ اخذ واستفادے کا نہیں، بلکہ مسلک ومشرب کے اتحاد اور فکر ونظر کی ہم آہنگی کا تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خطوطِ شبلی موسوم بہ مولانا آزاد کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمر کے خاصے تفاوت کے باوجود علامہ شبلی اور مولانا آزاد کے درمیان دوستانہ بے

تکلفی بھی تھی۔مثال کے طور پر ان خطوط سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(الف)

اب کی مولوی خلیل الرحمٰن وغیرہ نے جلسۂ انتظامیہ میں میری علاحدگی کی تجویز پیش کی۔اس لیے کہ جب سے میں ندوے میں آیا، لوگوں کی توجہ کم ہوگئی اور ندوہ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔کیوں آپ بھی اس رائے سے متفق ہیں یا نہیں؟ افسوس کہ ان کے ووٹ نہیں آئے، ورنہ بمبئی میں آ کر ٹھکانہ ملتا اور خوب صحبت رہتی۔ ماہ و اختر سب وہیں ہیں، افق ذرا بدل گیا ہے۔...

ہاں اور سنی، افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر انھی آلودہ ہاتھوں سے حیاتِ شبلی کو چھونا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگے ہیں۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے، لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے، وہاں سے منگوائیے۔بھئی بتا تو نہ دو گے۔(مورخہ 15/جون 1909ء)[10]

(ب)

برادرم!

جس قدر آپ کی عنایت و محبت کا یقین زیادہ ہوتا جاتا ہے، اسی قدر آپ کی نکتہ سنجی اور نقادی کی طرف سے بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے کہ آپ میری صحبت کو لطف انگیز اور نسبتہً دوسرے کے مقابلے میں قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں۔...

ٹیا برج کا شانِ نزول بالکل سمجھ میں نہ آیا، ذرا کھول کر لکھیے۔ دونوں مکانوں کا فاصلہ اس قدر کہ ایک ہی وقت میں گویا دو ملک میں رہتا۔ پھر وہاں کی ویرانی، دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔

بے شبہ میری خواہش ہے کہ چند روز دنیا سے الگ بسر کروں، ایسی حالت

میں ایک تصنیف بھی انجام پائے۔لیکن متصل دن رات تو وحشت کدے میں بسر نہیں ہوسکتی۔شیعوں کے عملی فلسفے کی کوئی صورت پیدا ہوتو البتہ ممکن ہے۔(مورخہ 5/دسمبر 1909ء)[11]

(ج)

جنوری میں آپ کہیں اور چلے جائیں گے، دسمبر میں آؤں اور دو چار روز رہ کر چلا جاؤں۔شباب ہوتا تو ایسی جست و خیز ممکن تھی۔اب تو بہر جا کہ نشستم وطن شد، وہ زمانہ بتایئے کہ آ کر ایک آدھ مہینہ رہ سکوں، گو بار خاطر بن جاؤں۔

برج خاکی پر قبضہ ہوجائے تو لکھیے گا۔ہاں ایک روایت تھی کہ ماہ تمام بنگال کے افق پر نکلا۔تلاش سے شاید پتہ لگ جائے۔(مورخہ 10/دسمبر 1909ء)[12]

(د)

برادرم!

میں بخیریت پہنچا۔مغل سرا میں گاڑی نہ صرف بدلی، بلکہ مجھ کو پل صراط کی مصیبتیں جھیلنی پڑی...کلکتہ کی پُرلطف گھڑیاں، اب دیکھیے کب نصیب ہوں۔(مورخہ 9/جون 1910ء)[13]

''آپ کو اب زیادہ مولویت کی صورت میں رہنا چاہیے۔اس سے بہت اچھے اچھے کام لے سکتے ہیں۔''(مورخہ 12/جون 1910ء)[14]

(ہ)

برادرم!

اچھا کہیں نہیں جاؤں گا:

ع بندہ را فرماں نباشد، ہر چہ فرمائی بر آنم

لیکن کیا شبلی کو رابعہ کا درجہ مل سکتا ہے۔لیس الذکر کالأنثیٰ۔

> ماسٹر دین محمد وطن گئے تھے اور سخت جانگزا خبر لائے۔ یعنی بدرِ کامل حیدرآباد سے دلّی پہنچ کر غروب ہوگیا۔ مرتبۂ ابراہیمی کہاں سے ہاتھ آئے کہ ''لا اُحب الآفلین'' کہہ سکوں۔ (مورخہ 15/اکتوبر 1910ء)[15]

ان خطوط میں شوخی، بے تکلفی اور دوستانہ چھیڑ چھاڑ کا جو انداز ہے وہ شرح و بیان کا محتاج نہیں۔

مولانا آزاد نے علامہ شبلی سے تمام تر عقیدت و محبت کے باوجود ان پر بعض تنقیدیں بھی کی ہیں۔ مثلاً ''تذکرہ'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علّیین میں جگہ دے، ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی معاملہ ہو، وہ اس کی ابتدا ہمیشہ شک اور تردد سے کیا کرتے تھے۔ اس چیز نے ان کی عملی زندگی کو بھی (یعنی کاروبار وانتظامات کی زندگی کو) بہت نقصان پہنچایا اور وہ کوئی عملی کام جم کر نہ کر سکے۔ ندوہ کے معاملے میں جو اُلجھاؤ لوگوں نے ڈالے، وہ ان کے اسی ضعفِ یقین و عدم جزم و صلابتِ ارادہ کا نتیجہ تھا، ورنہ ان سے مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو ان کو ان کی جگہ سے ہٹا سکتا۔[16]

مولانا آزاد کے ذاتی کتب خانے میں دس گیارہ ہزار کتابیں تھیں۔ یہ اب انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، آزاد بھون، نئی دہلی کے کتب خانے کا حصہ ہیں۔ مولانا کی عادت تھی کہ وہ زیرِ مطالعہ کتاب پر جہاں ضرورت محسوس کرتے حواشی لکھ دیتے تھے۔ جناب سید مسیح الحسن نے، جو ایک عرصے تک اس کتب خانے کے مرتب و منتظم رہے تھے، ان حواشی کو ''حواشیِ ابوالکلام'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کی دس کتابوں پر بھی مولانا کے حواشی موجود ہیں۔ ان میں مولانا نے جگہ جگہ علامہ سے اختلاف کیا ہے اور بعض مقامات پر ان کا لہجہ سخت بھی ہوگیا ہے۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی سے محبت و عقیدت اور ربط و تعلق کے باوجود بہت سے مذہبی، تاریخی، علمی اور ادبی مسائل میں وہ علامہ سے اختلاف رکھتے تھے اور اس

کے اظہار میں بھی انھیں کچھ باک نہ تھا۔ علامہ کی جن کتابوں پر مولانا نے حواشی لکھے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

سیرۃ النعمان، جلد اوّل	سیرۃ النعمان، جلد دوم
الغزالی	رسائل شبلی، (نسخۂ اوّل)
رسائل شبلی، (نسخۂ دوم)	شعر العجم، جلد اوّل
مقالاتِ شبلی، جلد اوّل	مقالاتِ شبلی، جلد دوم
مقالاتِ شبلی، جلد ہفتم	مضامینِ عالم گیر

ان میں سب سے زیادہ مبسوط حواشی سیرۃ النعمان کی دونوں جلدوں پر ہیں، اس کے بعد ''مضامینِ عالم گیر'' پر۔ اس کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی کی ''حیاتِ شبلی'' پر تحریر کردہ بہت سے حواشی کا تعلق بھی علامہ شبلی کی سیرت و شخصیت سے ہے۔ مولانا آزاد اور علامہ شبلی کے فکری اختلافات کو جاننے کے لیے ان حواشی کا مطالعہ بھی از بس ضروری ہے۔ آئندہ صفحات میں اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ علامہ شبلی نے ائمۂ مجتہدین اور محدثین کے درمیان فرق کرتے ہوئے سیرۃ النعمان میں یہ الفاظ تحریر کیے ہیں:

> مجتہدین جس چیز پر فخر کر سکتے ہیں، وہ دقتِ نظر، قوتِ استنباط، استخراجِ مسائل اور تفریعِ احکام ہے۔ لیکن محدثین کے گروہ کے نزدیک یہی باتیں عیب و نقص میں داخل ہیں۔

اس پر مولانا آزاد کا حاشیہ حسبِ ذیل ہے:

> مصنف کی یہ پوری بحث یکسر مغالطہ ہے۔ اس سے بڑھ کر **کذب علی وجہ الارض** کیا ہوسکتا ہے کہ ائمۂ حدیث کی نسبت یہ کہا جائے کہ دقتِ نظر، قوتِ استنباط، استخراجِ مسائل، درایت و تفکر ان کے نزدیک نقص رہا۔ جس شخص نے صرف تراجم ابوابِ فقیہۂ بخاری وغیرہ ہی پر نظر ڈالی ہے، وہ کیونکر اس خیال کا تصور بھی کر سکتا ہے۔ اور پھر جس شخص نے تصنیفاتِ ابنِ حزم، ابنِ عقیل، ابنِ تیمیہ و ابنِ قیّم وغیرہ کو دیکھا ہے تو وہ

اس خیال کی تکذیب پر حلف شرعی اُٹھا سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس تمام معاملے کے اسباب ہی اور ہیں اور ان کو صاحبِ حجۃ اللہ نے واشگاف لکھ دیا ہے۔ مؤلف کی اس پر نظر ہے، مگر افسوس کہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر مصنف نے اسی جملے پر غور کیا ہوتا کہ ''فروعِ احکام کی تفریع کرتے تھے۔'' تو اصل عُقدہ حل ہو جاتا، یعنی بنیاد اپنے قرار دادہ یا ائمۂ کوفہ کے کلیات پر رکھتے نہ کہ احادیث پر۔ [17]

حاصلِ کلام یہ ہے کہ مولانا آزاد اور علامہ شبلی دونوں ایک دوسرے سے متاثر ضرور ہوئے، لیکن دونوں نے اپنی اپنی انفرادیت بھی قائم رکھی۔

حواشی:

1۔آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، مولانا ابوالکلام آزاد (بہ روایت عبدالرزاق ملیح آبادی) دہلی، 1958ء،ص:257

2۔آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی،ص:212

3۔آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی،ص:311

4۔آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی،ص:312

5۔شبلی معاصرین کی نظر میں، مرتبہ ظفر احمد صدیقی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 2005ء،ص:184

6۔مضامینِ الندوہ۔لکھنؤ، مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، اسلام آباد (پاکستان) 2007ء،ص:41

7۔مکاتیبِ شبلی، جلد دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، 2012ء،ص:175

8۔مضامین الندوہ۔لکھنؤ ص:64

9۔مضامین الندوہ۔لکھنؤ ص:64-65

10۔مکاتیبِ شبلی، حصہ اوّل، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، 2010ء، ص:151-152

11۔مکاتیبِ شبلی، حصہ اوّل،ص:253

12۔مکاتیبِ شبلی،حصہ اوّل،ص:255

13۔مکاتیبِ شبلی،حصہ اوّل،ص:257

14۔مکاتیبِ شبلی،حصہ اوّل،ص:258

15۔مکاتیبِ شبلی،حصہ اوّل،ص:261

16۔تذکرہ،مولانا ابوالکلام آزاد،مرتبہ مالک رام،ساہتیہ اکادمی،دہلی 2008ء،ص:204-205

17۔حواشی ابوالکلام آزاد،مرتبہ سید مسیح الحسن،اردو اکادمی،دہلی 1988ء،ص:267

پروفیسر ظفر احمد صدیقی،شعبہ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ سے وابستہ ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:68-98
Prof. Ali Ahmed Fatmi, Qamar Rais ka Tanqidi Safar (Shairi aur Shairon ke Hawale se)

علی احمد فاطمی

قمر رئیس کا تنقیدی سفر
(شاعری اور شاعروں کے حوالے سے)

اردو تنقید بالخصوص ترقی پسند تنقید میں قمر رئیس کا نام اعتبار کا درجہ رکھتا ہے۔لیکن یہ بھی ہے کہ وہ زیادہ تر پریم چند شناس اور فکشن کے ناقد کے طور پر جانے گئے جبکہ انہوں نے شعروشاعری اور شاعروں پر بھی خاصی تعداد میں مقالے لکھے ہیں لیکن ان پر توجہ نہیں دی گئی' یا کم دی گئی۔قمر رئیس کے قریبی دوست اور ممتاز ترقی پسند نقاد سید محمد عقیل نے جب پوری ترقی پسند تنقید کی تاریخ لکھ ڈالی اور تقریباً بارہ صفحات قمر رئیس کی تنقید نگاری پر رقم کیے۔ یہ تحریر و تجزیہ بھی کم و بیش فکشن پر لکھے گئے مضامین پر زیادہ منحصر ہے۔ راقم الحروف نے بھی قمر رئیس کی پریم چند شناسی یا ترقی پسند تحریک کے حوالے سے تو کئی مضامین لکھے لیکن 'نقدِ شعروشاعر' پر توجہ نہ دے سکا۔اسی لیے زیرِ قلم مقالہ میں ان کے چند اہم شاعروں پر لکھے گئے مضامین کا تجزیہ کرنا مقصود ہے۔ایک بات اور بھی ہے کہ بعض دوسرے اہم ترقی پسند نقادوں کی طرح قمر رئیس نے شاعروں' افسانہ نگاروں' ناول نگاروں پر تو مضامین لکھے اور خوب لکھے لیکن احتشام حسین' ممتاز حسین' محمد حسن وغیرہ کی طرح ترقی پسند افکار و نظریات اور مباحث پر مشتمل مضامین کم لکھے۔ یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے اس لیے کہ قمر رئیس ہر اعتبار سے صاحب نظر نقاد تھے۔زندگی بھر کسی نہ کسی رسالہ کے مدیر رہے اور اپنے ہر رسالہ کے اداریوں میں فکر و نظر کے حوالے سے غور طلب اور بحث طلب موضوعات پر جرأت مندانہ طور پر لکھتے رہے اور متوجہ کرتے رہے لیکن اردو معاشرہ میں اداریوں کو ادبی کے بجائے

صحافتی نظر سے زیادہ دیکھا گیا اور اسے تنقید میں جگہ نہیں دی گئی جبکہ قمر رئیس کے اداریے ادبی و تنقیدی نظریہ سے خاص اہمیت کے حامل ہیں اور انہیں یکجا اور تجزیہ کرنے کی شدید ضرورت ہے۔قمر رئیس نے کئی اہم کتابیں بھی ترتیب دی ہیں اور ان میں طویل اور قابل قدر مقالے بھی لکھے ہیں ان پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ سب اپنی جگہ پر درست لیکن ساتھ میں یہ بھی درست ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعوں کو بغور دیکھا جائے تو 'تلاش وتوازن' (1968) سے لے کر اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب (2004) تک میں فکری ونظریاتی مضامین کم ملیں گے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس نوعیت کی باتیں اور بحثیں کم ہیں یا نہیں ہیں۔ان کے جو بھی نظریات اور افکار ہیں وہ شاعروں وفنکاروں کے جائزوں وتبصروں کے اندرون میں جذب ہیں یا تحلیل ہو گئے ہیں۔ بادی النظر میں اس کمی کے باوجود ان کا بیحد اہم مضمون ایسا ضرور ہے جس سے گفتگو کا آغاز کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے ''مارکسی تنقید: رجحان اور رویے''۔ عین ممکن ہے کہ اس نوعیت کے اور بھی ادبی مضامین ہوں جو میری نظر سے نہ گذرے ہوں۔ میں نے اس مضمون کو اس لیے بھی منتخب کیا کہ قمر رئیس کی ترقی پسند فکر اپنے تمام توازن اور استدلال کے باوجود وہ مارکسی نقاد کے طور پر جانے گئے اس لیے اس رویے ونظریے کو سمجھتے چلنے کی ضرورت ہے تا کہ ایک تناظر قائم ہو جائے اور اسی سیاق وسباق پر جانچ تو ہموار ہو سکے۔ یہ مضمون میں نے اس لیے بھی چنا کہ قمر رئیس نے اپنے پہلے ہی مجموعہ 'تلاش وتوازن' کے دیباچہ میں صاف طور پر اعتراف واعلان کیا:

> ''میں تنقید کے ایک خاص دبستان سے تعلق رکھتا ہوں جسے عام طور پر ادب کی سماجیاتی تنقید' کا نام دیا گیا ہے اور جس کے مطابق شعروادب کو سماجی محرکات اور ماخذوں کے وسیع تر پس منظر میں دیکھا' سمجھا اور پرکھا جاتا ہے۔میرے نزدیک ہر ادبی تخلیق خواہ وہ کسی بھی باطنی تجربے یا داخلی حقیقت کا اظہار ہو اس کا پیرایۂ بیان کتنا ہی نازک اور تہہ دار ہو کسی نہ کسی سماجی صورتِ حال کا عکس ہوتا ہے۔'' (تلاش وتوازن' ص 8)

'تعبیر وتحلیل' میں بھی لکھتے ہیں:

> ''میں اپنے ادبی موقف اور تنقیدی تفہیم میں مارکسزم سے روشنی حاصل کرتا

رہا ہوں۔ مارکسزم میرے نزدیک کوئی عقیدہ یا بے لچک میکانکی نظریہ نہیں بلکہ زندگی، تاریخ، معاشرہ اور انسانی کلچر کے مظاہر کی تفہیم و تعبیر کا ایک کشادہ طریق کار (Method) ہے۔" (تعبیر و تحلیل، ص10)

مارکسزم اور مارکسی نوعیت کی تنقید کے بارے میں ان کی تفصیلی آواز کو سمجھنے کے لیے "مارکسی تنقید: رجحان اور رویّے" کا سمجھتے چلنا بھی ضروری ہے۔ مضمون کی ابتدا میں ہی وہ صاف طور پر لکھتے ہیں:

"میں مارکسی تنقید کے طریق کار کو عصر حاضر کے دوسرے تنقیدی رویوں یا نظریوں کے مقابلے زیادہ محیط، کارگر، نتیجہ خیز اور علمی یا معروضی سمجھتا ہوں۔ اس لیے مارکسی تنقید کے تعلق سے میری تنقید میں پاسداری نہ سہی، پسندیدگی کا رویہ ضرور ملے گا۔"

قمر رئیس نے پاسداری اور پسندیدگی کے درمیان نازک فرق کو بڑے سلیقہ سے پیش کر دیا۔ یہ فرق پیش کرنا اس لیے ضروری تھا کہ تنقید کے تخلیق سے جو باطنی رشتے ہوا کرتے ہیں، جو انجذاب و انسلاک ہوتا ہے اور تلاش و تحقیق کا جو فکر کے ساتھ ساتھ فطری رشتہ ہوا کرتا ہے ایک عمدہ تنقید میں وہ میکانکی نوعیت کا نہیں ہوتا۔ وہ اندرون میں تحلیل شدہ مواد و متن کو اپنے انداز اسلوب سے تلاش کرتا ہے اور پھر پیش کرتا ہے اکثر اس عمل میں تنقید کو خود ایک تخلیقی عمل سے گذرنا پڑتا ہے اس لیے بھی بعض نقادوں نے تنقیدی عمل کو تخلیقی عمل قرار دیا ہے۔ انگریزی نقاد 'کپلنگ' نے بھی کہا تھا کہ Criticism is creation within creation۔ ایسا کچھ شعوری زیادہ لاشعوری طور پر ہوتا ہے۔ یوں بھی تنقید کی کوئی بھی قسم ہو یہاں تک کہ مارکسی تنقید بھی کوئی ڈھلا ڈھلایا فارمولہ نہیں ہوتی۔ مارکسی نقاد محمد حسن نے اپنے ایک مضمون 'مارکسی نظریۂ تنقید' میں اعتراف کیا کہ:

"مارکسی تنقید آرٹ کا کوئی بندھا ٹکا آدرش نہیں۔ اس کا آدرش ہمیشہ ان جزوی اور انفرادی ادبی تخلیقات میں ملتا ہے اور ان سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ مارکسی تنقید اور ادبی شہ کار کی مختلف صفات کو شے سے علیحدہ نہیں کرتی وہ شے اور صفت کی ناقابل تفہیم وحدت کی قائل ہے۔"

کم وبیش یہی خیال قمر رئیس بھی پیش کرتے ہیں جسے سمجھتے چلنے کی ضرورت ہے:

''مارکسی تنقید کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی عہد کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی طبقاتی بنیاد اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل اور Tensions سے صرفِ نظر نہیں کرتی۔ مارکسؔ نے انسانی سماج کو ایک ارتقا پذیر نامیاتی سماج کہا ہے۔ یہی نامیاتی روح اور منعکس کرنے والے ادب میں بھی موجزن ہوتی ہے۔ ادب میں زندگی کی یہ ترجمانی کیونکہ ایک خود آگاہ اور احساس انسانی وجود کے واسطے سے ہوتی ہے اس لیے ہر فنی تخلیق و وحدت کے علاوہ اپنا ایک آزاد اور منفرد وجود رکھتی ہے۔''

آزاد و منفرد وجود کا اعلان قمر رئیس کے لچیلے اور لبرل رویے کا اظہار کرتا ہے اور یہی لبرٹی پوری بے باکی کے ساتھ یہ کہنے میں بھی تکلف نہیں کرتی:

''مارکسی تنقید کی ایک کمزوری بعض سماجی' معاشی اور فلسفیانہ اصلاحوں کی تکرار ہے جن میں سے اکثر نے کلیسے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور وہ ابلاغ سے تقریباً عاری ہوگئی ہیں۔ اس لیے نئے تنقیدی اظہارات کی اختراع ضروری ہوگئی ہے۔''

اب دیکھنا یہ ہے کہ مارکسی نقطۂ نظر یا اس کے تئیں لبرل رویوں کے تحت قمر رئیس شاعری اور شاعروں پر کس نوعیت کی نگاہ ڈالتے ہیں۔ اس نگاہ میں ان کا ذاتی نقطۂ نگاہ کیا ہے۔ نقطہ کی گرانی اور نگاہ کی روانی انہیں کس مقام پر لے جاتی ہے۔ ابتدا میں ان کے قدیمی و کلاسیکی شعرا (نظیرؔ' غالبؔ' حالیؔ' اقبالؔ وغیرہ) پر لکھے گئے مضامین' اس کے بعد ترقی پسند شعرا (جوشؔ' فیضؔ' مخدومؔ' سردارؔ' کیفیؔ وغیرہ) کا سرسری جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

نظیرؔ اکبر آبادی پر لکھے گئے ان کے اکلوتے لیکن انوکھے مضمون کے ذکر سے قبل لوک گیت سے متعلق ان کے نظریہ کو سمجھتے چلنا ضروری ہے۔ ایک زمانے میں قمر رئیس کو لوک ادب اور عوامی شاعری پر غور وخوض کرنے کا جنون سوار ہوگیا تھا۔ نظیرؔ اکبر آبادی پر کام اور اکبر آباد (آگرہ) میں چند برس کے قیام کے پیشِ نظر انہوں نے راقم سے بھی اس ضمن کئی طویل گفتگو اور خطوط لکھے۔

ایک بڑا سیمینار بھی کیا (1988) جس میں راقم بھی شریک تھا۔ اس سیمینار میں پڑھے گئے تمام مقالات کو 1990ء 'اردو میں لوک ادب' کے عنوان سے کتاب بھی شائع کی۔ اس کتاب میں قمر رئیس کا اپنا کوئی مضمون تو نہیں لیکن پیش لفظ کے عنوان سے لکھا گیا مقدمہ بیحد اہمیت کا حامل ہے۔ مقدمہ کی ابتدا میں وہ ایک تلخ صداقت کا جرأت مندی سے اظہار کرتے ہیں:

''اردو زبان یا اردو علاقہ سے تعلق رکھنے والے لوک ادب کے بارے میں اردو تذکرہ نویسوں، عالموں اور نقادوں نے جو تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا وہ اس لیے زیادہ حیرت کا باعث نہیں ہے کہ یورپ میں اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے اہل علم نے لوک ادب کے تئیں کم از کم انیسویں صدی تک اسی ہتک آمیز رویے کا مظاہرہ کیا۔ وہاں بھی لوک ادب کو جاہل اور غیر متمدن، گنواروں کی خرافات اور تک بندی کا نام دیا گیا اور ادب کی تاریخ میں اس کے حوالے یا تذکرے کو جرم سمجھا گیا۔ جو بات حیرت کی باعث ہے وہ یہ ہے کہ آج کے جمہوری دور میں بھی اردو والے عوامی ادب کے اپنے اس عظیم سرمایہ کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس سرمایے کو ملک کی دوسری زبانیں اپنے تصرف میں لاکر اپنے آپ کو مالا مال کر رہی ہیں اور اپنی ادبی تاریخ کی حدوں کو وسیع تر بنا رہی ہیں۔''

(اردو میں لوک ادب، ص 5)

یہ فرق بھی سمجھتے چلنا چاہیے کہ عوامی شاعری یا عوامی موضوعات پر شاعری اور لوک گیت قریب تر ہوتے ہوئے بھی قدرے الگ ہیں۔ لوک گیتوں کے بارے میں قمر رئیس کا یہ کہنا بجا ہے:

''ان کا مصنف گمنام ہوتا ہے۔ یہ گیت زیادہ تر اجتماعی اور کم تر انفرادی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اکثر یہ گیت محنت کش عوام کی اجتماعی تخلیقی محنت کے عمل میں خلق ہوتے ہیں اور گائے جاتے ہیں۔ ان کا آہنگ کسی عروض قاعدے کے بجائے عوام کے احساسِ موسیقی کا تابع ہوتا ہے۔ عوامی قصوں کے مآخذ بھی یا تو عوام کے تلخ و شیریں تجربات ہوتے ہیں یا

> مصائبِ حیات سے نجات پانے کی ازلی خواہش اور ایک بہتر زندگی کے
> خواب ہوتے ہیں۔ (ص7)

اس کے بعد وہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔لوک گیتوں کے تعلق سے یہ تعریف درست تو ہوسکتی ہے لیکن وہ شاعری جو ہر طرح کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی مصنف یا شاعر کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے اس کو کس خانے میں رکھیں گے، خود نظیر اکبرآبادی کی شاعری۔اسی لیے بعض نقاد یہ کہتے ہیں کہ وہ عوامی شاعر تو ہیں لیکن ان خاص معنوں میں لوک گیتوں کے شاعر نہیں ہیں اگر چہ ان کی شاعری کا کچھ حصہ لوک گیتوں کی حد میں داخل ہوتا ہے لیکن اس کا ذکر اس لیے نہ کیا جائے کہ ان کا نام ملتا ہے' یہ بات قابلِ قبول نہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ قمر رئیس نے انہیں کیا پہچان دی' مضمون کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے:

> ''وہ فارسی زدہ مذاق شعری اور اشرافیہ کی رسوم کے باغی ایک عوامی اور عوام
> دوست شاعر ہیں۔''
> ''نظیر کی شاعری اعلیٰ طبقہ کی محدود و جذباتی محل سراؤں سے باہر آ کر کے
> کوچہ و بازار کے پس ماندہ اور افلاس کے مارے انسانوں' ان کے پیشوں'
> مشغلوں' معمولات اور میلوں ٹھیلوں کی شاعری ہے۔''

لوک شاعری اور عوامی شاعری کے مابین نازک فرق کو بھی سمجھتے چلنا ضروری ہے۔لوک میں کسان' مزدور' عورتیں' محنت کش عوام کا ذکر ہوا ہے۔عوامی شاعری میں کوچہ و بازار' پیشوں اور مشغلوں کا ذکر ہے۔درمیان میں ہیں نظیر اکبرآبدی۔قمر رئیس جنہیں عوامی سے زیادہ انحرافی شاعر کہہ کر اپنے اشتراکی وانقلابی نظریہ کا اظہار بھی کرتے ہیں' کیا اچھے جملے ہیں:

> ''یہ فارسی اور اردو دونوں سے انحراف کا نمونہ تھی۔اس کے پیچھے ایک ایسا
> ذہن تھا' ایسا اجتماعی شعور تھا کو ارضِ وطن کی محبت' مشترکہ تہذیب کی دلربائی
> کا گہرا احساس اور اس کے تحفظ کے والہانہ جذبات کا آئینہ دار تھا۔''

لوک گیتوں کے گانے والے عام انسان اور کسان وغیرہ میں اجتماعی شعور تو ہوتا ہے لیکن تہذیب و تحفظ کا گہرا شعور عموماً نہیں ہوتا البتہ یہاں قمر رئیس کا گہرا مارکسی شعور زیادہ کام کرتا

دکھائی دیتا ہے کہ اگر تخلیقی وجدان میں رومان کے بجائے نظریاتی شعور کا عمل دخل ہونے لگتا ہے۔ تنقید اور نقاد کی یہ مجبوری بھی ہوتی ہے جو اکثر کمزوری بن جایا کرتی ہے لیکن اسی مضمون میں قمر رئیس کی ہنرمندی یہ ہے کہ وہ نظیرؔ کو قدیم ہندوستانی تہذیب کی رنگارنگ وراثت پر ان کے اعتماد واعتقاد کو تلاش کرکے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ پہلو تو قطعی نیا نہیں ہے لیکن اس پر گفتگو نئی سی ضرور لگتی ہے کہ نظیرؔ کی زندگی اور شاعری کی ترجیحات کیا تھیں۔ ان ترجیحات کو قمر رئیس نے ان کی تخلیقات میں تلاش تو ضرور کیا ہے لیکن آگے کی بحث عمومی ثابت ہوکر رہ گئی ہے۔ البتہ چند جملے معنی خیز اور فکرانگیز ہیں جو غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً

''نظیر کی شاعری ہی نہیں تہذیبی حسیّت بھی لوک گیتوں کی روایت میں ڈھلی تھی۔''

اچھا ہوا انہوں نے روایت کہا، ماہیئت وحقیقت نہیں کہا اور روایت کے معنی تو وسیع تر ہوا کرتے ہیں۔ اس وسعت کو انہوں نے مضمون کے خاتمہ پر یوں پیش کیا ہے:

> ''وہ عقیدتوں کے فرق کے باوجود رہن سہن اور تہذیبی شعائر میں تمام
> ہندوستانیوں کو متحد دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔ خلوص اور سچائی سے بھری یہ
> وطن پرستانہ آرزو ان کی دوسری ان گنت نظموں میں بھی صاف نظر آتی
> ہے۔ یہ نظیرؔ کی البیلی شخصیت اور عوام دوست شاعری کا جوہر ہے۔''

لوک شاعری، عوامی شاعری اور عوام دوست شاعری اگرچہ ایک ساخت کے قریبی عناصر ہیں تاہم ان میں نازک سا فرق بھی ہے۔ یہ فرق کیا ہے؟ عوامی شاعری پر کام کرنے والوں نے ظاہر کردیا ہے، جس کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ قمر رئیس نے مضمون کی ابتدا میں جو شکایت یا حقیقت قائم کی وہ درمیان میں ان کے فکرونظر کے تانے بانے میں الجھ گئی تاہم نظر کے حوالے سے ایک مخلصانہ بحث بہرحال سامنے آتی ہے اور یہ بحث ایک ترقی پسند مفکر ہی اٹھا سکتا تھا اور اس فکر میں مارکسی رویہ کام کرتا دکھائی دیتا ہے ورنہ اکثر معیار پرست نقادوں، عالموں نے نظیرؔ کی عوامی وزمینی شاعری کو بازاری کہہ کر سرمایۂ ادب اور احاطۂ ادب سے باہر ہی کردیا تھا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس نوع کی زمینی شاعری اور نظیرؔ کی عوامی شاعری کی دریافت دراصل ترقی پسند نقادوں کی ہے (ملاحظہ کیجیے 1940ء میں شائع 'نگار' کا 'نظیرؔ نمبر') جدید نقادوں کی تو ساری

توجہ غالبؔ پر ہی رہی کہ وہ جس نوع کے ابہام‘ پیچیدگی اور ژولیدگی کو لے کر چل رہے تھے اور اپنے آپ کو نظیریت و عوامیت سے شعوری طور پر الگ کر رہے تھے اس اعتبار سے ان کے لیے سب سے زیادہ کام آنے والے شاعر غالبؔ ہی تھے۔ غالبؔ نے ان کے لیے ڈھال کا کام کیا۔ اس کے برعکس ترقی پسند نقادوں نے اپنے فکر ونظر کے حوالے سے غالبؔ کو وسیع تر تاریخی وتہذیبی سیاق وسباق میں سمجھا اور سمجھایا۔ دیکھتے ہیں کہ قمر رئیس نے جو غالبؔ پر طویل مضمون لکھا ہے وہاں ان کے افکار ونظریات کس مقام پر کھڑے ہیں۔ مضمون کا عنوان ہے ’’غالبؔ اور جدید کلاسیکی غزل‘‘ یہ مضمون ان کے دوسرے مجموعہ ’تنقیدی تناظر‘ (1978) میں سرِ فہرست مقام رکھتا ہے۔ یہ مضمون راست طور پر غالبؔ پر کم بلکہ جدید کلاسیکی غزل پر زیادہ ہے‘ یعنی جدیدیت اور کلاسیکیت دو متضاد کناروں کے مابین اندرونی رشتوں کی تلاش ہے۔ بالخصوص اس دور کی غزل جب غالبؔ نے اردو غزل کو تفکر وتغزل دونوں اعتبار سے معراجِ سخن پر پہنچا دیا۔ جن کا اسلوب تو کلاسیکی ہے لیکن جدت طرازی‘ خیال انگیزی اور خرد افروزی غزل کو ایک نئے دور میں پہنچا رہی تھی۔ قمر رئیس نے اس غیر معمولی تاریخی تبدیلی کے تعلق سے غالبؔ کے ساتھ میرؔ کو بھی شامل کرلیا۔ اسی لیے وہ ابتدا میں لکھتے ہیں:

> ’’جدید اردو غزل کے نشو ونما میں میرؔ و غالبؔ دو بنیادی آوازوں اور دو متحرک روایتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ جدید کلاسیکی غزل کے اسلوب و آہنگ کی تشکیل دراصل انہیں دو رنگوں کے ڈوبتے ابھرتے اور تحلیل ہوکر نئے رنگوں میں ڈھلنے اور نکھرنے کی تاریخ ہے۔‘‘ (ص 9)

اور یہ بھی کہتے ہیں:

> ’’یہاں جدید کلاسیکی غزل سے میری مراد بیسویں صدی کے اعتبار سے کلاسیکی روایات کی تجدید وتوسیع لیکن اپنے داخلی مزاج اور مصنوعی فضا کے اعتبار سے عصرِ حاضر کی تہذیب اور احساس وشعور کا آئینہ دار رہا ہے۔‘‘

قمر رئیس کی نظر میں جدید حسیّت کا تعلق عصری حقائق اور گہرے تاریخی شعور سے ہے جو غالبؔ نے لاشعوری طور پر آنے والے شعرا کو دیا۔ ظاہر ہے کہ اس نظر کے پیچھے نظریہ کام کرتا دکھائی

دیتا ہے اور یہ نظریاتی تلاش بھی کہ نئے غزل گو شعرا نے اپنی آواز کو تو پایا، ساتھ ہی غالبؔ کی آواز کو ایک نئی آواز دی۔ نیا لحن اور نیا ذہن دیا تبھی تو قمر رئیس پورے اعتماد سے کہتے ہیں:

''بیسویں صدی میں غالبؔ کی بازیافت مختلف ذہنی اور اجتماعی محرکات کے تحت مختلف حلقوں میں اور مختلف سطحوں پر ہوئی ہے۔ کسی نے غالبؔ کے اسلوبِ شعری پر زور دیا ہے، کسی نے ان کی غیر محاوراتی لیکن باوقار زبان پر، کسی نے ان کے مضامین کی بلندی اور تازگی کو ان کی انفرادیت کا طرہ سمجھا۔ کسی نے ان کے تخیل کی شادابی اور طرفگی پر جان دی۔ کوئی ان کی متانتِ فکر اور فلسفیانہ روح کا گرویدہ ہوا تو کسی نے ان کے کمالِ فن یعنی شعری صناعی کو عزیز جانا۔ کوئی زندگی کے بارے میں ان کے بیباک حقیقت پسندانہ رویے سے متاثر ہوا تو کسی نے ان کے عام مسلک اور نظام اقدار کو محبوب جانا۔ الغرض غالبؔ نے اپنے آپ کو مختلف دائروں، قسطوں اور وقفوں میں بے نقاب کیا۔'' (ص 10)

پھر وہ اس کی تفصیل و تفسیر میں چلے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے حالیؔ پر ہی گفتگو کرتے ہیں اور فرق کو واضح کرتے ہوئے غالبؔ کی تحقیق پر معروضی گفتگو کرتے ہیں کہ جس کے اقبالؔ تک قائل تھے لیکن مضمون میں مقامِ حیرت اس وقت آتا ہے جب وہ ناول نگار مرزا رسواؔ کو بطور شاعر بلکہ ان کی انحرافی شخصیت و شاعری پر گفتگو کرتے ہیں اور انہیں مجدد فن تو مانتے ہی ہیں غالبؔ کا پیروکار بھی مانتے ہیں۔ وہ تقویت کے لیے عزیزؔ لکھنوی کی ایک مثال پیش کرتے ہیں:

''لکھنؤ میں ان کی (مرزا رسواؔ) ذات ایک مجدد فن کی تھی۔ ان کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب لکھنؤ میں آتشؔ و ناسخؔ کے ترانے گونج رہے تھے۔ اس وقت جس شخص نے سب سے پہلے ترمیم کی وہ مرزاؔ کی ذات تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اس رنگ کو اختیار کیا مگر غالبؔ کے رنگ میں جس قدر کامیابی مرزاؔ کو حاصل ہوئی کسی ایک کو بھی نصیب نہ ہوسکی۔ مرزاؔ نے زمین میں تقلید نہیں کی بلکہ خیالات و طرزِ ادا میں غالبؔ کا

تتبع کیا۔''   ('زمانہ' مارچ 1933ء ص 146)

یہ نئی اطلاع ہے کہ قمر رئیس کا خیال ہے کہ رسوا نے غالب کے طرزِ اظہار کا تتبع نہیں کیا بلکہ طرزِ فکر کی پیروی کی ہے۔ پھر وہ ثاقب، عزیز وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں جو لکھنؤ کی روایتی شاعری میں اصلاح کر رہے تھے اور یہ سب کے سب آتش، ناسخ کے بجائے غالب سے متاثر تھے۔ قمر رئیس ان سب کے اشعار بھی پیش کرتے ہیں جو لکھنوی رنگ سے بالکل الگ ہیں، ایک نیا رنگ جس کے پیچھے کسی نہ کسی طور پر غالب کا رنگ تھا۔ اس طرح وہ سیماب، ناطق، وفا، وحشت وغیرہ کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن جب اقبال پر آتے ہیں اور کہتے ہیں:

> ''اس دور کے شعرا میں دراصل اقبال ہی ہیں جن کے ذہن میں نئی زندگی اور نئی حقیقتوں کا عکس سب سے زیادہ صاف اور روشن تھا۔ وہ نہ صرف قومی بلکہ عالمی سطح پر انسانیت کے مسائل اور انسانوں کی نو بہ نو الجھنوں کو دیکھ رہے تھے اور اپنے تاملات اور تاثرات کو ان کی ساری دقت اور نزاکت کے ساتھ ادا کرنے کے لیے بے چین تھے۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ اپنی تخلیقی فکر کے سفر میں وہ غالب اور ان کے اسلوبِ شعری کے سہارے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔''   ('تنقیدی تناظر' ص 22)

اور یہ نتیجہ بھی:

> ''اردو غزل کی تجدید اور تعمیر نو میں اقبال نے جو حصہ لیا وہ تیز رو غالب اور حالی کے ساتھ تھوڑی دور چلنے کا ہی نتیجہ تھا۔ غالب کے فکری مزاج کو انہوں نے ایک فلسفیانہ ربط وضبط سے روشناس کرایا۔ غزل کو بازناں گفتن کے دائرے سے نکالنے اور وسیع تر انسانی زندگی، ذہن اور جذبات کا ترجمان بنانے میں بھی غالب نے اقبال کو مدد کی۔''   (ص 24-23)

دونوں کی مماثلتوں کو لے کر قمر رئیس کے یہ تجزیاتی جملے دیکھیے:

> ''دونوں شخصیتوں میں کئی چیزیں مشترک اور مماثل ہیں۔ فکر انگیز ذہن، پرسوز طبیعت، جوش و تخیل، جاندار احساس اور انسان دوستی کا بے کراں

جذبہ۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کے لہجے میں انفعالیت اور نرمی کے بجائے شکوہ و وقار کا احساس ہوتا ہے اور یہ شکوہ و وقار اکثر فارسی تراکیب کے خلاقانہ استعمال کی صورے میں سامنے آتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دونوں کی زندگی کی حقیقتوں کو جس سطح پر دیکھا اور چھوا ان کی شعری صورت گری میں ایک نیا لہجہ ایک نئے طرزِ بیان اور ایک نئی شعری حسیّت کا وجود میں آنا ناگزیر تھا۔'' (ص24)

قمر رئیس گفتگو شعری صورت گری کی ضرور کرتے ہیں لیکن جدید نقادوں کی طرح محض لفظوں کی تراکیب خیال بندی تک محدود نہیں رہتے۔ ایک ترقی پسند مارکسی نقاد کی حیثیت سے وہ دونوں کی انسان دوستی اور زندگی کے تئیں حقیقت پسندی کو زیادہ بامعنی سمجھتے ہیں اور صاف طور پر کہتے ہیں ''اقبالؔ کی آواز میں غالبؔ کی آواز کا ارتعاش صاف محسوس ہوتا ہے۔'' اچھی بات یہ ہوئی کہ قمر رئیس نے اسے ارتعاش کا نام دے کر اپنے آپ کو ترقی پسند فکر کی اس شدت پسندی سے بچالیا جس کے وہ نقاد اکثر شکار رہتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ قمر رئیس کے یہاں فکر کی شدت ہوسکتی ہے لیکن اظہار میں بہر حال نرمی و لچک ہوا کرتی ہے۔

اقبالؔ کے بعد حسرتؔ یگانہؔ وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں ''یگانہ کے معاصرین میں اصغرؔ اور فانیؔ نے بھی غالبؔ سے کسبِ نور کیا۔'' فانیؔ کے سلسلے میں یہ فیصلہ قابل غور ہے ''واقعہ یہ ہے کہ فانیؔ کو فانیؔ میرؔ نے نہیں بلکہ غالبؔ نے بنایا ہے ان کے اسلوبِ شعری کی انفرادیت میں غالبؔ کے فن کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔'' اس کی دلیل میں وہ اشعار بھی پیش کرتے ہیں مضمون کے آخر میں یہ وضاحت بھی:

''اب تک جو کہا گیا ہے اس کا ہرگز یہ مدعا نہیں کہ جدید کلاسیکی غزل سرتاسد دیوانِ غالبؔ کی پروردہ ہے یا کہ جدید شعرا نے یا ان میں سے بعض نے رنگِ غالبؔ کی تقلید اور تتبع میں کامیابی حاصل کی۔ میرا مقصد صرف اس رشتے کی وضاحت کرنا تھا جو جدید غزل سے غالبؔ کا رہا ہے۔'' (ص29)

بات جذبِ اثر کی معنی خیز ہے اور قمر رئیس کی یہی خوبی ہے کہ ان کے فیصلوں میں قطعیت وحتمیت اور شدت نہیں ہوتی بلکہ ایک لچیلا و پھیلا ہوا رویہ ہوتا ہے جس میں امکان کی گنجائش بہر حال بنی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہر طبقۂ فکر کے لیے قابلِ قبول نہ بھی ہو قابل توجہ تو ہوتا ہی ہے۔ یوں بھی ادب میں رائیں ہوتی ہیں فیصلے نہیں ہوتے۔ بہر حال غالبؔ پر یہ الگ قسم کا مضمون ہے جس میں وسعت اور پھیلاؤ ہے اور جس کو سمیٹنے میں قمر رئیس بہر حال کامیاب ہوئے ہیں۔

غالبؔ کے بعد حالیؔ کو نئی غزل کا پیش رو مانتے ہیں اور ایک مختصر سا مضمون بعنوان ''حالیؔ کی غزل' نئی غزل کی پیش رو' غالبؔ کی معنی آفرینی اور مشکل بیانی کے مقابلے حالیؔ کی سادہ بیانی نئی غزل کو کس طرح متاثر کرتی ہے' یہ بات غور طلب ہے۔ عام خیال ہے کہ 1893ء میں 'دیوانِ حالیؔ' کی اشاعت کے بعد حالیؔ کے مقدمہ نے جس طرح لوگوں کو متوجہ کیا' ان کے سرمایۂ شاعری نے اس طرح سے نہیں کیا لیکن قمر رئیس کا خیال ہے کہ ''مقدمہ کی طرح حالیؔ کے دیوان نے بھی جدید اردو شاعری کے سفر کی راہیں متعین کرنے میں اہم حصہ لیا ہے۔ استعجاب کا پہلو یہ ہے کہ اس دعوے کے ثبوت کے لیے وہ حالیؔ کی نظموں پر نہیں غزلوں پر گفتگو کرتے ہیں اور ابتدا میں ہی اپنی رائے پیش کر دیتے ہیں۔'' ''یہ ایسی غزلیں ہیں جو اپنے مجموعی رنگ و آہنگ یا تخلیقی رویے کے اعتبار سے نئی یا جدید تھیں۔'' اور یہ بھی ''ان کے محرکات حالیؔ کے معاصرین سے مختلف تھے۔'' یہ اختلاف کیا ہے اور نئی غزل سے اس کا اشتراک کیا ہے یہ پہلو نہ صرف غور طلب ہے بلکہ تجسس آمیز بھی۔ یہاں بھی وہ روحِ عصر کی بات کرتے ہیں اور یہ بھی کہ جو شعرا زمانے کے تغیرات کے پیشِ نظر اپنے یہاں تبدیلی لاتے ہیں اور تقاضائے عصر کے حوالے سے تازگی اور نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اکثر کامیاب ہوتے ہیں اور جو محض روایت پرستی یا فیشن پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں وہ زیادہ دور تک نہیں چل پاتے۔ حالیؔ نرے شاعر نہ تھے بلکہ مفکر و دانشور تھے' عہد شناس تھے اور قوم پرست و عقل پرست بھی۔ اسی لیے قمر رئیس یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ''حالیؔ تغیر و تبدیلی کے اس عمل میں ذہنی و جذباتی طور پر شریک تھے اور دیکھ رہے تھے کہ قدیم نظامِ تمدن کے زوال کے ساتھ ایک نیا ثقافتی ڈھانچہ اس کی جگہ لے رہا ہے وہ اسے لبیک کہہ رہے تھے اور احساس و آگہی کے اس نئے سرمایہ کو اپنی شاعری میں سمو رہے تھے۔''

ان کی نظمیں تو ان تبدیلیوں کا برجستہ و برملا اظہار بنتی ہیں لیکن غزل کی کلاسیکیت' حسن و لطافت کے وہ منکر نہیں تھے لیکن اس کی فرسودگی اور روایت پرستی کے وہ ضرور منکر تھے۔قمر رئیس کا یہ خوبصورت جملہ دیکھیے ''وہ غزل کی کلاسیکی روایت سے منحرف نہیں تھے اگر منکر تھے تو اس کی رسمی شاعری اور نیم مردہ تقلیدی اسلوب سے جو زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں تھا۔'' آخر کوئی تو وجہ ہے کہ حالیؔ' غالبؔ کے قریب تر ہوئے۔یادگارِ غالبؔ جیسی بے مثال کتاب لکھتے ہوئے بھی وہ غالبؔ کے مقابلے شیفتہؔ کے رنگِ سخن سے زیادہ قریب ہوئے۔اسی لیے شیفتہؔ مبالغہ اور بے جا حسنِ بیان وحسنِ آرائی وغیرہ کو ناپسند کرتے اور یہی مزاج حالیؔ کا تھا۔حالانکہ حالیؔ کے اس مزاج و مذاق اور غزل کے تئیں بعض خیالات سے قمر رئیس اختلاف بھی کرتے ہیں تاہم یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ حالیؔ اپنے عہد کے دیگر شعرا کے مقابلے اپنے عہد کے نشیب وفراز کو زیادہ قریب سے اور شدت سے محسوس کر رہے تھے اور یہ اکیلا نکتہ قمر رئیس کو حالیؔ کی غزل گوئی پر لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔یہاں بھی عصریت زمانہ اور عہد ہی بولتا ہے اور یہی ترقی پسند تنقید کی تخصیص ہے کہ جس کے تجزیے میں متن کے ساتھ عہد' عہد کی تہذیب' تقلیب نظر آتی ہے۔جدید نقادوں کو ان عناصر سے لینا دینا نہیں ہے اس لیے حالیؔ سے بھی لینا دینا نہیں ہے۔قمر رئیس حالیؔ کی غزلوں کے بعض اشعار کے ذریعہ ان کی عہد شناسی' تغیر وتبدیلی اور کہیں کہیں زندگی کا آشوب اور بحران بولتا نظر آتا ہے۔بحران وانتشار وغیرہ کو غزل کی نازک ولطیف زبان میں پیش کرنا مشکل ہوا کرتا ہے لیکن جو کام فیضؔ' مجروحؔ' جذبیؔ وغیرہ نے بہت بعد میں کیا حالیؔ نے اشاروں اشاروں میں اس کی معنی خیز ابتدا کر دی تھی۔اس لیے قمر رئیس کا یہ خیال بڑی حد تک درست لگتا ہے:

> ''یہ کہا جا سکتا ہے کہ سو سال قبل حالیؔ نے غزل میں اجتماعی جذبات اور سیاسی تجربات کے تخلیقی اظہار کی جو سمت متعین کی تھی وہ نئی غزل کی ایک روایت بن گئی۔'' (تعبیر وتحلیل' ص210)

حالیؔ محض اجتماعیت کے شاعر نہیں ہیں بلکہ ان میں انفرادیت بھی ہے اور اس کا تخلیقی اظہار بھی۔اچھی بات یہ ہے کہ ہر سطح پر وہ ایک سادہ ومخلص انسان کی طرح پیش آتے ہیں۔ان کے خلوص وسادگی میں ایک ان سنی واخلاقی کشش ہے جو بڑی سادگی کے ساتھ ان کی غزلوں میں

در آتی ہے۔ ان کی انفرادیت میں بھی انسانی تہذیب کے تخلیقی اظہار نظر آتے ہیں جو ان کو بڑا بناتے ہیں۔ قمر رئیس نے ان تضادات کو بھی بڑے معنی خیز پیرائے میں پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ان کے باطن تجربات میں بھی انسانی تہذیب کے بارے میں ان کا عرفان صاف جھلکتا ہے اور بظاہر جو تجربات ان کے سماجی اور اخلاقی نظریات سے متصادم نظر آتے ہیں وہ ان کی انسان دوستی کے ہمہ گیر شعور سے ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ نئی غزل کے بہتر اشعار میں بھی اسی صحت مند رویے کی کارفرمائی ملتی ہے۔'' (ص211)

اور یہ جملہ بھی دیکھیے

> ''حالی نے غزل میں وجدان وتخیل کی لطیف آمیزش سے ایک نئے احساسِ جمال کو جنم دیا جس کے پیچھے ان کی تعقل پسندی اور انسان دوستی کا ہمہ گیر احساس کارفرما تھا۔ غزل کا یہ انداز تخیل رنگینی اور مبالغہ آرائی سے پاک ہونے کے باوجود اپنی دھیمی دھیمی آنچ سے دل کو چھوتا ہے۔''(ص212)

اور مضمون ان جملوں پر ختم ہوتا ہے:

> ''میرا مدعا یہ ثابت کرنا ہرگز نہیں ہے کہ نئی غزل کے سارے تخلیقی امکانات کا سلسلہ حالی سے ملتا ہے بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ اردو غزل میں جن تبدیلیوں کی داغ بیل حالی نے ڈالی تھی اور اپنی جرأت اور تخلیقی ذہانت سے جن پودوں کی آبیاری کی تھی، وہ نئی غزل کی صورت میں پروان چڑھ رہی ہیں اور برگ وبار لا رہے ہیں۔''(ص213)

حالی کی غزل گوئی پر کم لکھا گیا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مقدمہ میں انہوں نے سستی رومانیت اور مجہول عشقیہ روایت کی مخالفت کی جسے پوری غزل کی مخالفت سمجھا گیا لیکن بعض دورس نقادوں نے جن میں قمر رئیس کا بھی شمار ہے، حالی کی غزلوں میں صداقت، حقیقت اور سادگی، تبدیلی کے وہ عناصر تلاش کر لیے جس پر دیکھا جائے تو نئے ادب اور نئی شاعری کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ قمر رئیس کا یہ مضمون ان معنوں میں اہمیت کا حامل ہے۔

قارئین و ناقدین کا کم و بیش یہی رویہ اقبالؔ کے ساتھ رہا ہے کہ ان کی اسلامی فکر کی شاعری اس قدر حاوی رہی کہ اکثر عقیدت مندوں (جن میں بعض نقاد بھی شامل ہیں) نے شاعرِ اسلام یا شاعرِ مسلمان اور کسی نے شاعرِ پاکستان تک کہہ کر اس بے مثال اور لامحدود شاعر کو محدود تر کر دیا۔ ان کی قومی، وطنی اور انسانی شاعری پر توجہ نہیں دی گئی یا کم دی گئی۔ ان کی شاعری کا یہ قابلِ قدر حصہ بھی پورے طور پر توجہ کرنے، تجزیہ و محاسبہ کرنے کے لائق ہے۔ قمر رئیس نے یہاں بھی انفرادیت دکھائی اور اقبالؔ کے تصورِ وطن و آزادی پر ایک عمدہ مضمون لکھا۔ ان کے ترقی پسند اور انسان دوست ذہن نے اس تصور کو بھی بنی نوع انسان سے جوڑ کر دیکھا حالانکہ ان کے سامنے یہ مشکل تھی جسے قمر رئیس نے بڑے سلیقہ سے پیش کیا اور اعتراف کیا کہ جس شاعر کے یہاں فکر و خیال کے مختلف دھارے موجِ تہہ نشیں کے طور پر کام کر رہے ہوں تو بقول مصنف ''شعور و احساس کے اس مضطرب اور متحرک دھارے میں ان اجزا و عناصر کو الگ کرنا جن کا تعلق اس کی وطن دوستی اور آزادی کے جذبات اور تصورات سے ہو، آسان نہیں۔'' لیکن قمر رئیس کی اپنی نظریاتی وحدت اور اقبالؔ کے مختلف خیالات کی کثرت میں وحدت بہر حال بنی نوع انسان سے رشتے استوار کرتی ہے اس لیے قمر رئیس پوری بے باکی و آزادی سے یہ کہنے میں تامل نہیں کرتے ''اقبالؔ کی شخصیت اور نظامِ فکر کے نشو و نما میں جو قوتیں ایک مستقل جذبۂ محرک کے طور پر کام رہی ہیں ان میں سب سے اہم بنی نوع انسان سے ان کی محبت، اس کے مسائل سے گہری دلچسپی اور اس کے مقصد سے مستقل وابستگی ہے۔'' اپنے اس خیال کی مضبوتی کے لیے وہ اس ضمن میں اقبالؔ کی آرا بھی پیش کرتے ہیں اور اشعار بھی اور اسی کی بنیاد پر ہی وہ وطن اور آزادی کے ٹھوس تصورات قائم کرتے ہیں اور اسی مقام پر وہ دیگر قومی و وطنی شاعروں سے الگ ہو جاتے ہیں۔ قمر رئیس کے یہ خیالات بھی غور طلب ہیں:

> ''انسان کی ذات سے یہ تعلق وطن اور آزادی کے بارے میں ان کے رویے پر بھی اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ دراصل یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اقبال اور ان کے بعض معاصرین مثلاً چکبستؔ، محرومؔ اور جوشؔ جیسے شعرا کی حُب الوطنی اور مسلکِ آزادی کے درمیان ایک حدِ فاصل بن جاتا ہے۔''

یہ سنجیدہ نکتہ پورے مضمون میں پھیل جاتا ہے۔ان کی نظر میں اقبالؔ لحاتی موضوعات کے محرکات کو بھی پھیلا کر ایک انسانی وحدت میں ڈھال دیتے ہیں۔اقبالؔ اپنی گہری قوتِ فکر کے ذریعہ وجودِ آدم اور اس کے تعلق خاطر، عشق بلا خیز کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کی وطنیت، قومیت کو سمجھ پانا اتنا آسان نہیں۔وہ صرف ''سارے جہاں سے اچھا......'' تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ساری دنیا کے انسانوں کو ایک رشتہ میں بندھا ہوا دیکھتے ہیں۔1920ء میں اقبالؔ اپنے والد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''جو آدمی انسانی زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہے اسے معلوم ہے کہ تمام بنی نوع انسان آپس میں عزیز رشتے دار ہیں کیونکہ حیاتِ انسانی کی جڑ ایک ہے۔''

انہوں نے ملک وملت کی خاطر سیاست میں وقتی دلچسپی دکھائی لیکن اصلاً تو وہ فلسفی شاعر تھے۔وقتی سیاست انہیں کبھی موافق نہ آئی اسی لیے اکثر کو اس میں تضاد نظر آیا لیکن سچ یہی ہے کہ وہ سیاست کے انسان نہ تھے۔فکر وفلسفہ کے شاعر تھے اور ان کی اس نوع کی عمیق و بلند شاعری کو سستی و سطحی سیاست کیا سمجھ پاتی۔کیا ان اشعار کو سستی قسم کی جذباتیت قبول کر سکتی ہے:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خاک سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مسکن
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

اقبالؔ کی دلسوزی، دردمندی اور انسان دوستی کے اتنے ابعاد ہیں، اتنی جہات کہ ان کو ایک مضمون میں سمیٹ پانا ممکن نہیں لیکن قمر رئیس نے اشاروں اشاروں میں تمام جہات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی کہ جو وطن اور آزادئ وطن کا پڑھا لکھا منصوبہ نہیں رکھتے وہ آزادی کی مٹی پلید کر دیتے ہیں۔اقبالؔ نے بہت پہلے ہی اشعار میں کہا تھا:

گو فکر خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادئ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

......

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

ان کی یہی فکر انہیں اسلامی مفکر ہونے اور الحاد پر اعتراض کرنے کے باوجود اشتراکی نظریہ کے بھی قریب لاتی ہے۔ وہ مارکسؔ اور لیننؔ پر نظمیں کہتے ہیں اور لیننؔ کو تو خدا کے حضور میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ مضمون کے آخر میں قمر رئیس کا مارکسی ذہن، اشتراکیت کے تئیں اقبالؔ کی مشروط پسندیدگی اور غیر محدود انسان دوستی کے امتزاج پر یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے:

> ''منشی پریم چند کی طرح اقبالؔ نے بھی اگرچہ مارکسزم کے مادی فلسفے کا باضابطہ مطالعہ کیا تھا اور نہ ہی اس پر ایمان لائے تھے لیکن دونوں کی دردمندی اور تصور پرستی نے ایک مثالی معاشرے کا جو خواب دیکھا تھا اور انسان دوستی کی جو قدریں تھیں وہ اشتراکی معاشرہ اور اشتراکی انسان دوستی کی قدروں سے بہت قریب تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ دین و مذہب سے بے تعلقی کے باوجود اس معاشرے میں انسان کے لیے آزادی، فراغت، احساس، مساوات اور اعتماد کی زندگی بسر کرنے کے امکانات موجود ہیں۔''

یہ مضمون ایک ترقی پسند ذہن کا تجزیہ تو ہے، ساتھ ہی تحسین آمیز جذبہ بھی اور پھیلے ہوئے اقبالؔ کو سمیٹنے والوں کے لیے ایک تازیانہ بھی کہ فکر و خیال اور جمال و جلال کے تعلق سے قمر رئیس اپنی تمام تر مروتوں کے باوجود ایک پختہ و بالیدہ نقاد تھے۔ جوشؔ، فیضؔ اور دیگر ترقی پسند شعرا کا معاملہ تو ایک طرح سے قبیلہ جاتی تھا۔ انجمن اور تحریک کا تھا لیکن یہاں بھی قمر رئیس تحریک کے مجاہد کم ادب کے ناقد زیادہ نظر آتے ہیں۔ ایک ایماندار نقاد اور ایک ایماندارانہ تجزیہ جس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن شک نہیں کیا جا سکتا۔

جوشؔ پر لکھتے وقت عموماً نقادوں کی نظریں ان کے شباب اور انقلاب سے آگے نہیں جاتیں۔ جوشؔ کی فطرت نگاری کو بھی وسعتِ نظر کے ساتھ نہیں دیکھا گیا لیکن قمر رئیس، جوشؔ کی عملی شعریات پر گفتگو کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ جسارت اس لیے کہ نظیرؔ اور انیسؔ کی طرح جوشؔ

کی شعریات ولفظیات کے اتنے پہلو ہیں کہ ان کی وحدت کی تلاش معمولی کام نہیں۔ خود عملی شعریات کی اصطلاح غور طلب ہے اور کسی کی نظر میں بحث طلب بھی ہوسکتی ہے لیکن قمر رئیس کا خیال ہے کہ ''ہر بڑے شاعر کی اپنی شعریات ہوتی ہے جو زندگی، حسن اور آرٹ کے بارے میں اس کی شخصیت کی مخصوص افتاد ہوتی ہے۔'' غور کیجیے کہ قمر رئیس نے حسن اور آرٹ کو کس قدر اہمیت دی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کی ترجیحات میں زندگی اول مقام پر ہے۔ کچھ جدید ناقد آرٹ اور حسن کو ترجیح دیتے ہیں اس میں کوئی حرج تو نہیں لیکن زندگی اور معاشرہ کو پورے طور پر نظر انداز کر جانے کا معصومانہ عمل ان کے فکر ونظر کو کمزور کر دیتا ہے اس لیے کہ یہ عناصر مجرد نہیں ہوتے ان سب کا تعلق زندگی سے ہے، انسان سے ہے، انسانی معاشرہ سے ہے، اس تضاد اور تصادم سے ہے جس پر تغیر کا دارومدار ہے اور جسے مارکسیوں نے جدلیاتی مادیت کہا ہے۔ اس سیاق وسباق میں قمر رئیس، میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ کی مثال دیتے ہوئے جوشؔ تک آتے ہیں اور ان کی شخصیت وشاعری بہ الفاظ دیگر شعریات کی جڑیں اس عہد کی سماجی وتہذیبی جدلیت میں تلاش کرتے ہیں۔ ترقی پسند نقادوں کی طرح قمر رئیس بھی لکھنؤ یا اودھ کے جاگیردارانہ نظام کا ذکر کرتے ہیں لیکن قمر رئیس ایک قدم آگے بڑھ کر عوام تک پہنچتے ہیں اور صاف کہتے ہیں ''شعروشاعری کی نزاکتوں اور زبان و بیان کی باریکیوں کا شعور خواص وعام دونوں رکھتے تھے۔'' وہ جوشؔ کا یہ شعر بھی پیش کرتے ہیں:

لکھنؤ کی آج بھی رنگ رلیاں دل میں ہیں
جو کبھی زیرِ قدم تھیں اب وہ گلیاں دل میں ہیں

رنگ رلیاں اور گلیاں دونوں ہی طبقات کی نمائندگی کرتی ہیں اور قمر رئیس جوشؔ کی شعریات کی یہی اساس قرار دیتے ہیں اسی بنیادی نکتہ پر پورا مضمون پھیلا ہوا ہے۔ درمیان میں جوشؔ کی رومانیت، مجہولیت کے بجائے فعالیت اور یہ خیال کہ یہ فعالیت ہی انہیں قوت آفرینی، حوصلہ مندی اور توانائی کے قریب لے جاتی ہے۔ یہ جملے دیکھیے:

''توانا جذبات اور مثبت رویوں نے ان کی شخصیت وشاعری میں نکھار پیدا کر دیا ہے۔ یہی لب ولہجہ ان کی تمام تر شاعری میں احتجاج بن کر رونما ہوا جو ان کی شعریات میں قدرِ اول کا درجہ رکھتا ہے۔''

یہ جملے تو اور بھی غور طلب ہیں:

''سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر لکھی ان کی نظموں سے اگر احتجاج اور سرکشی کے عناصر کو منہا کر دیا جائے تو یہ شاعری کمھلائے ہوئے پودوں کا بے کیف گلدستہ بن جائے گی۔ وہ اس توانائی' جوش اور تاثیر سے محروم ہو جائے گی جس سے اس کے خالق کی شناخت ہوتی ہے۔''

یہ جملے اس لیے غور طلب ہیں کہ عموماً محدود وژن اور مخالف ذہن نقادوں نے اس نوع کی شاعری کو نعرہ بازی کہہ کر جی بھر کے برا بھلا کہا لیکن قمر رئیس جوشؔ کے انہیں اوصاف کو امتیاز اور شناخت کا درجہ دیتے ہیں کیونکہ ایک ترقی پسند نقاد کے طور پر وہ جانتے ہیں کہ احتجاج اور بغاوت انسانی مزاج اور سماج کے بڑے بڑے عناصر ہیں۔ دنیا کی ہر زبان کی بڑی شاعری میں احتجاج کے عناصر پائے گئے ہیں لیکن اردو شاعری کا تعیش پسندانہ مزاج فریاد کا عادی رہا ہے' للکار کا نہیں۔ سرگوشی کا عادی رہا ہے بلند آہنگی کا نہیں۔ اسی لیے ہمارے بزرگوں نے اپنی پسند و دفاع میں عشقیہ شاعری کی شعریات تو بنائی لیکن سماجی و خارجی اور انقلابی شاعری کی شعریات کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ اس لیے کہ وہ یہ نازک بات نہیں جان سکے کہ عشقیہ شاعری میں اگر سرگوشی وصف ہے تو احتجاجی شاعری میں بلند آہنگی اس کا وصف بن جاتی ہے۔ اسی لیے قمر رئیس پورے اعتماد سے کہتے ہیں کہ اگر جوشؔ کی شاعری سے یہ عناصر منہا کر دیے جائیں تو وہ باسی پھول کا گلدستہ بن جائے گی۔ ان خیالات کو ہمدردی اور سنجیدگی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قمر رئیس کا یہ جملہ کس قدر دعوتِ فکر دیتا ہے:

''بڑی شاعری کے لیے شعری وجدان اور زندگی کا ہمہ جہت عرفان دونوں کی توانائی اور گہرائی ناگزیر ہے۔''

زندگی کے ہمہ جہت عرفان میں احساس و اضطراب' احتجاج و انقلاب سبھی کچھ آ جاتے ہیں اور حساس و ذمہ دار شاعر کے تخلیقی وجدان کا لاشعوری حصہ بن جاتے ہیں۔ جوشؔ کی ان نظموں سے قطع نظر جس میں واقعی شور و غل ہے (اگرچہ کبھی کبھی زندگی میں شور و غل کی اہمیت بھی ہوتی ہے) لیکن ان نظموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس میں زندگی کا ہمہ جہت عرفان ہے جہاں صرف لکھنؤ

کی عیش پسندانہ محفلیں اورتہذیب کش راتیں نہیں ہیں بلکہ دن کے اجالے ہیں جس میں کھیت، باغ، چوپال، موسم، جنگل، خانقاہ، مولوی، کسان، مہاجن سبھی آ جاتے ہیں، نظیر اکبر آبادی کے علاوہ اتنے کثیر موضوعات کیا ہیں کسی شاعر کے پاس۔ جوش پر اعتراض کرنے والوں کو ایرانی و رومانی شعریات سے باہر نکل کران کی شعریات پر نظر رکھنا چاہیے جہاں پورا ہندوستان اور پورا انسان بول رہا ہے۔یہی قمر رئیس کے مضمون کا ثمرہ ہے، تجزیہ ہے اور نتیجہ بھی۔

جوش کے مقابلے فیض عموماً دھیمے لہجے کے شاعر مانے گئے غالباً اس لیے فیض مخالف نظریہ میں بھی پسند کیے گئے حالانکہ کچھ کٹّر نقادوں نے انہیں بھی جان بوجھ کر تیسرے یا چوتھے درجے کا شاعر کہا۔فیض کی غزلوں پر لکھا گیا قمر رئیس کا مضمون ایک طرح سے شمس الرحمٰن فاروقی کے ایک مضمون کا جواب ہے جس کا ذکر یہاں ضروری نہیں لیکن اس مضمون کا ذکر ضرور کروں گا جس میں فیض کی زندانی شاعری پر گفتگو کی ہے اور اسے اجتماعی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ شعروادب کا اجتماعی تناظر اور اس کی تلاش کی کوشش اگر فاروقی کے قلم سے ہوتی تو احتشام حسین سے لے کر قمر رئیس تک پھیلے ہوئے تنقیدی سفر میں انہیں بھی کوئی گھاس نہ ڈالتا (یہ زبان فاروقی نے فیض کے لیے استعمال کی ہے) اسی لیے وہ الگ ہو گئے اور انہیں ہونا ہی تھا اسی لیے الگاؤ کے لیے وہ کیا کیا اور کیسے کیسے گھاؤ لگائے گئے۔ یہاں اس تفصیل میں جانے کا وقت نہیں اس لیے راست طور پر قمر رئیس کی فیض شناسی پر گفتگو کو آگے بڑھاتا ہوں۔

فیض بھر پور ترقی پسند تھے، اشتراکی تھے، اچھا خاصا وقت جیل میں بھی گزارا۔اس قیدو بند میں شاعری بھی کی اور اس روایت کو دہرایا جس پر غالب، حسرت وغیرہ چل چکے تھے۔فیض دونوں سے متاثر تھے لیکن فیض ان دونوں بالخصوص حسرت سے نہ صرف مختلف تھے بلکہ بہت آگے بھی تھے اس لیے کہ ترقی پسند اور اشتراکی ہونے کی وجہ سے وہ شعروادب کا ایک بڑا انسانی اور عالمی تصور رکھتے تھے۔ایک ایسا تصور بقول قمر رئیس ”جس کی رو سے فنکار بیک وقت اپنی ذات، اپنی قوم اور اپنے عصر کی آواز بن جاتا ہے۔“ اور یہ آواز جب زنداں سے نکل کر باہر آتی ہے تو اس کی تاثیر و تخصیص کا دائرہ وسیع سے وسیع تر اور پُر اثر ہو جاتا ہے۔نظریۂ فلسفہ بن جاتا ہے۔ جذبۂ جوش زیادہ پائیدار اور معتبر غرض کہ دونوں کے امتزاج سے سنجیدہ انقلابی شاعری کا بگل بج اٹھتا ہے۔

یہاں بھی قمر رئیس نے لکھا ہے کہ ''قید و بند کا یہ تجزیہ فیضؔ کی زندگی اور شاعری دونوں کے لیے انقلابی جہات کا حامل بن گیا۔'' حالانکہ قمر رئیس یہ غور طلب گفتگو بھی کر جاتے ہیں ''اس سے پہلے مجروحؔ، سردارؔ جعفری اور بعض دوسرے اور شاعر بھی سیاسی قیدی رہے ہیں اور قید خانوں میں انہوں نے شاعری بھی لیکن ان کی حبسیہ شاعری کے انداز و اسلوب میں ان کی سابقہ شاعری سے کسی واضح انحراف کے نشان نہیں ملتے جبکہ اس طویل قید کے تجربے نے فیضؔ کی شاعری کا رخ ہی بدل دیا۔'' کوئی چاہے تو اس پر بحث بھی کر سکتا لیکن مضمون کے اگلے حصہ میں فیضؔ کے اس رخِ شاعری پر تفصیلی گفتگو ملتی ہے، راول پنڈی سازش کیس۔ اخبارات کی سرخیاں، غداری کا الزام لیکن فیضؔ ایک طرف تو یہ کہتے رہے کہ:

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دُشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت

تو دوسری طرف یہ اظہار بھی کہ قید تنہائی کے ان ایام میں ان کی طبیعت میں غضب کی آمد اور جولانی تھی۔ قمر رئیس نے اس کیفیت کو معنی خیز انداز میں پیش کیا ہے:

''باہر کی روشنیاں گل ہوئیں، دریچے بند ہوئے تو اندر کے روشن دان کھل گئے اور ان کی باریک کرنوں میں تڑپتے ہوئے لاکھوں ذروں کی طرح فیضؔ جبر و تشدد کی آگ میں سلگتے ہوئے کروڑوں انسانوں کے چہرے دیکھنے لگے۔ اپنے وطن میں رہ کر جلا وطنی اور کربِ تنہائی کا یہ تجزیہ اتنا دور رس تھا کہ فیضؔ کے اعصابی وجود میں جذب ہو کر ایسا لگتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے اس کا ایک حصہ بن گیا۔'' (ص198)

فیضؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس شدید کربِ تنہائی اور حبسیہ اذیت کے باوجود امید و نشاط کا دامن نہیں چھوڑتے اور آنے والے گل و لالہ کے موسم کا انتظار کرتے ہیں، کہتے ہیں:

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

فیضؔ میں امید و نشاط میں جذب جو ایک محزونی کیفیت ہے، قمر رئیس اسے بھی پیش

کرتے ہیں جس سے شاعری میں کسک اور سوز وساز پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی کی ایک شام....' نثار میں تری گلیوں' بے مثال نظمیں ہیں جو جدید شاعری میں وطن پرستی' آزادی کا نوحہ بننے کے بجائے رجز بن جاتی ہیں۔ یہی فرق ہے فیضؔ اور دیگر شاعروں میں اور پھر مضمون زنداں سے نکل کر پھیل جاتا ہے۔ پوری دنیا کے اسیروں' مظلوموں کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے اور پھر فیضؔ کے قلم سے ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' ''درد آئے گا دبے پاؤں'' جیسی نظم وجود میں آتی ہے ہیں کہ ان کی نظموں میں بقول قمر رئیس:

''یہاں ان کی فکرِ آزادی' امن اور انصاف کی آفاقی تحریکوں سے پوری طرح ہمکنار دکھائی دیتی ہے۔ اسی لیے ان نظموں کے شفاف پیکروں اور استعاروں میں گہری تہہ داری اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔''

اور مضمون ان جملوں پر ختم ہوتا ہے:

''فیضؔ کے دور اسیری کی احتجاجی شاعری اسی بحران کا مرقع دکھائی دیتی ہے لیکن اس آشوب سے نجات پانے کی کوشش میں حکمراں ٹولے عوام دوست دانشوروں کو فرضی سازشوں میں ملوث کر رہے تھے۔ فیضؔ بھی شکار ہوئے لیکن اگر وہ کربِ اسیری کا زہر نہ پیتے' پھانسی کے سائے میں چار سال نہ جیتے تو شاید اردو اور عالمی ادب اس عہدِ ستم کی ایسی جانگداز روداد سے خالی رہتا۔''

فیضؔ کی زندانی شاعری پر اس سے قبل اور بعد میں مضامین لکھے گئے لیکن اس وسعت اور گہرائی کے ساتھ جانچے نہیں گئے جو گہرائی قمر رئیس کے مضمون میں ملتی ہے۔ اس لیے کہ خود قمر رئیس کا مارکسی واشتراکی ذہن ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ یہ تحقیق وتنقید' ناقد اور خالق کے مابین وہ انجانے رشتے ہیں جہاں تنقید خود تخلیق بن جایا کرتی ہے۔

ممتاز ترقی پسند شاعر علی سردارؔ جعفری نے زندانی شاعری اور احتجاجی شاعری کی ہے لیکن عام خیال ہے کہ سردارؔ کے یہاں اس نوع کی شاعری میں وہ سوز نہیں ہے جو فیضؔ کا حصہ ہے۔ بڑی حد تک یہ درست بھی ہے لیکن سردارؔ کا اپنا ایک مخصوص نہ صرف لہجہ ہے بلکہ نظریہ بھی ہے۔ زندانی

شاعری سے متعلق وہ 'پتھر کی دیوار' کے دیباچہ میں صاف طور پر لکھتے ہیں:

''پتھر کی دیوار' میری جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے۔

میری شاعری وقتی ہے۔ ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے۔ ہم تو آج ہی کا راگ چھیڑ سکتے ہیں۔ میں شاعری میں آج کی حقیقت یا روحِ عصر کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ میں اپنی شاعری کا نالۂ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی نہیں بنا سکا ہوں میں اسے بیک وقت ستار کا نغمہ اور تلوار کی جھنکار بنانا چاہتا ہوں۔

میں اپنے نالہ و بکا' آہ وفریاد سے اور غموں سے بھری دنیا کو زیادہ غمگین نہیں بنانا چاہتا۔ میرے لیے زمین سے زیادہ حسین' انسان سے زیادہ پر وقار اور مستقبل سے زیادہ تابناک کوئی چیز نہیں ہے۔ ادب اور آرٹ کی سب سے بڑی جمالیاتی قدریں انہیں سے پیدا ہوتی ہیں۔''

دیکھنا یہ ہے کہ قمر رئیس نے سردار جعفری کی شاعری کو کن زاویوں سے دیکھا۔ اپنے مونوگراف میں سردار کی شاعری سے متعلق پہلا مضمون ہی ہے 'انقلابی فکر کا آہنگ'۔ سردار نے بھی کہا تھا کہ انقلاب کا اپنا ایک آہنگ ہوتا ہے۔ احتجاج' انقلاب دنیا کی شاعری کے بڑے موضوعات رہے ہیں۔ ہم نے ان کی طرف کم دیکھا' غزلیہ و عشقیہ شاعری کی طرف زیادہ متوجہ رہے۔ ایک مخصوص تہذیبی نظام نے اس کو مذموم نگاہوں ہی سے دیکھا اور یہ سلسلہ جدید دور تک قائم رہا کہ وہ اس نوع کی شاعری کو محض نعرہ بازی کی شاعری کہتے رہے لیکن سردار جعفری انہیں نعروں سے انقلابی ترانے خلق کرتے رہے۔ نئی دنیا کو سلام کرتے رہے۔ ایشیا کو جگاتے رہے۔ ابتداً اقبال و جوش سے متاثر ہوئے لیکن مارکسی مطالعہ اور انسانی مشاہدہ نے جلد ہی اپنی آواز پالی اور وہ کہہ اٹھے:

رقص کر رہے روحِ آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات
......
اڑ رہا ہے ظلم واستبداد کے چہرے سے رنگ

چھوٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ

......

ہل چکا ہے تخت شاہی گر چلا ہے سر سے تاج

ہر قدم پر ڈگمگایا جا رہا ہے سامراج

کچھ لوگ ایسی شاعری کو لمحاتی شاعری کہتے ہیں جس کا جواب تو سردارؔ نے دیا ہے لیکن قمر رئیس یہ کہتے ہیں:

''نظم کا محرک وقتی ہونے کے باوجود یہ تخلیق بنی نوع انسان کی آزادی کے جذبہ کی شاعرانہ حسن کے ساتھ ترسیل کرتی ہے۔''

قمر رئیس کا تنقیدی موقف اپنے مخصوص انسانی نظریہ بنی نوع کے حوالے سے بڑی آسانی سے لمحہ کو ہمیشگی میں اور فرد کو جمع میں دیکھ لیتا ہے۔اسی بنیاد پر وہ سردارؔ کو انقلابی اور عوامی شاعر کہتے ہیں کہ ان کی شاعری میں رومانی سے زیادہ انسانی اقدار نظر آتے ہیں لیکن خواب دیکھنے کا عمل (ایک خواب اور) انہیں انقلاب سے رومان تک یا رومان سے انقلاب تک پہنچا دیتا ہے غالباً اسی لیے احتشام حسینؔ نے سردارؔ پر جو مضمون لکھا ہے اس میں رومان سے انقلاب تک کے سفر کا جائزہ لیا ہے۔یوں سردارؔ نے الگ سے بھرپور رومانی نظمیں بھی کہی ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان پر کم توجہ دی گئی ہے۔ یہاں قمر رئیس کا خیال ہے کہ سردارؔ ایک مفکر اور دانشور بھی اور مارکسی نقاد بھی ۔ وہ حیات اور کائنات پر بھی نظر رکھتے ہیں اس لیے ان کی ہر قسم کی شاعری میں کائنات کی سلامتی اور انسانی وقار دیکھنے کو ملتا ہے۔نئی دنیا کو سلام کے تعلق سے قمر رئیس کہتے ہیں:

''ساری کائنات کا معنی خیز تحرک نظم کے مکالموں کو بھی متحرک رکھتا ہے اور اس طرح حیات و کائنات کی سلامتی اور دلکشی کے تئیں شاعر کا وژن نظم کے فکری اور تمثیلی پیکر میں رچا بسا محسوس ہوتا ہے۔''

(علی سردار جعفری' مونوگراف' ص45)

یہی نہیں وہ آگے کی شاعری اور ہر نوع کی عوامی' احتجاجی اور انقلابی شاعری کے ضمن میں پورے اعتماد سے کہتے ہیں:

''ایسا نہیں ہے کہ یہ نظمیں شاعرانہ حسن سے عاری ہوں۔ سردارؔ جعفری کی نظریاتی ادعائین اور مبالغہ آمیز تحسین و آفریں کے باوجود ان نظموں میں ان کی تخلیقی ذہانت اور تخلیقی جودت کا جلوہ دیکھا جاسکتا ہے۔ اس سے اردو شاعری کے کینوس پر وسیع تر انسانی سروکاروں اور انسانی رشتوں کی تخم کاری ہوئی ہے۔ جذبہ و احساس کے نئے رنگ ابھرے ہیں۔''

قمر رئیس قدم قدم پر بیانیہ کی سادگی، بے ساختگی، استعارہ سازی اور بالخصوص خاموشی کا ذکر کرتے ہیں۔ سردارؔ جعفری کی بلند آہنگی پر تو اکثر اعتراضات ہوئے ہیں، ایسے معترض کو ان کی نظم 'خاموش' ضرور پڑھنا چاہیے۔ نظم کا اقتباس دیکھیے :

خامشی خواب بھی ہے
درد کا احساس بھی ہے
روح کے تار پہ مضراب کا رقص
شوق کا نغمہ بے مدت صدا

جدید نقادوں نے تنہائی اور خاموشی کو عدم وجودیت کے فلسفہ سے جوڑ کر دیکھا ہے اور طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں لیکن ایک ترقی پسند شاعر بے صوت و صدا خاموشی میں بھی نغمۂ شوق سُن لیتا ہے۔

ہر چند کے سردارؔ کی شاعری کے کئی ادوار ہیں جن کا تفصیلی جائزہ اس مقالہ میں ممکن نہیں لیکن اکثر ترقی پسند ناقدین بھی بعد کے دور میں سردارؔ جعفری کے ڈکشن کو بدلا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ قمر رئیس بھی ان کے ہم نوا لکھتے ہیں:

''جعفری نے اپنے ڈکشن اور سروکاروں کا رینج (Range) نت نئے تجربوں کی آنچ سے وسیع تر کیا اور اس عمل میں اپنی انفرادیت کو تحلیل ہونے کا خطرہ بھی مول لیا۔
الغرض سردارؔ جعفری نے اپنے نامور معاصرین کے ہم رکاب ہوکر بیسویں صدی کی اردو شاعری کو نئی منزلوں اور نئے افقوں سے ہمکنار کرنے کا

منصب ادا کیا۔‘‘

سردارؔ جعفری اور قمر رئیس دونوں انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ تھے۔ایک وقت ایسا بھی تھا کہ سردارؔ انجمن کے صدر تھے اور قمر رئیس جنرل سکریٹری۔ اتنی نظریاتی اور تنظیمی قربتوں کے باوجود قمر رئیس کا تنقیدی رویہ معروضی اور غیر جذباتی رہتا ہے اور وہ Detach ہو کر تجزیہ کرتے ہیں جو ایک ایماندار تنقید کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔کم وبیش یہی سورت کیفی اعظمی کے تخلیقی سفر کی تلاشِ نو اور تنقید نو کا بھی ہے۔وہ کیفی پر ایک تفصیلی مضمون بعنوان ’’کیفی اعظمی کی تخلیقی فکر کا سفر‘‘ رقم کرتے ہیں۔عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ قمر رئیس تخلیق سے پہلے تخلیقی فکر کو تلاش کرتے ہیں۔

مضمون کی ابتدا گورکی کے ایک مضمون سے ہوتی ہے۔گورکی نے اسکول یا دانش گاہ سے یا کتاب سے کسب علم نہیں کیا تھا۔کیفی بھی مدرسے تک گئے۔گھر سے ہٹائے گئے۔ مدرسہ سلطان المدارس سے نکالے گئے لیکن جس طرح گورکی نے روس کے طبقاتی سماج کی گھناؤنی تصویروں کو قریب سے دیکھا اور خود بھی اس کا شکار ہوا اس سے اس کا سماجی شعور اور انقلابی حسیّت کی تشکیل ہوئی۔کیفی کے بارے میں قمر رئیس لکھتے ہیں؛

> ’’کیفی اعظمی کی زندگی اور شاعری پر جب میں نظر ڈالتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے شعور کی تعمیر و تربیت بھی جبر و بیداد کے کم وبیش ایسے ہی ماحول میں ہوئی وہ بھی اپنے گردوپیش کے انسانوں کے دکھ درد اور محرومیوں میں شریک رہے۔ان کے دل میں ان گھناؤنے حالات کے خلاف نفرت کی بجلیاں کوندنے لگیں۔وہ بھی ان ہی نتائج تک پہنچے جن تک گورکی پہنچا تھا اور انہوں نے ہی باغیوں کے ہراول دستہ میں اپنی زندگی مجاہدانہ شان سے گذار دی۔‘‘ (تعبیر وتحلیل‘ ص225)

ایک بہت بڑے فنکار کیفی کی مماثلت کچھ عجیب ضرور لگتی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ زندگی خود ایک کھلی کتاب ہوتی ہے۔حساس فنکار و شاعر جس قدر زندگی سے سیکھتا ہے کتابوں سے اتنا نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں اپنی اپنی بساطِ فکر کام کرتی رہتی ہے۔کیفی نوجوانی میں رومانی

ہوتے ہوئے اورغزل سے شاعری کی ابتدا کی لیکن جلد ہی ان کا رومان سرکشی اور بغاوت میں بدل گیا۔ لکھتے ہیں:

''کیفی اعظمی نے گزشتہ چالیس سال میں جو شاعری کی ہے وہ اسی متحرک' رومانیت اور باغی احساس وفکر کی شاعری ہے۔''(ص225)

کچھ گاؤں دیہات کے واقعات' سلطان المدارس لکھنؤ کے سرکش حالات' انگارے کی اشاعت اور خود کیفی کی افتاد طبیعت اور پھر اشتراکیت' کانپور سے بمبئی کا سفر ساتھ ہی تخلیقی سفر اور سجاد ظہیر کا یہ بیان ''اردو شاعری میں ایک نیا پھول کھلا ہے' سرخ پھول اور پھر یہ سرخی انہیں لے گئی محنت کش عوام تک'' جہاں وہ ایسی تمام تحریکوں سے جڑ گئے جو انسانی تاریخ میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ ان وابستگیوں نے کیفی کے ذہن اور وژن کو روشن تر کیا۔ قمر رئیس لکھتے ہیں:

''حق و باطل' بربریت اور انسانیت کی اس جنگ میں کیفی بھی ایک سپاہی تھے اور قلم سے جہاد کر رہے تھے۔ ان نظموں کے احتجاجی آہنگ میں اس جنگ کے ٹینکوں اور توپوں کی گڑگڑاہٹ اور اس کے شعلوں کی گرمی اور لپک محسوس ہوتی ہے۔ اس نے کیفی کے سیاسی اور طبقاتی شعور کو زیادہ تیکھا اور توانا بنا دیا اور ان کی انقلابی فکر کو نئی گہرائیوں سے آشنا کیا۔''(ص229)

اور یہ خوبصورت بامعنی جملے بھی دیکھیے:

''عشق میں ناکامی انہیں شکست و مایوسی اور کلیت کے ایسے اندھیروں میں لے جاسکتی تھی جہاں سے وہ کبھی واپس نہ آتے لیکن دکھی انسانوں کی محبت اور محنت کش عوام کی جنگِ آزادی سے احساسِ یگانگت Identification نے انہیں غموں سے کام لینے کا ہنر سکھا دیا اور ان کی معصومیت کو حزنیت سے پاک کر کے ایک ارتقائی صورت دی۔''(ص229)

انہیں بنیادوں پر کیفی کی جوان' جوشیلی' جذباتی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں محض فکر و خیال کی دبازت نہیں' گاؤں دیہات کی ثقافت بھی ہے۔ دل و دماغ کی حرارت بھی اور کہیں کہیں اپنے بزرگوں اور سینئر شاعروں کے اثرات ہیں تو کہیں انحراف بھی۔ اس میں کیفی کا اپنا رنگ

ہے۔ایک نیا عزم اور یقین جو فیضؔ مجازؔ مخدومؔ سردارؔ وغیرہ کے درمیان ایک نئی آواز بن کر ابھرتا ہے۔کیفی نے محبوبہ کو عورت کے روپ میں دیکھا۔ایک نئی شان اور پہچان دی یہ کہہ کر ''اٹھ میری جان میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے'' ''جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے'' اور یہ مصرعے دیکھیے:

زندگی جہد میں ہے جبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
جنّت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ میری جان میرے ساتھ چلنا ہے تجھے

عورت کے وقار' کردار اور مرد کے شانہ بشانہ' ہم سفری اور ہم نظری سے بھرا زندگی کی جدوجہد کا یہ عمل' عورت سے متعلق ایسی بے مثال نظم پوری اردو شاعری میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔کیفی نے کچھ عرصہ قبل یہ بے مثال شعر کہا تھا:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

کیفی نے اپنی اس غیر معمولی نظم میں عورتوں کی عظمت کے ساتھ ساتھ مردوں کی حاکمیت پر جو تازیانے لگائے ہیں اور جو دل کی آواز خلق کی ہے اس سے یہ نظم نئے شعور و احساس کو جنم دیتی ہے تبھی تو قمر رئیس یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں:

''مردوں کی حاکمیت کے سماج میں عورت کو عیشِ نشاط کا وسیلہ بنانے کے لیے نہ صرف رسموں اور راسہوں کی زنجیروں میں جکڑا گیا ہے بلکہ اسے احساس نزاکت' احساس عظمت اور احساسِ محبت کا قیدی بھی بنایا گیا۔کیفی کے حقیقت پسندانہ شعور نے اس رواجی تصور یا Myth کو بڑے موثر ڈھنگ سے توڑ دیا ہے۔''

اس کے بعد 'آخر شب' اور 'سجدے' کا بھی ذکر ہے۔بعد کے دور کی شاعری میں پختگی و

بالیدگی ضرور ہے لیکن وہ جوش وولولہ نہیں ہے یا کم ہے جس کے لیے کیفی جانے جاتے ہیں تاہم اس نوع کی شاعری نے بھی ایک نئے کیفی کو پیش کیا حالانکہ قمر رئیس نے یہ بھی کہا ہے کہ کیفی نے کسی بھی دور میں اپنے عہد اور اپنے عوام کی آواز سے اپنی آواز کو الگ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بڑی حد تک درست ہے۔ مضمون کے آخر میں قمر رئیس کا یہ نکتہ غور طلب ہے:

''جن فنکاروں کی تخلیقی فکر کا سر چشمہ زندگی کی بنیادی حقیقتیں ہوں گی، جو اپنی دردمندی کے ہاتھوں اپنے عہد کے کرداروں، انسانوں کے دکھ درد سے جڑا ہوگا، اسے اپنے داخلی اور شخصی تجربات میں بھی اپنے عہد کے سوز وساز کی لرزشیں محسوس ہوں گی اور اس لیے فطری طور پر اس کی تخلیقات میں انفرادیت کا نقش مدھم ہوگا جو محض فنکار کی ذات کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے لیکن دوسری طرف اس کا فن، فکر کی وسعت، تجربہ کی گہرائی، تخیل کی توانائی اور اظہار بیان کی ایسی سحر کار سادگی سے منور ہوگا جو صرف زندگی کی گہرائیوں میں اترتے اور اس کے زہر کو پینے سے حاصل ہوتی ہے۔''

قمر رئیس نے مخدومؔ، اختر الایمانؔ، احمد فرازؔ، خورشید الاسلامؔ، ظفرؔ گورکھپوری اور دیگر شاعروں پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ مضمون کی طوالت کے پیش نظر تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ دو ایک جملوں میں اشارے کرتے چلنا بھی ضروری ہے۔ اختر الایمان کے بارے لکھتے ہیں:

''زندگی کے مظاہر ہوں یا ماضی اور مستقبل، اختر الایمان کا ذہنی رویہ بنیادی طور پر ایک تعقل پسند، حقیقت شعار دانشور کا رویہ ہے۔''

(اختر الایمان اور ماضی کی بازیافت)

احمد فرازؔ کے بارے میں ان کی رائے ہے:

''احمد فرازؔ کی آگہی اور ذہانت اپنے عہد کے نت نئے تقاضوں سے پوری طرح باخبر رہی ہے۔ انہوں نے ساری دنیا کے دبے کچلے انسانوں کی طرفداری کا عہد کیا ہے اور ستم کیش کوچہ میں مجاہدانہ بانکپن سے آگے بڑھتے ہوئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کی ہے۔'' (احمد فرازؔ کی نظم نگاری)

خورشید الاسلام کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خورشید صاحب کی غزلوں میں جو غیر رسمی' بے باک اور طرحدار لہجہ ہے وہ دوسروں کے یہاں نہیں تھا۔ ان کی انا پرستی اور قلندری دونوں نے باہمی اتفاق سے ٹھکانا بنالیا تھا۔''   (جادۂ مجاز میں حقیقت کا مکالمہ)

ظفرؔ گورکھپوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شاعری میں حقیقت پسندانہ رویے سے وفاداری کا دم بھرنے والوں میں ظفرؔ گورکھپوری کا نام بلاشبہ امتیاز رکھتا ہے۔''

(کرب آسودگی اور نشاط آگہی کا شاعر)

اسی طرح حسن عابد' پروین شعر' اقبال حیدر اور بعض نوجوان شعرا کے بارے میں بھی ان کی آرا ملاحظہ کیجیے تو آپ کو ایک مثبت رویہ' رجائی لہجہ اور امید وامکان کی کیفیت نظر آتی ہے۔ معاصر اردو غزل پر کتاب ترتیب دیتے ہوئے انہوں نے پُر امید رویوں سے لکھا:

''ترقی پسندی اور جدیدیت کے انحطاط کے بعد بھی اردو غزل میں احساس وشعور کے نئے پیکر ابھرے ہیں۔ اظہار اور لہجہ کے تازہ تر امکانات تلاش کیے جا رہے ہیں۔ لفظیات کی حدیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ سورج' سایہ' پتھر' پانی' ہوا' بے چہرگی' تنہائی جیسے رموز وعلائم اب کلیشے لگتے ہیں۔ یہ عہد' مابعد جدیدیت کا عہد کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید احمد' ڈاکٹر شافع قدوائی اور فرحت احساس نے اپنے مضامین میں جدید تر غزل کے اسالیب پر دقتِ نظر سے غور کیا ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے عہد حاضر کی غزل میں بدلتی ہوئی زندگی کی آویزشوں اور اقدار کے نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔''

ان ناموں کو گنانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ قمر رئیس کا ذہن یا پرواز صرف ترقی پسند شاعروں تک محدود نہیں بلکہ قدیم وجدید شعرا بھی تھی۔ وہ پوری دیانت داری سے ان سب کو زندگی کی کروٹ لیتی ہوئی حقیقتوں اور اس کے پیچھے زخم وسرد وگرم کے تناظر میں جانچتے پرکھتے ہیں' اسی

لیےان کی تنقید کا فلک اور سیاق بڑا اور اونچا ہے۔ غالباً اسی لیے ممتاز ترقی پسند ناقد سید محمد عقیل، قمر رئیس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان کی تنقید اپنے موضوع میں سچ تلاش کرتی ہے۔ وہ اپنے موضوع کے اسیر نہیں ہوتے بلکہ ہر وقت توازن کا لحاظ رکھتے ہیں اور صحیح ناقدانہ تجزیہ کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر قمر رئیس کی تحریروں میں عقلیت اور ارضیت کی تجزیب، فکر و نظر کے دائرے بنائے رہتی ہے۔ یہی سوچ اور طرزِ تنقید قمر رئیس کا سرمایۂ نقد ہے۔'' (ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ)

......

پروفیسر علی احمد فاطمی، شعبہ اُردو، الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:99-115
Prof. Shahzad Anjum, Lisani aur Funni Hunarmandi ka Bakamal Namuna Faiyyaz Rifat ka Novel 'Banaras wali Gali'

شہزاد انجم

لِسانی اور فنی ہُنر مندی کا باکمال نمونہ
فیاض رفعت کا ناول ’’بنارس والی گلی‘‘

اُردو کے علمی و ادبی حلقے میں فیاض رفعت کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔ اُن کے افسانوں کے تین مجموعے ’’نئے عہد کی سوغات‘‘، ’’میرے حصّے کا زہر‘‘ اور ’’جہانِ دگر‘‘ شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ وہ ایک افسانہ نگار کے طور پر منفرد شناخت رکھتے ہیں۔

ناول ’’بنارس والی گلی‘‘ فیاض رفعت کی تخلیقی جودت کا بے مثال نمونہ ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں اُردو میں کئی اہم ناول شائع ہوئے، اُن میں لِسانی اور فنّی ہنر مندی کی سطح پر فیاض رفعت کا ناول ’’بنارس والی گلی‘‘ بھی نمایاں ہے۔

تخلیقی فن پارہ ’’بنارس والی گلی‘‘ کے مطالعے کے بعد کئی سوالات ذہن میں کوندتے ہیں۔ کیا یہ محض ایک طوائف کی داستان ہے؟ کیا یہ ایک سوانحی ناول ہے، جس کا مرکزی کردار بادشاہ خاں خود ناول نگار ہے؟ کیا یہ ناول اپنے فلسفیانہ روّیوں کی وجہ سے منفرد ہے؟ کیا یہ ناول اپنی فطری نثر اور پُر قوت اظہار کی وجہ سے جانا اور پہچانا جائے گا؟ کیا اس ناول کے متعدد کردار ایسے گہرے نقش قائم کرتے ہیں جن کی مثالیں اب ذرا کم ملتی ہیں؟ کیا ناول نگار کے ذہن میں طوائف کی زندگی، اخلاقی ابتری اور رقص و موسیقی کو پیش کرنا بنیادی نکتہ تھا؟ یا پھر مصنف کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اپنی زبان کی طاقت اور انداز بیان سے اِس ناول کو عروج بخشتا ہے۔ آپ یقین کیجئے اس ناول نے مجھے ابتدا سے آخر تک بہت پریشان کیا ہے۔ جب میں نے اس ناول کو پڑھنا شروع کیا تو پہلے ہی صفحے پر میری حیرانی کی انتہا نہیں رہی جب میں نے یہ پیراگراف پڑھا:

''اُس دن براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی چھ منزلہ عمارت کے پہلے مالے پر اُسے اپنے روبرو دیکھ کر حیرت سے میں بت بنا رہ گیا۔ چہرہ جانا پہچانا تھا۔ برسوں کی دُھند نے شناخت کو اِک ذرا مشکل بنا دیا تھا۔ سانولی سلونی رنگت والی مضبوط بدن کی عورت خاصی پرکشش تھی۔ گو جسم فربہی کی طرف مائل تھا، مگر قوسوں کے نمایاں ہوجانے کی بنا پر وہ کمان پر چڑھا ہوا ایسا تیر تھی جو بڑے بڑوں کی ریاضت کو آج بھی خاک میں ملا سکتی تھی۔ میز پر سجے گلدان کے باسی پھولوں میں خوشبو باقی تھی۔ اپنی دُھواں دُھواں آنکھوں سے وہ مجھے حیرت سے تکا کی۔ ماضی کی راکھ کے الاؤ میں دبی چنگاریاں جگنوؤں کی طرح روشن ہوگئیں اور ایک پوری دنیا.... پوری کائنات میری آنکھوں کی محرابوں پر انگڑائی لے کر جاگ اُٹھی۔ بیتے وقت کا ایک ایک لمحہ اپنی تمام تر سرشاریوں کے ساتھ میرے تھکے ہوئے وجود کو سہلانے اور گدگدانے لگا کہ زندگی کی اس ہزار شیوہ داستان کا شہر یار بھی میں ہوں اور شہزاد بھی!'' (بنارس والی گلی — صفحہ نمبر 1)

ایسی منظر کشی، جزئیات نگاری، انداز بیان، فنّی ہنرمندی کے کمالات کہ میں اس کی نثر کے سحر میں کھو گیا۔ یہ سطریں پہلی ہی نظر میں قاری کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں مگر اس کے اگلے ہی پیرا گراف میں ناول ایک خاص تکنیک کے تحت ماضی کی طرف چلا جاتا ہے جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ:

''اس سے پہلے کہ ہم بنارس والی گلی تک آئیں، کہانی کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر یہ الف لیلوی داستان ادھوری ہی رہ جائے گی۔

بیس برس بیتے... میں علی گڑھ یونیورسٹی میں پارٹ ون کا طالب علم تھا...

(بنارس والی گلی صفحہ 2-1)

ناول کا آغاز علی گڑھ سے ہوتا ہے۔ مرکزی کردار اور راوی یعنی بادشاہ قصّہ کا آغاز کرتا ہے۔ والد انگریزوں کے زمانے کے تھانیدار، گھر میں ہر طرح کی فراغت، موج مستی، غیر نصابی مشاغل میں زیادہ دلچسپی، ہیکڑی اور دادا گیری، بے نکیل اونٹ اور جنگلی جانوروں کی طرح اِدھر

اُدھر منہ مارتے پھرنا، ماں کی بے پایاں محبت اور ممتا کے سائے میں پرورش و پرداخت۔ یہ تھے بادشاہ خاں جنھیں کالج کے زمانے میں ہی طوائف خانے کی طرف جانے کا چسکا لگ گیا، ایک دو گھونٹ پینے بھی لگے۔ طوائفوں میں جانا، رات رات بھر گانا سننا اُن کا معمول ہو گیا۔ کبھی اِس طوائف کے یہاں کبھی تو اُس طوائف کے یہاں جا دھمکے۔ کمال یہ ہے کہ ناول نگار نے اِن بیانات میں طوائفوں کی نفسیات، ان کے رسوم، رکھ رکھاؤ، ادب وآداب کا ایسا نقشہ کھینچا ہے، ایسی جزئیات نگاری اور منظر کشی کا جلوہ بکھیرا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ درمیان میں مختلف کردار بھی در آتے ہیں جو اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان ہی محفلوں میں بادشاہ خاں کی ملاقات نسرین اختر سے ہوتی ہے جو بادشاہ خاں کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ دراصل یہ ناول نسرین کی زندگی کا المیہ ہے۔ نسرین اختر اور بادشاہ خاں ناول کے مرکزی کردار ہیں۔ بادشاہ خاں کی زندگی کے مکمل کوائف کو ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ مگر ناول کی تہہ میں نسرین اختر کی حکمرانی ہے۔ بادشاہ خاں علی گڑھ سے دہلی، دہلی سے بمبئی اور پھر کلکتہ اور جھارکھنڈ بھی جاتا ہے۔ ناول نگار نے ان شہروں کی تہذیب و ثقافت، کرداروں کی نفسیات، شہروں کے تیزی سے بدلتے ہوئے رنگ، مٹتی قدریں، نو دولتیوں کی ذہنی کیفیت، سیاست، معاشرت، شخصیات اور کرداروں کے مرقعے بے حد چابکدستی، فنی مہارت اور بصیرت و بصارت سے پیش کیا ہے۔ ناول کو پڑھنے کے دوران ہر جا ناول نگار کی بصیرت، علمی و ادبی ذوق، فلسفیانہ واقفیت، تہذیب و ثقافت کے سچے ادراک اور وژن کا بھی اندازہ ہوتا ہے، مگر ناول کی بڑی خوبی فیاض رفعت کی زبان اور انداز بیان ہے۔ ہر موضوع اور جزئیات کی پیش کش میں بلا کا حُسن ہے۔ نسرین اختر کے یہاں جب بادشاہ خاں پہنچتے ہیں تو اُس طوائف خانے کا منظر ملاحظہ کیجیے:

> ''کمرہ کافی طویل و عریض تھا۔ سفید براق چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ سلیقے کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ موتیا، بیلا کے پھولوں کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی، سارنگی پر ایک بزرگ صورت آدمی بیٹھا سُر ملا رہا تھا۔ ہارمونیم طبلے پر دو مراثی بیٹھے ہوئے کوئی فلمی دُھن نکال رہے تھے۔ اُن کی آگے ایک شہابی رنگت والی عورت کسی بنی بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر

ایک خاص طرح کی معصومیت تھی۔ گو وہ مسکرا رہی تھی مگر اُس کی مسکراہٹ میں مونالیزا کا حزن وملال چھپا ہوا تھا۔ اُس کے پہلو سے لگی نو خیز، شوخ و شنگ، سنولائی رنگت کی لڑکی بیٹھی ہوئی بات بات پر ہنس رہی تھی۔ دو تین تماش بین بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک کو میں جانتا تھا۔ ذات کا کنجڑا تھا اور پھلوں کی منڈی میں اُس کا بڑا کاروبار تھا۔ اس کے علاوہ دو ادھیڑ عمر کے بنیے گاؤ تکیہ کا سہارا لیے آرام سے فروکش تھے۔ بعد میں پتہ چلا اُن میں ایک کا نام تاراچند ہے جو تالوں کی ایجنٹی کرتا ہے اور دوسرے مہاشے کیلاش جی ہیں جو رائل تھیٹر کے مالک ہیں اور رنڈیوں کے پرانے سرپرست بھی۔ صبح سے شام اور شام سے رات تک رنڈیوں کے بالا خانوں میں ڈیرا جمائے رہتے ہیں۔'' (بنارس والی گلی، ص، 15)

یہی فنکار کا حُسن ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے اور کردار حرکت و عمل میں آجاتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی تخلیق کار کو ملکہ حاصل ہے۔ چند الفاظ میں حُسن دو بالا ہو جاتا ہے یا پھر کرداروں کی کارکردگی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

بادشاہ خاں، نسرین اختر کی پہلی ہی نظر سے گھائل ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نسرین اختر نے کوئی جادو ٹونا کر دیا ہو۔ مگر نسرین اختر کا باپ بڑا ہی چلت پھرت والا انسان تھا۔ اُس نے بادشاہ خاں سے جو کہا وہ بھی ملاحظہ کیجیے:

''دیکھو بابو! تم ہمارے یہاں آتے ہو، خوش آمدید! سر آنکھوں پر۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا، گانا بجانا ہمارا پیشہ ہے۔ گھوڑا گھاس سے یاری کرے گا تو کھائے گا کیا۔ ہم تو رنڈی بھڑوے ہیں۔ ہمارا ایمان پیسہ ہے۔ ہم پیسے کے لیے خوار ہوتے ہیں۔ بازار میں لڑکیوں کو لیے بیٹھے ہیں۔ یہ تو نیلام گاہ ہے جہاں بولی لگتی ہے۔ جس کی بولی سب سے بڑی ہوتی ہے، گوہر مقصود اُسی کے ہاتھ آتا ہے۔ اب تم کس طرح سوچتے ہو تم جانو۔ چھوٹی اختر کی نتھ اترائی کی رسم ادا ہونی ہے۔ کلکتہ اور آگرہ کے چمڑے کے بیوپاری اچھی

بولی لگا رہے ہیں۔ایک طرح سے ہمارا بھی چمڑے کا.... کاروبار ہے۔
اگر تمھاری چھوٹی پر نظر ہے تو بسم اللہ۔انٹی گرم کردو، اختر تمھاری ہوجائے
گی۔ایک رات کی قیمت تمھارے لیے پانچ ہزار ہوگی۔ورنہ خیال چھوڑ
دو، یہ رنڈی کا کوٹھا ہے۔ یہاں عشق محبت کی داستانیں زیادہ دنوں تک
نہیں پھلتی پھولتیں۔'' (بنارس والی گلی — صفحہ نمبر 22)

نسرین اختر کے باپ مشتاق نے صاف طور پر بادشاہ خاں کو جتا دیا کہ یہ نیلام گاہ ہے جہاں بولی لگتی ہے، رنڈیاں عشق کے کوچے میں محبت کے راگ الاپیں تو بات نہیں بنے گی۔گرم جیب والوں کی جیبیں خالی کرانا اُن کا مذہب اور ایمان ہے، مگر بادشاہ خاں اور نسرین اختر تو عشق کے بخار میں تپ رہے تھے۔انھیں اِن باتوں سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ یہاں تو دونوں طرف برابر کی آگ لگی ہوئی تھی۔مگر حالات نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔نسرین بیگم کو اچانک خاموشی سے خفیہ مقام پر پہنچا دیا گیا۔وہ کہاں گئی، بقیہ زندگی کیسے بسر ہوئی، کن کن لوگوں سے واسطہ پڑا، زندگی کے سرد وگرم کو اس نے کیسے جھیلا، ان سب کا بیان کتاب کے آخری صفحات میں درج ہے۔ مگر بادشاہ خاں تو غضب کا انسان ہے، مزاج میں سیمابیت ہے، عشق کا دلدادہ ہے۔ ذہانت و ذکاوت، ہمت و جواں مردی میں کوئی اس کا ثانی نہیں۔ناول نگار نے بادشاہ خاں کے کردار کو نہایت محنت، خوبصورتی اور فنکاری سے گڑھا ہے۔ ہر مقام پر وہ نمایاں اور سرخرو رہتا ہے۔چھچھلا پن اس کا شیوہ نہیں۔بادشاہ خاں کا گزر جن مقامات سے ہوتا ہے، جہاں جہاں اُس کا قیام رہتا ہے، جن اشخاص سے اُس کی ملاقاتیں ہوئی ہیں، جس جس ماحول میں وہ بستا ہے، قریب سے دیکھتا ہے، جھیلتا ہے، سرد وگرم ہواؤں سے متاثر ہوتا ہے، اُن سب کا بیان ناول نگار نے نہایت موثر انداز میں ناول میں کیا ہے۔ اِس ناول میں کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری، جزئیات نگاری، تاریخ اور تہذیب و ثقافت کا بیان غضب کا ہے۔ناول کے ہر صفحے پر نظر ٹھہر جاتی ہے۔ محاورات، ضرب الامثال، روزمرّہ، بولی ٹھولی کا ایسا برجستہ و بیساختہ استعمال ناول کی نثر میں ہے کہ ناول کی دلکشی، دلآویزی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔زبان و اسلوب کی توانائی، نثر کا حُسن پورے ناول میں جلوہ گر ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

بادشاہ خاں کی زندگی کے ابتدائی ایّام جس ماحول میں گزرتے ہیں، اُس کے مزاج میں کالج کے زمانے سے ہی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ مزاج کا حصّہ بن جاتی ہے۔ ماں کی نصیحت کا خاصا اثر بھی ہوتا ہے، وہ نسرین اختر کے عشق کی آگ میں جلتا رہتا ہے اور جب زیبُن آپا اُس سے یہ کہتی ہیں:

''بادشاہ بیٹے! تمھارے دل میں عشق کے جلتے ہوئے الاؤ کو روشن دیکھ رہی ہوں۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، مگر مقدر کے امکانات کی دنیا ئیں محدود ہیں۔ یاد رکھو! خواہش کی سبیلیں دوسروں کو شاداب کر سکتی ہیں مگر خود تشنگی ان کا نصیب ٹھہرتی ہے۔ اس راہ دشوار میں زہریلے ناگ بچھے ہوئے ہیں۔ تم ان کی یلغار کو کہاں تک جھیلو گے۔ یہ عشق کمبخت وہ زہر ہے جس کا نشہ دھیرے دھیرے حواس پر چڑھتا اور پھر انسان کو عضو معطل بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔ تم ہو سکے تو خود کو اس حلقۂ زنجیر سے آزاد کر لو۔ تمھاری ماں کی عبادت گزار آنکھوں سے پھوٹتی ہوئی روشنی تمہاری ڈھال بنی ہوئی ہے۔ اختر چندن کا درخت ہے جس کی شاخوں سے سانپ لپٹے ہوئے ہیں اگر وہ اسے آزاد چھوڑ سکتے ہیں، اگر وہ ان سے نجات حاصل کر سکتی ہے تو میری طرف سے اجازت ہے۔ جاؤ ابھی جاؤ تمہارا خدا والی!''

(بنارس والی گلی— صفحہ نمبر 59)

مگر زرد آندھی کا زور تھمنے نہیں پایا۔ شہر علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ پورا شہر فساد کی زَد میں آ گیا۔ بادشاہ خاں کی محبت کو بھی نظر لگ گئی۔ نسرین اختر کی محبت بھی خاموش وادی میں گُم ہو گئی۔ فساد سے پُورا شہر متاثر ہوا۔ حالات کے بدلتے رُخ کو دیکھ کر تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اور مستقبل روشن کرنے کے لیے بادشاہ خاں نے دہلی کا رُخ کیا، لیکن اِس باب کے اختتام سے قبل ناول نگار علی گڑھ کی علمی و تہذیبی زندگی کا نقشہ پیش کرنا نہیں بھولتا ہے۔ تالے کا کاروبار، ہوٹل اسکائی لارک، عثمانیہ ریسٹورنٹ، پروفیسر عبدالحفیظ، لودھی صاحب، اختر انصاری، فوق کریمی، عبدالمجید خواجہ، نازش انصاری، عشرت امیر، قاضی عبدالستار، خلیل الرحمٰن اعظمی، بلقیس آپا، وغیرہ

کے ذکر سے علی گڑھ کی جیتی جاگتی تصویر کا اندازہ ہوتا ہے۔علی گڑھ ابتدا سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے مگر شہری زندگی مختلف رہی ہے جس کا بین ثبوت ناول کا یہ باب ہے۔

دہلی میں بادشاہ کو اپنے پہلے پیار نسرین اختر کی یاد ستاتی ہے، رِضّو باجی، رئیسہ اور مُنّی کی یادیں بھی اُسے بے چین کرتی ہیں ساتھ ہی دہلی کی ہنگامی زندگی، بڑے شہر کے مسائل ومشکلات، تعلیم حاصل کرنے کی خواہش وکاوش اور نئے دوستوں کے درمیان نئی زندگی کی شروعات ہوتی ہے۔دہلی کی زندگی کا جو نقشہ فیاض رفعت نے پیش کیا ہے وہ حد درجہ اثر انگیز اور مختلف ہے۔مثلاً ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ’’جامع مسجد کی سیڑھیوں پر آباد چائے خانوں میں داستان گوئی کی روایت چراغ کی صورت ضوفشاں تھی۔ ہاکی کے کوچ اور کرخندار گور بخش سنگھ مشتاق یوسفی کے ’آب گم‘ کی تلاش میں عرق عرق ہو رہے تھے۔جوتے والے بھائی تقی شمع معموں کی کلید ڈھونڈ رہے تھے۔حاجی ہوٹل آباد تھا۔ جہاں رات کے آخری پہر تک دلّی کے سفید پوشوں کی بزم آراستہ ہوتی تھی ۔اُردو بازار کی رونقیں ادیبوں اور شاعروں کے دم قدم سے زندہ تھیں۔ مچھلی بازار کے عین سامنے آزاد ہند ہوٹل کی سیڑھیوں سے لپٹی ہوئی فراق، جوش اور بسمل کے قدموں کی دھول شعر وسخن کی نا تمام بزم آرائیوں کے احساس کو جگا رہی تھی۔عضویاتی شاعری کے نمائندے افضل پشاوری اپنی سات عدد بیویوں کے ساتھ حسب روایت گوشت کھانے اور گوشت لڑانے کے فن کو فروغ دے رہے تھے۔اُردو ہندی اور انگریزی کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن شائع کرنے والے بابو بنارسی داس نے پردہ کرلیا تھا۔ان کی فلک بوس عمارت ویرانی کا مسکن تھی اور جہاں کبوتروں کی چھتری تھی، وہاں کبوتروں کے غول کے غول اُترتے اور صبح وشام ان کے نہ ہونے کا ماتم کرتے اور پھر اُداسیوں کے گہرے بادلوں میں کھو جاتے۔‘‘
>
> (بنارس والی گلی،ص 76)

ناول میں دہلی کی سیاسی وتہذیبی زندگی، جلال و جمال، علمی وادبی سرگرمیاں، رونق و زبوں حالی کو فنکارانہ انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اُس عہد کی دلّی کی تصویر آنکھوں کے سامنے تیر جاتی ہے۔ ہرے بھرے شاہ کے مزار کی رونق ہو یا کریم نان بائی کا ٹھیہہ، کتب خانہ عزیزیہ ہو یا پھر دلّی کالج، مجنوں کا ٹیلہ یا جامع مسجد یا پھر تیمار پور یا پھر وہاں کے مکین، ان تمام عناصر کو ناول نگار نے فنکارانہ مہارت کے ساتھ اپنے مخصوص بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اِس ناول میں یوں تو بے شمار کردار ہیں اور کئی کرداروں کے شخصی مرقعے اتنے خوبصورت اور یادوں سے اَٹے پڑے ہیں جن کا ذکر لازمی ہے۔ بالخصوص سندھیا، جاوید ایوّبی، بڑی بی بی، سلیم، سیٹھ کشن لال وغیرہ کے کردار ناقابلِ فراموش ہیں اور ان کرداروں کے تعلق سے جو واقعات پیش کیے گئے ہیں، انسانی زندگی کے مختلف رنگ وروپ، تاریخی وتہذیبی اعتبار سے تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی اور بدلتا ہوا شہر، انسانی نفسیات، نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے جنسی معاملات، محبت، عداوت، نفرت، پرانی وضعداری، نئی دنیاداری، سماجی خدمت گار، بیوروکریٹس، صنعت کار، مولوی، پنڈت، ادباوشعرا، اِن سب کی تصویر کشی اس باب میں کی گئی ہے۔ اسی زمانے میں پاکستان کا وجود بھی عمل میں آیا۔ جب بادشاہ خاں اپنی والدہ سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟ تو وہ خلا میں گھورنے لگتی ہیں اور کوئی جواب نہیں دیتیں، اُس پاکستان نے اُنھیں بلک بلک کر رونے پر مجبور کردیا تھا۔ بادشاہ کے والد پاکستان جانا چاہتے تھے لیکن اُن کی والدہ اپنی زمین، اپنا گھر، اپنا دیس چھوڑ کر پرائی دھرتی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ اپنی جڑوں کو چھوڑ کر کیسے جاتیں؟ اُنھیں اپنے پُرکھوں کی ہڈّیوں کو تن تنہا چھوڑ کر پاکستان چلے جانا ہرگز منظور نہیں تھا اور اُنھوں نے اپنی ساری زندگی اُسی زمین پر گزارنا پسند کیا جہاں اُن کے آباواجداد دفن تھے۔ ایک بڑے المیے کو چند جملوں میں سمیٹ کر اور پورے پاکستان کی عبرتناک صورتحال کو پیش کرکے ناول نگار نے آئینہ دکھایا ہے۔ لیاقت علی خاں کا قتل، مہاجروں کا قتلِ عام، بھٹّو کا پھانسی پر لٹکایا جانا، جنرل نیازی کو اپنے چھیانوے ہزار سپاہیوں کے ساتھ جنرل اَروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالنا، پاکستان کی خونریزی اور بدصورتی کو ناول نگار نے پیش کرکے اپنی بصیرت وبصارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

بادشاہ خاں کو وطن کی یاد آتی ہے اور وہ علی گڑھ آتا ہے۔ یہاں سب کچھ بدل جاتا

ہے۔ مناکشی، رویندر جین، رئیسہ کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ وہاں کی زندگی میں چند معجزے بھی ہوتے ہیں۔ ناول نگار سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن خیالات کے تلاطم میں وہ خود کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور پھر رقم کرتا ہے:

> ''ہر انسان خوشی کے زرنگار خوابوں سے اپنے ذہن کو سجاتا ہے۔ یہ جانے بغیر یہ سوچے بغیر کہ خواب ٹوٹنے بکھرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم خواب دیکھنا چھوڑ دیں؟ بھلے سے ناکامی اور ذہنی اذیت ہمارا مقدر ٹھہرے، لاکھ ہمارے خواب ملال کی بدلی میں کھو جائیں، ہم خوابوں کی روپہلی دنیا سے دست کش نہیں ہو سکتے۔ اسرار کے پردے میں چھپی ہوئی زندگی کی عقدہ کشائی کے لیے ہم طوفانوں سے گزرتے ہیں، آندھیوں میں چراغ جلاتے ہیں، صحراؤں کی خاک چھانتے ہیں، سمندر پر کمندیں ڈالتے ہیں۔ ہر چند اس میں جان کا زیاں ہوتا ہے، پتوار ہاتھ سے چھوٹ جاتے ہیں، بادبان بادِ مخالف کی کشاکش سے چھلنی چھلنی ہو جاتے ہیں مگر فطرت کے ساتھ تصادم کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا کہ یہی زندگی ہے اور یہی زندگی کا نشانِ امتیاز کہ ہم اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔'' (بنارس والی گلی— صفحہ نمبر 115-114)

ناول کی قرأت کے وقت مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ ناول نگار نثر میں شاعری کر رہا ہے۔ ایسی دلکشی اور دلآویزی کم تحریروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ کبھی ایسا محسوس بھی ہوا کہ ناول نگار، سماج کی کریہہ صورتوں کو بڑی سفّاکی کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ لیکن اِس موقع پر بھی اُس کا اسلوب اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔ کبھی یوں لگا کہ ناول نگار نے طوائفوں اور رقّاصاؤں کی زندگیوں کو بے حد قریب سے دیکھا ہے، اُس کا خاصا سابقہ اُن سے رہا ہے اور وہ جس مفصّل انداز میں تمام تر جزئیات کے ساتھ اُسے پیش کرتا ہے یہ اُس کا خاص ملکہ ہے۔ وہ عشق کی وادی کا ایک دیوتا ہے جو سبھی دیوداسیوں کو قریب سے دیکھتا ہے اور اُن کی تصویر اپنے قلم سے بناتا ہے۔ کبھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ناول نگار وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی زندگیوں کا مصور ہے، وہ ذہن و دل میں تمام

تصویریں بسا تا ہے، اُسے غصہ بھی آتا ہے، نفرت بھی ہوتی ہے، محبت بھی ہوتی ہے اور عشق کی وادی میں وہ کھو بھی جاتا ہے۔ وہ اوّل و آخر ایک بے چین عاشق ہے جو اپنی پہلی محبت کو فراموش نہیں کرتا ہے مگر وقت کے دھارے میں بہتا رہتا ہے۔ ناول پڑھتے وقت مجھے بیشتر مقامات پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار ایک فلسفی ہے، وہ انسانی نفسیات، تہذیب و ثقافت کا نہ صرف رمز شناس ہے بلکہ انسانی زندگی کے مختلف تصورات اُس کے ذہن میں کوندتے رہتے ہیں۔ جب بھی کسی حادثے، واقعے، خوشی و غم سے کردار کا گزر ہوتا ہے اُس کا قلم رواں ہو جاتا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''کسی گمشدہ شئے کی تلاش میں ہم زندگی بھر سفر میں رہتے ہیں، چلتے چلتے ہمارے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں، اور گھنی چھاؤں کی تلاش میں ہم صحرا صحرا، پربت پربت، بھٹکتے ہیں، مگر ثبات و قرار کی وہ گھڑی کبھی نہیں آتی، جس کی تلاش و جستجو میں ہم زندگی کا زیاں کرتے رہتے ہیں۔ تجربات و حوادث کا قطرہ قطرہ زہر ہمارے وجود کو پگھلاتا رہتا ہے، جب تک کہ وجود عدم میں تبدیل ہو کر بسیط فضاؤں میں تحلیل نہ ہو جائے۔''
>
> (بنارس والی گلی—— صفحہ نمبر 151-150)
>
> ''حیرت زار زندگی کی بوالعجبی سے پردہ اٹھانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کی ہزار رنگ ادائیں غم و نشاط کا ایسا آمیزہ ہیں کہ ہم فرطِ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ لمحہ بہ لمحہ بدلتی کائنات کی بوقلمونی کبھی مسرتوں کے پھول کھلاتی ہے اور کبھی ہمیں دکھوں کے کانٹوں سے ہلکان کر دیتی ہے۔ دکھ اور سکھ کے بیچ کوئی حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ یہ وقت کی زنجیر کی ایسی کڑیاں ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔''
>
> (بنارس والی گلی—— صفحہ نمبر 165)
>
> ''سچ ہے ہم تنہا پیڑ کے آخری پتّے کی طرح بے اعتبار زندگی کی شاخ سے لپٹے ہوئے ہیں۔ جیسے تیز ہوا کا جھونکا کبھی بھی موت کی وادیوں میں

اڑا لے جائے گا اور آخری پتّے کے شاخ سے جدا ہوتے ہی ہم وجد میں
آ کر جشنِ خزاں میں کھو جاتے ہیں کہ یہی زندگی اور کاروبارِ زندگی کی رسم
کہنہ ہے جس کے ہم سبھی پابند ہیں۔''

(بنارس والی گلی — صفحہ نمبر 186-185)

''ہم جس نخلستان کی تلاش میں آنکھوں کے آنسو دریا کر لیتے ہیں وہ ہمیں
بر ما تا رجھا تا سراب بن کر آبِ رواں تک لے جاتا ہے۔ جہاں ریت کا لا
محدود سمندر ہمارے یکا و تنہا وجود کو اپنے دام میں اسیر کر لیتا ہے کہ یہی ہمارا
مقسوم ٹھہرا۔ ہم سب کے ہیں ہمارا کوئی نہیں۔''

(بنارس والی گلی — صفحہ نمبر 198)

دَراصل بادشاہ کی پوری زندگی اُس سیمابیت کا شکار رہے جو طوائف خانوں، غنڈوں، مووالیوں، بھڑوؤں، علما، شرفا، غریبوں، امیروں، جھگی جھونپڑیوں، فائیو اسٹار ہوٹلوں وغیرہ سبھوں کے ساتھ گزری۔ وہ اُن کا چشم دید گواہ ہے اور اُن واقعات و حالات کو ناول نگار لفظ لفظ یوں رقم کرتا ہے گویا یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے بے حد قریب سے اُن کے ساتھ وقت گزارا ہے۔

ناول کا خاصا حصہ گزر جانے کے بعد نسرین اختر کا کردار پھر طلوع ہوتا ہے، بقول ناول نگار، ''پھر مجھے دیدۂ ثریا دآیا'' بادشاہ کی ملاقات بے نظیر سے ہوتی ہے جو اسے بتاتی ہے کہ کس طرح رات کے اندھیرے میں نسرین اختر کے باپ نے کلکتے کے سیٹھ سے نسرین اختر کا سودا کر لیا تھا اور بلبیر کی مدد سے اُسے پہلے سہسوان لے جایا گیا جہاں طوائفوں کے سو سے زیادہ گھر آباد تھے، اور پھر وہاں سے کیا ہوا بے نظیر کو اس کی کوئی خبر نہیں۔ بادشاہ سوچتا رہتا ہے دلّی میں زندگی گزرتی ہے، نت نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں، اخبار میں کام کرتا ہے، سفارت خانوں کے چکر لگاتا ہے، ادبا و شعرا کی صحبتیں رہتی ہیں، انتشار اور ابتذال کا سامنا بھی ہوتا ہے۔ جاوید ایوّبی کی شاندار زندگی اور سلیم سے اُس کا سابقہ بھی پڑتا ہے۔

دہلی کے بعد بادشاہ بمبئی کی طرف رُخ کرتا ہے جہاں وہ بطور پروگرام آفیسر آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوتا ہے۔ ناول نگار نے بمبئی کی پوری زندگی اُن کی محبتیں، رفاقتیں، قربتیں،

عصبیت، محنت ومشقت، تجارت کا ذکر کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ ریڈیو کی زندگی میں جن آر ٹسٹوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے، وسیم بھائی جیسے انسان اور ریشما، ممتاز مونا علوی، مینا کشی سے ملاقاتیں ہوتی ہیں، وہیں رِضّو باجی کا فون آتا ہے، بادشاہ پونہ جاتا ہے، گجگامنی سے ملاقات ہوتی ہے اور پھر عجیب وغریب اسرار بھرے واقعے کا سامنا ہوتا ہے کہ کس طرح گجگامنی سرکنڈوں کی جھاڑی میں گُم ہو جاتی ہے۔ گامنی اور سپیرے کے ہیولے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ چبوترے کی کھوہ سے پھن کاڑھے سیاہ ناگ باہر نکلتے ہیں اور عالم اضطراب میں ایک دوسرے کے ہم آغوش ہوجاتے ہیں۔ پلک جھپکتے اُن کی جُون بدل جاتی ہے۔ بادشاہ کو یہ التباس ہوتا ہے کہ سپیرا اور گامنی ایک دوسرے کے وجود میں پیوست ہوتے جا رہے ہیں۔ بادشاہ پونے سے بمبئی آ جاتا ہے اور پھر اُس کی زندگی گزرتی رہتی ہے۔ پھر اس کی ملاقات شکّو بائی، محمود ایوّبی، اسحٰق جمخانہ والا، ریحانہ سلطانہ سے ہوتی ہے۔اسی دوران رِضّو باجی کے شوہر کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو وہ بے چین ہو اٹھتا ہے۔ ریحانہ سلطانہ ہر طرح سے اس کی دلجوئی کرتی ہے اور پھر ایک دن اچانک نسرین اختر سے اُس کی ملاقات ہوتی ہے، جس کا نقشہ ناول نگار نے یوں کھینچا ہے:

> ’’گاڑی وارڈن روڈ کی ایک کشادہ سات منزلہ عمارت کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔ سیکیوریٹی گارڈ نے ادب سے جھک کر نسرین کو سلام کیا۔ پورٹیکو سے لفٹ تک اُس نے ہماری رہنمائی کی۔ ساتویں منزل پر چار بیڈ روم کا کشادہ فلیٹ تھا، جو نیلے رنگ کی روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مرطوب ہواؤں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور گھٹتے بڑھتے چاند کی آدھی ادھوری روشنی سے جا ملیں۔ سمندر کی مضطرب لہریں ساحل کی تلاش میں سر پٹختی ہوئی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں اور پسپا ہو کر پھر اپنے مدار کی طرف لوٹ جاتیں۔
>
> ڈرائنگ روم میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ اطالوی صوفوں پر مخملیں کشن آسودہ تھے۔ دیواروں پر شش جہات آئینے آویزاں تھے۔ سمندر کے رخ پر ماہر سنگ تراشوں کی تراشیدہ مورتیاں ایستادہ تھیں۔ وینس اور کیوپڈ کے آبنوسی مجسمے حسن جہاں سوز اور تجسس عشق کی حیرت زا کہانیوں کی مجسم

تصویر بنے ہوئے تھے۔ پتھروں کی شبیہ میں ہجر و وصال کی نمناک کہانیاں نقش تھیں۔ آدی باسی عورتوں کی نیم برہنہ پینٹگز تھیں..... غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ کے اشعار تھے۔ جنہیں مقبول فدا حسین نے مصور کیا تھا۔ ایک حریری پردے کے پیچھے تانپورہ، ستار اور پکھاوج کی جوڑی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ تام چینی کے ظروف میں سیپیاں، گھونگے سرخ، نارنجی اور قرمزی پتھر سلیقے سے سجائے گئے تھے۔ عجائبات و نوادرات کا طلسم خانہ تھا۔ جو آنکھوں کو حیرت آشنا کر رہا تھا۔''

(بنارس والی گلی— صفحہ نمبر 190)

درج بالا اقتباس میں جزئیات نگاری غضب کی ہے۔ ناول نگار کا یہ کارنامہ ناول کے پورے حصّے میں ثبت ہے۔ نسرین اختر سے ملاقات ہوتے ہی وہ اساطیر کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ اُسے اُوما، پاروتی، دُرگا اور کالی کی یاد آتی ہے۔ عالم دیوانگی اور بے اختیاری میں نسرین اختر بادشاہ کو چومنے لگتی ہے۔ اُس کی آنکھوں سے ساون برسنے لگتے ہیں۔ دامن تر ہو جاتا ہے اور جب غم کی بدلیاں چھٹتی ہیں تو نسرین ورق ورق مرگ و زیست کی کہانی کے اسرار کھولتی ہے کہ کس طرح اماوَس کی کالی رات میں ننھی فاختہ کو علی گڑھ سے سہسوان لے جایا گیا جہاں اُس کی ملاقات چودھرائن شہناز اختری سے ہوئی۔ سہسوان میں طوائفوں کا ایک محلّہ آباد تھا۔ نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے عیّاش لڑکے، اُس کے عاشق تھے اور ایک دِن نسرین کا بلاوا چمڑے والے سیٹھ کے یہاں سے آ گیا۔ شہناز چودھری نے سوگوار نسرین کو دلّی تک ٹیکسی میں چھوڑا اور پھر دلّی سے وہ کلکتے پہنچ گئی۔ سراج الدولہ، لارڈ کلائیو، وارین ہیسٹنگس اور واجد علی شاہ کے شہر میں جو ثروت مند مارواڑیوں کا شہر تھا جو غریبوں، انقلابیوں، لالہ لاجپت رائے، اربندو گھوش، وویکانند، نذرالاسلام، ٹیگور اور مدر ٹریسا کا شہر تھا، جہاں سوامی تیرتھ رام نے فردِ فلسفہ کے چراغ روشن کیے تھے، جہاں سے غالب کا گزر رہا تھا، جہاں جسموں کی سب سے بڑی منڈی سونا گاچھی تھی، جہاں گوہر بائی اور جدّن بائی ٹھمری، غزل اور دادرے کی،،، جہاں دیوداس اور آخری سوال کے خالق شرت چند بہو بازار کی گلیوں میں خاک چھانتے رہے تھے ان سب کا بیان ناول نگار نے مفصّل کیا ہے اور پھر

جس جانسرین کو کلکتے میں اُتارا گیا اُس کا بیان یوں ہے:

''نسرین کو بہو بازار کے ایک شاندار کشادہ مکان میں اُتارا گیا۔ جس سے ملحق سبز باغ میں عشق پیچاں کی بیلیں اپنی بہادر کھلا رہی تھیں... بنفشے کے سرخ پھول انگڑائی لے کر جاگ رہے تھے اور تنہا شاخ پر کھلے نیلے گلاب کی کسمساتی کلیوں کا منہ چوم رہے تھے۔ یوکپلٹس کی ڈالیوں پر نیل کنٹھ کی شوخ چہچہاٹیں فضا کو نغمہ بار کر رہی تھیں۔ سبزہ زار اوس میں نہا کر اُجلی دُھوپ سے ہم آغوش ہونے کے لیے مچل رہا تھا۔ نیلے آسمان پر چھائی ہوئی اودی بدلیاں نم آلود ہواؤں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ دھوپ اور سائے کی آنکھ فطرت کی حیرت زائیوں کا طلسم جگا رہی تھی۔''

(بنارس والی گلی— صفحہ نمبر 204)

سیٹھ نے نسرین کا حد درجہ خیال کیا۔ یہاں سے ناول ایک نیا رُخ لیتا ہے اور اُس برص زدہ چمڑے کے سیٹھ کی پوری زندگی کا بیان ہے کہ اللہ رکھا سیٹھ کو اپنے ماں باپ کا پتہ نہیں تھا۔ کوئی شخص سیٹھ کو نومولودی میں پادری ماں مریم کی قدموں میں رکھ کر چلا گیا تھا جسے ایک مسلمان جوڑا آ کر لے گیا، اُس کی پرورش ہوئی مگر وہ نمبری بدمعاش ہو چکا تھا۔ بعد میں کھالوں کا دھندہ کرنے والے ایک سیٹھ نے اُسے اپنے کاروبار میں شامل کر لیا اور خود کوئلے کی فراہمی کے سلسلے میں چھوٹا ناگپور کا رُخ کیا۔ اس حصّے میں ناول نگار نے ایک آدی باسی سدھو کونڈا کے کردار کا بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح کوئلے کی کانوں میں مزدوری کرتا تھا۔ بعد میں مزدوروں کی یونین کا صدر بن گیا، ایم ایل اے بنا اور اب اس کی نظر چیف منسٹر کے عہدے پر تھی۔ ناول نگار نے چھوٹا ناگپور کے آدی باسیوں کی پوری زندگی، رہن سہن، اُن کے عقیدے کا موثر بیان کیا ہے۔ سیٹھ اللہ رکھا، نسرین اختر کا حد درجہ خیال رکھتا ہے۔ نسرین اختر کا اگلا پڑاؤ چھوٹا ناگپور ہے جہاں وہ جنگلوں، آبشاروں، سبزہ زاروں، ندی نالوں اور خوبصورت قدرتی مناظر کا نظارہ کرتی ہے۔ یہاں سدھو کونڈا کی حکومت قائم ہے۔ اُس نے یہاں قلعہ بنا رکھا ہے۔ یہ پورا حصّہ چھوٹا ناگپور کی ثقافت سے لبریز ہے۔ یہاں نسرین کی دوشیزگی کا پیرہن تار تار ہو چکا تھا۔ اُس کے بدن کی حرمتوں کو بے رحمی کے ساتھ پامال کیا

جا چکا تھا۔ سدھو کونڈا نے زہریلے سانپ کی طرح اُس کے بدن کو جراحتوں کے داغ دیے تھے،نسرین اپنے دکھڑے کا ماتم کرنا چاہتی تھی مگر خاموش رہی اور پھر سدھو کونڈا کا بُرا انجام گلابو کے ہاتھوں ہوا۔

نسرین چھوٹا ناگپور سے کاشی نگری کا کس طرح سفر کرتی ہے یہ اسرار آمیز معمہ ہے۔ وہ کاشی جو موکش نروان اور نجات کی کرشمائی دھرتی ہے۔ دیوتاؤں کی نگری کاشی میں بھٹکتی ہوئی وہ دیو داسیوں کی بستی میں جا پہنچی۔ وہاں سے کاشی میں اُس کی ملاقات نوجوان شیوا سے ہوتی ہے۔ شیوا کی بیوی وَندنا امیر مارواڑی باپ کی بیٹی ہے جس کو جنون کے دورے پڑتے تھے۔ شیوا نے اپنی پتنی کے علاج کے لیے حکیم، ڈاکٹر اور ویدوں کی قطار لگا دی مگر دوروں کا منحوس سلسلہ جاری رہا۔ شیوا نے نسرین کو شادی کی پیشکش کی اور نسرین کے دھرم پریورتن کر کے گوری کے مندر میں سات پھیروں کی رسم ادا کی اور نسرین سے کویتا بن کر شیوا کی زندگی میں پوری طرح شامل ہوگئی۔ وَندنا خوش تھی کہ اُس کا شوہر خوش ہے۔ اُس پر ہیجان خیز دورے پڑنا بند ہو گئے۔ نسرین کے یہاں ایک بچی کی پیدائش ہوئی لیکن کچھ دنوں کے بعد شیوا نمونیے کا شکار ہو گیا۔ اُس کی بیماری بڑھتی گئی، بڑے علاج معالجے ہوئے اور پھر اُسے بھوانی سینیٹوریم میں داخل کر دیا گیا۔ شیوا کے گھر والے اُس کی مسلسل خیریت لیتے مگر ایک دن ڈاکٹروں کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ جاں بحق ہو گیا۔ رات کے غمناک اندھیرے میں شیوا کے جسدِ خاکی کو بنارس لے آیا گیا اور پھر اُس کی اَرتھی اُٹھی۔ شیوا کی پتنی وَندنا نے اپنی ہری کانچ کی چوڑیاں ٹھنڈی کیں اور چیخیں مار کر رونے لگی۔ نسرین کا کلیجہ شق ہوا جا رہا تھا۔ دراصل شیوا نے شراب کی آدھی سے زیادہ بوتل پی لی تھی اور سگریٹ سلگائی تو غلطی سے نشے کے جھونک میں ماچس کی جلتی ہوئی تیلی شراب کی بوتل میں ڈال دی۔ بھک سے ایک شعلہ بھڑکا اور شیوا سے لپٹ گیا۔ اُس کے جسم کا زیادہ حصہ جل گیا تھا اور اُس کی موت کا یہ راز نسرین ہی جانتی تھی۔ اَب نسرین نے گھر کی چوکھٹ کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا، وہ اندھیری رات میں شمشان گھاٹ پہنچتی ہے، اُس جگہ کا طواف کرتی ہے جہاں شیوا کے جسدِ خاکی کو اَگنی نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ اَب وہ ایک راہبہ بن جاتی ہے اور اُس کے قدم غیر ارادی طور پر آگرے کی طرف اُٹھ جاتے ہیں جہاں اس کی ملاقات نواب بانو سے ہوتی ہے اور وہ فلمی دنیا میں شامل

ہونے کے لیے بمبئ چلی آتی ہے۔ناول نگار نے آخری حصے میں لکھا ہے:

نسرین مکمل طور پر راہبہ بن چکی تھی۔اس نے اچھی طرح پہچان لیا تھا کہ انسان کے دُکھ درد کی حقیقت کیا ہے۔اس کا حل کیا ہے اور یہ کائنات کیا ہے۔اب وہ حیات وموت کی دُنیا سے نکل کر صداقتوں اور مسرتوں کی دُنیا میں جلوہ افروز ہو چکی تھی۔جہاں نہ خوشیاں ہیں نہ غم ہیں، نہ نیکی ہے نہ بدی ہے۔اس ماورائی علم کے حاصل ہوتے ہی اب اس کے دل میں یہ احساس بھی ابھرنے لگا کہ وہ مطلقاً آزاد ہو چکی ہے اور اس کی آزادی نے بالآخر اسے نجات دنیا پر روح کی آخری فتح عطا کردی ہے ترک دنیا اور عائق کی یہ آخری منزل ہے۔'' (بنارس والی گلی — صفحہ نمبر 256)

ناول نگار نے اسی ناول میں لکھا ہے:

''زندگی کسی کے لیے ٹھہرتی نہیں۔ایک رواں دواں دریا کے مانند آگے بڑھتی رہتی ہے۔یہ صحیح ہے کہ ماضی کو گرد فراموشی میں نہیں ڈالا جا سکتا۔یہ ایک بچھو کی طرح ہمیں ڈنک مارتا ہے۔کبھی اذیتوں کے انبار لگاتا ہے اور کبھی مسرتوں کی کلیاں چٹکاتا ہے۔مگر بہر طور ہمیں اپنے شکستہ وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ماضی کی تلخیوں سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔''

(بنارس والی گلی — صفحہ نمبر 234)

ناول ''بنارس والی گلی'' بلا شبہ فیاض رفعت کا ایک شاہکار ہے۔اسے سوانحی ناول کہا جا سکتا ہے،مگر اِس ناول میں ایک بڑے اور اچھے ناول کے وہ تمام عناصر موجود ہیں جو کسی بھی ناول کو بڑا بناتے ہیں۔فیاض رفعت وسیع المطالعہ، کشادہ ذہن ،تہذیب وثقافت پر گہری نظر رکھنے والے فنکار ہیں۔انگریزی ادبیات اور تاریخ وتہذیب پر بھی اُن کی نظر اچھی ہے۔جزئیات نگاری کے تو وہ بادشاہ ہیں۔وہ ایک صاحب اسلوب نثر نگار ہیں جس کا احساس ہمیں ناول کے ہر حصے کو پڑھتے ہوئے ہوتا ہے۔فساد،تقسیم ہند،عشق ومحبت ،طوائفوں کی زندگیوں ، بڑے شہروں کے ہنگامی حالات اور کریہہ چہرے، چھوٹا ناگپور میں کوئلے کی کانیں اور وہاں کی غنڈہ گردی پر ناول

یقیناً ملتے ہیں مگر اِن تمام موضوعات کو اِس ناول میں خوبصورتی سے سجایا اور سنوارا گیا ہے۔

اِس ناول کا بنیادی کردار بھلے ہی بادشاہ خاں ہو، مگر نسرین اختر کی پوری زندگی ایک طلسم ہے۔ اُس کی طلسماتی زندگی میں خوشیاں بھی ہیں اور غم بھی، رونق بھی ہے اور نوحہ بھی۔ وہ اپنے طور پر زندگی بسر نہیں کرنے پر مجبور ہے، اُسے کبھی علی گڑھ سے اُس کی مرضی کے خلاف سہسوان لے جایا جاتا ہے تو کبھی دلّی، کبھی کلکتہ تو کبھی چھوٹا ناگپور اور پھر وہ آگرہ اور اُس کے بعد بمبئی چلی جاتی ہے۔ وہ بادشاہ خاں کو پسند کرتی ہے لیکن اسے کبھی سہسوان کے عیاش نوجوانوں کے سامنے رقص و موسیقی کی محفلیں جمانی پڑتی ہیں تو کبھی برص زدہ چمڑے والے سیٹھ کی تحویل میں آجاتی ہے۔ کبھی سدھو کونڈ اُسے اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے تو کبھی وہ دھرم پریورتن کرکے شیوا کی بیوی نسرین سے کویتا بن جاتی ہے۔ مگر یہاں بھی اُسے چین نہیں، شیوا کی موت ہوجاتی ہے اور وہ خود کو اس کا ذمہ دار مانتی ہے۔ اُس کی بسی بسائی دُنیا اُجڑ جاتی ہے۔ زندگی سخت امتحان لیتی ہے مگر وہ پھر اپنی زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتی ہے اور آخری میں اُس کا سامنا بادشاہ خاں سے ہوتا ہے۔ دراصل یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جسے کبھی چین حاصل نہیں۔ اس کہانی کو ناول کی شکل عطا کرنے کے لیے میں فیاض رفعت کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ ناول یقیناً علمی و ادبی حلقوں میں ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔

پروفیسر شہزاد انجم، صدر شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:116-122
Prof. Syed Sirajuddin Ajmali, 1857 aur Khwaja Altaf Hussain Hali

سید سراج الدین اجملی

1857ء اور خواجہ الطاف حسین حالؔی

1857ء کے ہنگامۂ دار و گیر نے اہل وطن کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ معاشرے کا ایک بڑا طبقہ اس ہنگامے سے اس طرح متاثر ہوا کہ اس پر ردعمل کے لئے کچھ باقی ہی نہیں بچا اور جن بچوں سمیت نذر بلا ہو گیا۔ جو باقی بچا اس میں بھی دو طرح کے افراد تھے ایک وہ جن میں ردعمل اور اظہار کی قوت نہ تھی اور ایک وہ طبقہ جس کو معاشرے کا عطر یا دماغ کہا جا سکتا ہے۔ اس طبقے میں شعرأ، ادبأ اور صاحبان علم شامل تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا امام بخش صہبائی، سر سید احمد خاں اور خواجہ الطاف حسین حالی وغیرہ کا تعلق اسی طبقے سے تھا۔ ان اصحاب علم و دانش کے یہاں 1857ء پر رد عمل کی صورت بہت مختلف نظر آتی ہے۔ غالب اور سر سید کا ردعمل وہ نہیں ہے جو آزردہ اور شیفتہ کا ہے۔ فضل حق خیر آبادی اور امام بخش صہبائی کے یہاں ان سب سے الگ ردعمل ملتا ہے۔ جبکہ حالی کا انداز بالکل مختلف ہے۔

اوپر ذکر کئے گئے افراد میں حالی کے علاوہ تقریباً سبھی 1857ء کے واقعات کے عینی شاہد اور اس ہنگامے کا شکار نظر آتے ہیں۔ سر سید بجنور میں اور باقی سب دہلی میں تھے۔ غالب کا مشہور قطعہ ہے۔

بس کہ فعال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
میں نے مانا کہ جل گئے پھر کیا　　وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ　　سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم　　ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یا رب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا 1؎

1857ء کے واقعات پر شاعری کے ذریعہ ہمارے سب سے بڑے شاعر کا ردعمل ہے۔جیسا کہ عرض کیا گیا سر سید اس وقت بجنور میں تھے اور نہایت دگرگوں حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے تھے۔حالی نے (جن کی عمر اس وقت 20 برس تھی اور وہ حصار میں تھے) سر سید اور 1857ء کے تعلق سے حیات جاوید میں لکھا ہے۔

''جس واقعہ نے ہندوستان کی تاریخ میں 1857ء کے نام پر ایک سیاہ دھبّا چھوڑا اور جو ہندوستان کی قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا اور سر سید کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے والا تھا وہ سر سید کو بجنور میں دیکھنا پڑا۔'' 2؎

حالی کے اس اقتباس کا پہلا جملہ قابل توجہ ہے۔

''جس واقعہ نے ہندوستان کی تاریخ میں 1857ء کے نام پر سیاہ دھبّا چھوڑا۔''

اس ایک جملے میں واقعات 1857ء کے تعلق سے ہمارے ایک بڑے ادیب عالم اور شاعر کا وہ ردعمل پنہاں ہے جس کی تفسیر حالی کی تحریروں میں آخر آخر تک ہمیں نظر آتی ہے۔یہ ردعمل ایک محبّ وطن ہندوستانی کا ردعمل ہے۔اس ردعمل میں حملہ آور قوم کے عمل کو مذموم قرار دیا گیا ہے اور اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔

حالی ہماری ادبی تاریخ کی ان شخصیتوں میں سے ہیں جن کی خدمات کا اعتراف بھی خوب ہوا لیکن کہیں کہیں ہمیں وہ مظلوم بھی نظر آتے ہیں۔مثلاً سر سید کے سوانح نگار کی حیثیت سے حالی کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے اس میں حالی کو سر سید کے تمام نظریات سے متفق دکھایا جاتا ہے

جبکہ ایسا واقعتاً ہے نہیں۔حیات جاوید کے تعلق سے ''سر سید کی مدلل مداحی'' والے فقرے نے بھی حالی کی یہ تصویر بنانے میں خاصی معاونت کی ہے۔جبکہ سر سید کے حامی اور معترف ہونے کے باوجود حالی ان کے مذہبی نظریات سے کلیتہً متفق نہیں تھے۔برطانوی حکومت کے تعلق سے جو خیالات سر سید احمد خاں کے تھے اور جس طرح وہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کو رحمت سے تعبیر کرتے تھے ویسا حالی نے نہیں کیا۔حالی کے باب میں اکثر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ۔

''حالی نے برطانوی حکومت کی مکمل حمایت نہیں کی ۔انھوں نے حکومت کے ان اصلاحی اور ترقیاتی اقدام کو ضرور قابل تعریف قرار دیا جن کے بارے میں وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ ہندوستانی سماج کی تبدیلی اور ترقی کا باعث بنیں گے لیکن بہ یک وقت وہ برطانوی حکومت کے سامراجی کردار سے بھی مکمل طور پر آگاہ معلوم ہوتے تھے اور اس کی مذمت کرتے تھے۔وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں تھے کہ ہندوستانی عوام کی یا جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی فلاح و بہبود برطانوی حکومت ہی کے تحت ممکن ہے۔''3

حالی نے نظم ونثر میں جہاں جہاں برطانوی طرز حکومت کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ہمیں وہاں وہاں تدبر اور بصیرت کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔سر سید جب اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں تو انھیں برطانوی نظام کا صرف روشن پہلو نظر آتا ہے۔جبکہ اظہار میں توازن کو قائم رکھتے ہیں۔یہ بات تو سبھی کے علم میں ہے کہ برطانوی حکومت کا اصل مقصد حصول دولت تھا خاص طور پر ان علاقوں سے جہاں ان کی کالونیاں تھیں ان میں ہندوستان بھی شامل ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس ملک میں برطانوی بغرض تجارت داخل ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ اقتدار پر قابض ہوگئے۔حصول اقتدار کے بعد بھی انھوں نے اس ملک کو پچھلے حکمرانوں کی طرح اپنا ملک نہیں سمجھا بلکہ یہاں سامراجی مفادات کو ہی پیش نظر رکھا۔یہاں کی صنعت وتجارت پر قبضہ کر لینے اور یہاں معاشی ابتری پیدا کر دینے کے ذمہ دار ہونے کے باوجود خود کو مہذب اور شائستہ سمجھتے رہے۔حالی نے اس نکتہ کو اپنے مقالات میں بہت صراحت کے ساتھ بیان کیا

ہے۔ان کا ردعمل ابنائے وطن کے تعلق سے ہمدردانہ ہے جس میں برطانوی حکومت کی خودساختہ شائستگی پروارنظر آتا ہے۔مقالات سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

’’اگر کہیں آزادیٔ تجارت میں مزاحمت پیش آتی ہے اور بغیر جبر وتعدی کے کام نہیں چلتا تو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم بھی سب کچھ کرنے کو موجود ہو جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آزادیٔ تجارت کی مزاحمت رفع کرنی عین انصاف ہے۔حالانکہ آج تک پریکٹیکل اکانومی نے اس بات کا تصفیہ نہیں کیا کہ فری ٹریڈ کا قاعدہ مطلقاً قرین انصاف ہے یا خاص خاص صورتوں میں خلاف انصاف بھی ہوسکتا ہے۔انگلینڈ کا فائدہ فری ٹریڈ میں ہے اس لئے وہ اسی کو عین انصاف سمجھتا ہے۔‘‘

عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ حالی 1857 میں ہندوستان کا مقدر ہو جانے والی برطانوی حکومت کی پالیسیوں کے نکتہ چیں بھی تھے اور اس کے ذریعہ برپا کی جانے والی قیامت کے نوحہ خواں بھی۔

آج ہم جمہوریت،آزادیٔ اظہار اور حقوق انسانی کے غلغلے کے دور میں بھی اقتدار کے جبر کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کا انجام دیکھتے رہتے ہیں پھر مطلق العنان بادشاہوں کے دور میں آزادیٔ اظہار کی صورت کیا رہی ہوگی اس کا اندازہ بخوبی کرسکتے ہیں۔اس کے باوجود حالی کا ردعمل ہمیں کافی زبردست لگتا ہے۔خاطر نشان رہے کہ حالی سیاسی مدبر تو تسلیم کئے جاسکتے ہیں سیاسی کارکن نہیں یعنی اقتدار کے جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کا جو انداز سیاسی کارکن کا ہوتا ہے اس کی توقع ہم حالی سے نہیں کرتے۔اس کے باوصف ان کے یہاں ایسے اشعار ہمیں اس کیفیت سے دوچار کرتے ہیں جو کسی قیامت کو گزرتا دیکھنے والے حساس فرد کو پیش آتی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی

....

نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یالٹس ہے گل چیں! یا ہے قزاقی
مدارج کوشش و تعبیر کے سب ہو چکے حالی
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اک غیب کا باقی

....

علم کیا اخلاق کیا ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ 4

ان اشعار میں جس درجے کا ردعمل ہے وہ برطانوی استعمار کی فطرت پر بہت گہرے طنز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح اس نے ہندوستان کے علمی و تہذیبی سرمائے کو غصب کیا اور جس طرح اہل ہندوستان کو بے دست و پا بنا کے رکھ دیا اس کا بیان بے حد دل سوزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان مہذب لیڈروں کے وحشیانہ عمل کو وحشیوں کی لوٹ پاٹ سے زیادہ شدید بتاتے ہوئے حالؔی انھیں قزاق تک کہہ جاتے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھتے ہوئے اسی بحر و وزن میں اقبال کی نظم ''خطاب بہ نوجوانان اسلام'' کے اشعار یاد آتے ہیں۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شئے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

غنی روز سیاہ پیر کنعاں راتما شا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا 5

حالی علم اور اخلاق کو بھی استعماری ہتھیار قرار دیتے ہیں جو وہ انسان دشمنی کے لئے استعمال کر رہا ہے۔

اس سلسلے کی ایک اور تخلیق حالی کی وہ غزل ہے جسے دہلی مرحوم کا مرثیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ان اشعار میں حالی نے

غالب وشیفتہ ونیّر وو آزردہ وذوق

کا ہی مرثیہ نہیں پڑھا ہے بلکہ ان اقدار اور تصورات کی پامالی پر بھی ماتم کناں ہوئے ہیں کہ جن کے نمائندے مذکورہ بالا باکمال تھے اور انھیں استعمار نے پامال کر دیا۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
جس کو زخموں کے حوادث سے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانہ ہرگز6

اس اقتباس کا ہر شعر خون جگر کا حکم رکھتا ہے جو شاعر کی آنکھوں سے ٹپکا ہے۔اقتباس کے آخری شعر میں دہلی کی بربادی اور اس سے متاثر ہونے والی خلقت کی کس مپرسی کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

اس کے علاوہ نظموں قطعات اور رباعیات میں بھی حالی نے اپنے اس درد کا اظہار کیا

ہے۔کبھی طنزیہ کبھی مزاحیہ اور کبھی ناصحانہ پیرایوں میں۔کالے اور گورے کی صحت کا امتحان، پولیٹیکل اسپیچیں، قانون وغیرہ قطعات ثبوت کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔برطانوی اقتدار کے مداحوں سے چھیڑ چھاڑ کے پیرائے میں بھی حالی اپنے اسی ردعمل کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

ہم اس مختصر گفتگو کا اختتام اس رباعی پر کرتے ہیں جو حالی نے سرسید کو مخاطب کر کے طنزیہ پیرائے میں کہی ہے اور ''رفارم'' کی اصطلاح کو ہدف تنقید بنایا ہے۔

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی
کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ
دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی7

حواشی:

1۔دیوان غالب، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی (نقش ثانی)،1858ء،انجمن ترقی اردو (ہند)،نئی دہلی، ص350

2۔حیات جاوید، الطاف حسین حالی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، چھٹی طباعت 2013ء، ص77

3۔اردو دانش وروں کے سیاسی میلانات ،مظہر مہدی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،1999ء،ص89

4۔کلیات حالی، تحقیق و تدوین ڈاکٹر سید تقی عابدی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ، 2014ء ص297-277

5۔کلیات اقبال اردو، علامہ اقبال، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ، ایڈیشن 2006ء،ص180

6۔کلیات حالی ، تحقیق و تدوین ڈاکٹر سید تقی عابدی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ،2014 ،ص 261-262

7۔ایضاً،ص167

پروفیسر سید سراج الدین اجملی، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P: 123-161
Mr. Arman Najmi, Ke Zamana Usko Bhula Na De

ارمان نجمی

کہ زمانہ اُس کو بھلا نہ دے

قضا وقدر کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ آدمی سوچتا اور چاہتا کچھ اور ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔ خود اختیاری اور بے اختیاری کے دائرے میں اس کا وجود کبھی چٹان کی طرح اٹل ہو جاتا ہے تو کبھی پر کاہ کی مانند ہوا کے ہلکے جھونکے میں بھی ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔ جیسے منجدھار میں تنکا۔

کلیم عاجزؔ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُن کی شخصیت کئی جہتوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اُن کی شہرت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اُن کی غزلوں میں بہ قول فراق پسی ہوئی بجلیوں کی چنگاریاں رقص کرتی ہیں تو دکھوں کی ایک داستان بھی سنائی دیتی ہے جو اُن کی آپ بیتی ہوتے ہوئے جگ بیتی بھی ہے۔ ایک مشہور ناقد نے اُن کی غزلوں کو معاملہ بندی کی حدود کا اظہاریہ قرار دیا۔ لیکن ایسا کہنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی کہ اُن کی غزلوں میں معاملہ بندی کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُن میں فکری آنچ کی کمی کا احساس ہر کس وناکس کو نہیں ہو سکتا کہ زیادہ تر لوگ اُن کی شعریات کی پہچان تک ہی خود کو محدود رکھتے ہیں اور اسی پر سر دھنتے رہتے ہیں۔ کم ہی لوگ یہ جانتے ہیں کہ انھوں نے نثر بھی لکھی ہے بلکہ اعلیٰ پایہ کی نثر بھی لکھی ہے۔ اُن کی خودنوشت ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' ایک ایسی کتاب ہے جس پر کوئی قابل قدر کام ہوا ہی نہیں ہے بلکہ گذشتہ 3 / 2 دہائیوں کے اندر جتنی خودنوشتیں لکھی گئی ہیں اُن کے تقابلی مطالعہ میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔ نہ ہی میں نے کہیں اس کا حوالہ دیکھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی شعری یا نثری کتابیں بازار میں دستیاب

نہیں ہوتیں بلکہ براہ راست مصنف سے ہی منگائی جاسکتی ہیں۔ میں خوش نصیب ہوں کہ اُن کی تمام نثری کتابیں مجھے اپنے ہمدم دیرینہ انجینئر الحاج سید حسن عسکری طارق نے مدینہ منورہ میں اپنے دست خاص سے عطا کیں۔ جن کے مطالعہ سے میرے تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ میں اس مضمون میں اُن کتابوں پر بات نہیں کروں گا کہ وہ ایک ایک الگ موضوع ہے جو بہت ہی تفصیل کا متقاضی ہے جس کی گنجائش یہاں نہیں۔ بلکہ میں اُن کی یادنگاری، ان پر گزری ہوئی واردات قلبی روحانی ونفسیاتی کے متعلق لکھ کر، اس میدان میں ان کی حصولیابی کی نشاندہی کرنا چاہوں گا۔

اُن کی سن پیدائش 1924ء ہے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم، اس وقت کے روایت کے مطابق گھر پر ہی ہوئی جس میں ان کی والدہ ماجدہ پیش پیش رہیں۔ اپنے نانا جان مولوی ضمیرالدین سے انہوں نے قاعدہ بغدادی، سکندرنامہ اور چہار دانش کم سنی میں ہی پڑھ لی تھیں۔

تعلیم وتربیت کے ساتھ اس وقت کا ماحول بودوباش، آمدورفت، مہمان داریاں، ملنے جلنے والوں کی بے لاگ لپٹ باتیں اور زبان کا چٹخارہ ان سب کا آمیزہ اُن کی حرف شناسی اور معانی تک رسائی میں غیرمحسوس طور پر اپنا کردار ادا کرتا رہا۔ ان کی ذہنی ساخت وپرداخت میں ان بزرگوں کا بھی ہاتھ رہا جن کے ہمراہ وہ 5۔6 سال کی عمر میں تلہاڑا سے پھلواری شریف گئے تھے اور شہید تلہاڑا، عبدالحفیظ صاحب اور حضرت شاہ محی الدین کے آگے دوزانو بیٹھنے رہے (جہاں بچپن کے سال میں دو چار مہینے گزر جاتے) اُن کا سفر زیادہ تر اسلام پور ہی کا ہوتا، جہاں اُن کی خالہ رہتی تھیں۔ تلہاڑہ سے اکنگرسرائے (بذریعہ ٹمٹم، پالکی یا بیل گاڑی) اور اکنگرسرائے سے اسلام پور بذریعہ مارٹن کمپنی کی چھوٹی ریل (جواب بند ہوچکی ہے) کے ذریعہ یہ مسافت طے ہوتی۔ کبھی کبھی وہ پاپیادہ سات میل کا دوسرا راستہ طے کرکے دوستوں کے ساتھ 2 گھنٹے میں ہی اسلام پور پہنچ جاتے۔ وہاں خانقاہ العلائیہ کے پیر طریقت تھے شاہ عبدالقادر صاحب جن کی مرید ان کی والدہ بھی تھیں اور نانا مولوی ضمیرالدین بھی۔ خاطر نشان رہے کہ تلہاڑا میں کوئی خانقاہ نہیں تھی۔ اُن دنوں گھر کے ساتھ بچوں کی ابتدائی تعلیم مکتب ومدرسہ میں ہوتی تھی جس کے بعد وہ اسکولوں میں داخل ہوکر میٹرک تک کی تعلیم حاصل کرکے کچھ تو کاروبار یا ملازمت سے لگ جاتے اور کچھ آگے پڑھنے کے لئے شہروں کا رُخ کرتے۔ فارسی اور عربی کے ساتھ اردو کی تعلیم ایسی

مضبوط بنیادوں پر ہوتی تھی کہ نصابی ہی نہیں غیر نصابی کتابوں اور رسالوں سے ایک ایسا تعلق خاطر قائم ہو جاتا تھا جو زندگی بھر ختم نہیں ہو پاتا تھا۔کلیم عاجز کی ابتدائی تعلیم سکندر نامہ اور ر بہار دانش کے بعد کچھ دنوں کلکتہ میں ہوئی جہاں ان کے والد نے ماسٹر تر پاٹھی سے حساب کی تعلیم دلوائی۔1934ء کے ہولناک زلزلہ کے وقت وہ کلکتہ میں ہی مقیم تھے اور اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نماز کے قاعدے میں تھا کہ زمین نے ہچکولے دئے اور میں دائیں بائیں ٹگنے لگا۔شور ہوا زلزلہ ہے۔سامنے دیکھا تو 25 نمبر اور 26 نمبر اپر چیت پور روڈ کی دو منزلہ عمارتیں ٹیڑھی ہو کر ایک دوسرے سے اپنے کنگورے ملا رہی تھیں۔ میٹرک انھوں نے مسلم ہائی اسکول پٹنہ سے پاس کیا۔ان دنوں ان کا قیام نعمان ہاؤس کے لیلی کاٹج میں تھا لیکن اس کے بعد کے حالات ایسے رہے کہ وہ فوری طور پر اعلیٰ تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور چھ سال تک دیہات ہی میں مقیم رہے۔اسی دور میں ان کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور گھر کے حالات ایسے نہیں رہے کہ وہ باہر جا سکیں۔ 1946ء کے مسلم کش فسادات کے بعد اُن پر جو قیامت گزری اُس کے بعد ان کے ہوش و حواس بحال ہوتے 4 / 3 برس گزر گئے۔اُن کے سفر و حضر کے اور بھی کئی راستے تھے اور کئی منزلیں بھی تھیں جہاں سے گزر کر انھوں نے بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سیکھا۔پٹنہ ایک مستقل زیارت گاہ تھی جہاں کبھی علاج معالجہ کے سلسلے میں آنا جانا ہوتا تو کبھی کسی اور سلسلے میں وہاں کے ساکنان شہر سے ملاقاتیں رہتیں۔ اور ان کا ناپختہ ذہن وہاں کے راستوں ، درو دیوار ، تفریح گاہوں اور انسانوں کے طور طریقوں سے اثر قبول کرتا رہتا۔لیکن بزرگوں کی صحبت اور خانقاہوں کی حاضری تک ہی وہ محدود نہیں تھے۔جیسا کہ اُس زمانے کے دیہاتوں میں رواج تھا، پہلوانی اور اُس کے داؤ پیچ سیکھنے کے لئے اکھاڑوں سے بھی بچوں کی اور نوجوانوں کی رغبت سے صحت اور بدن کی مناسب نشو و نما کا بھی انتظام ہوتا تھا۔چنانچہ یہ بھی کُشتی اور پہلوانی کے گُر سیکھتے رہے۔ یہ شوق جز وقتی نہیں تھا بلکہ کچھ دنوں تک وہ باقاعدہ اکھاڑے میں ہی مٹی لگاتے ، ڈنڈ بیٹھک کرتے ، ورزشیں کرتے اور مگدر گھماتے رہے۔ ناشتہ سے قبل تین پاؤ دودھ اور ایک چھٹانک بادام کا شربت پی لیتے اور کودنے کی مشق کرتے۔جب گاؤں چھوٹا تو اُن کا یہ شغل بھی جاری نہ رہ سکا۔

دراصل وہ جس تہذیبی ماحول میں پلے بڑھے اور جس ثقافت کے دائرے میں ان کا

شعور بیدار ہوا اس کا مرکزہ تو دین تھا جس میں صوم وصلوٰۃ کی پابندی لازمی تھی۔لیکن اس پر تصوف اور خانقاہوں کا اثر بھی کم نہیں تھا بلکہ اس دور کا اشرافیہ طبقہ اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔اور اجلافیہ کے لوگ بھی میلہ چراغاں اور قوالی میں شریک ہونے دور دور سے آتے تھے۔بیشتر سفر خانقاہوں کے عرس کے لئے طے کیا جاتا تھا۔ پیری مریدی کے سلسلے میں وابستہ ہونے کے باعث اُن دنوں زائرین کا ہجوم عجیب سماں پیدا کرتا تھا۔وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے گھر کا تعلق خانقاہ اسلام پور اور خانقاہ داناپور سے قدیمی تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہر سال محرم کی 13، 14، 15 تاریخوں کو اسلام پور خانقاہ کے عرس میں اور ۱۴/ ذی قعدہ خانقاہ داناپور کے عرس میں میری پابندی سے شرکت ہوا کرتی تھی۔ جب فسادات سے کچھ پہلے مری شادی لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی میں ہوئی تو مری اہلیہ کی دادیہالی خانقاہ شاہ آل رحیم کی خدمت میں حاضری ہوتی رہی اور شاہ صبیح الحق عمادی، شاہ فدا حسین صاحب 'سملی' شاہ حمدو صاحب، شاہ حسنو صاحب خانقاہ تکیہ پر خواجہ کلاں، اس زمانے سے ہوتا۔میرے سرپرست میرے نگہبان اور کسی حد تک اتالیق تھے''

وہ اسی ضمن میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ پھلواری شریف سے ان کی وابستگی بہت تاخیر سے ہوئی اور 1946ء کے لٹنے پٹنے کے بعد جب وہ مستقل طور پر پٹنہ میں گوشہ نشیں ہوئے تو اسلام پور سے تعلق ختم ہوگیا۔داناپور سے تعلق قائم رہا۔وقفے وقفے سے وہاں عرس میں حاضری ہوتی رہی۔ ربیع الاوّل شریف میں ایک سال خانقاہ مجیبیہ اور دوسرے سال خانقاہ عمادیہ میں عرس اور حاضری پابندی سے رہی۔1954ء میں جب وہ دوبارہ تعلیم (کالج اور یونیورسٹی) کی طرف متوجہ ہوئے تو ان اکابرین کی صحبت اور خانقاہوں کی حاضری بند رہی لیکن 1960ء میں جب ان کا تعلق حضرت مولانا الیاس کی تبلیغی اور اصلاحی تحریک سے ہوا تو جناب سید افتخار فریدی صاحب مرادآبادی کے ساتھ وہ پہلی بار حضرت امان اللہ قادری کے خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور اُن سے جو تعلق خاطر قائم ہوا وہ ربع صدی تک انہیں فیض یاب کرتا رہا۔1966ء میں حج کے موقع پر وہ اُن کے ساتھ رہے اور اس تعلق میں مزید استواری آئی۔انہوں نے لکھا ہے:

.........اس وقت مجھے ایک نئے تجربے سے آشنائی ہوئی، اب تک مجھے آنکھیں جھکائے بیٹھنے کی عادت تھی۔گفتگو بھی کم ،اختلاط بھی کم، ....بزرگی کا تقویٰ کا دبیز پردہ حائل رہتا۔حضرت شاہ صاحب کی قربت میں مجھے آنکھیں کھول کر اور احساسات کی تمام رگوں کو متوجہ کرکے بیٹھنے، بولنے، سننے اور دیکھنے کا موقع ملا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے اس پردے کے اندر جھانک کر تو کبھی اور کبھی دیکھا ہی نہیں۔وہ چیز جسے انسان کہتے ہیں، بشر کہتے ہیں جیسے فرشتوں سے افضل تخلیق کیا گیا ہے، وہ چیز کیا ہے تو میں نے حضرت شاہ صاحب کو 26 / 25 سال یا کچھ زیادہ دنوں میں میں مختلف نوعیّتوں سے دیکھا سمجھا محبت مجھے اور قریب لے گئی اور قریب لے گئی اور قریب لے گئی !!!! اتنا کہ میں اور کسی شیخ یا بزرگ سے قریب نہیں ہوا تھا۔راہ سلوک کے ایک نہایت باہوش باشعور سالک کی حیثیت سے ملت کے ایک نہایت دردمند کی حیثیت سے ایک نہایت اہم اور ممتاز خانقاہ کے باوقار باوضع بااصول اور روشنگاہ وروشن ذہن اور صاحب فراست سجادہ نشین کی حیثیت سے ایک متقی تعلق باللہ رکھنے والے بزرگ کی حیثیت سے ان تمام دوسری حیثیتوں کے درمیان جس چیز نے مجھے بے حد متاثر اور بے حد گرویدہ کیا وہ ان کی ایک نہایت دلکش دلپذیر دل آویز انسان کی حیثیت تھی.....'' میری نگاہوں کے سامنے ایک طویل بسیط اور وسیع تجربے کی دنیا ہے۔جتنا میں نے دنیا کو برتا ہے، پرکھا ہے، چکھا ہے، دیکھا ہے، سنا ہے، سمجھا ہے اور ان سب کو محفوظ رکھا ہے شاید ایسے لوگ نہیں ملیں گے۔ان تمام مشاہدوں میں تجربوں میں معاملوں میں بڑا موضوع اور بنیادی موضوع انسان کی تلاش رہی ہے اور انہی سطور میں آگے بھی لکھتے ہیں:

> ''اس کا حصول کوشش سے ہوتا ہے اور نہ اس کا ظہور ارادے سے ہوتا ہے۔اگر کوشش اور ارادے سے ہوتو یہ اصلی روپ نہیں ہوتا بہروپ ہوتا ہے جلد یا دیر اُتر جاتا ہے۔بہروپ وقتی ہے روپ دوامی ہے جو زندگی میں سائے کی طرح نہیں کیونکہ سایہ تو اندھیرے میں چھاؤں میں ختم ہوجاتا ہے۔یہ ہالہ کی طرح ہوتا ہے سائے میں بھی دھوپ میں بھی اندھیرے میں بھی روشنی میں بھی اور یہ زندگی کے ساتھ قبر میں بھی

جاتا ہے۔ وہاں بھی رہتا ہے اور حشر میں انسان کے ساتھ پھر آئے گا۔
بہت سارے لوگ بے حساب و کتاب جنت میں داخل ہونے والے ہوں
گے ان میں یہ حضرات بھی ہوں گے۔''

(صحیفہ .امان اللہ قادری، 1992ء)

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ان کے سفر و حضر کا مقصد صرف دینی اجتماع یا بندگی کے آستانے تک ہی محدود نہیں رہتا تھا۔ اُن دنوں دیہاتوں میں عام طور میں علاج معالجہ کی سہولتیں دستیاب نہیں ہوتی تھیں چنانچہ ان کا کئی سفر اسی ارادہ سے ہوا۔ پٹنہ یہ اپنے والد کے علاج کے سلسلے میں بھی آئے اور اس سے پہلے خود اپنی بیماری کے علاج کے لئے بھی۔ اس ضمن میں پٹنہ کے دو عدد طبیبوں بلکہ ڈاکٹروں کا ذکر خیر کیا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ جن دنوں یہ مکتب میں زیر تعلیم تھے بیمار رہا کرتے تھے اور کمزوری کے باعث مولوی صاحب کی مار سے بچے رہتے تھے۔ ان دنوں بخار میں مبتلا ہوتے بیس پچیس دن بستر پر پڑے رہتے۔ حکیم صاحب کا جوشاندہ اور گائے کا دودھ بھر کٹورا کی مصیبت برداشت کرتے رہتے۔ لیکن ایک سال بیماری نے ایسا زیر کیا کہ ان کے معالج ڈاکٹر لالہ پرشاد نے پٹنہ لے جانے کی صلاح دی۔ سوال یہ ہوا کہ پٹنہ لے کر جائے کون۔ اُن کے والد کلکتہ میں تھے۔ بھائی جان اسلام پور میں خانقاہ ہائی اسکول میں ماسٹر جمیل صاحب کی زیر نگرانی پڑھ رہے تھے گھر میں محمودہ آپا نانا جان اور کھلائی بوابفاتن عیدو اور منگلی میاں کے سوا اور کوئی نہیں۔ نانا جان نے پٹنہ دیکھا ہی نہ تھا۔ آخر یہ ناظم نانا، پٹنہ جن کے لئے گھر آنگن تھا اور بوابفاتن کی انگلیاں تھامے پٹنہ پہنچے اور ان کے اعظم نانا نے انہیں ڈاکٹر محمد عبدالحیٔ صاحب سے دکھلا کر علاج کرایا تو یہ بالکل تندرست ہو گئے۔ پھر بعد میں جب وہ شعبہ کے سربراہ اور پروفیسر ہو گئے تو ان سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آتے رہے تو ڈاکٹر صاحب موصوف کے جوہر اُن پر کھلتے گئے۔ اور انہیں ایک شفیق معالج ہی نہیں بلکہ ایک نہایت ہی شفیق انسان کی حیثیت سے پہچان کر ان کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ اُن کی بہت ساری خوبیوں کا ذکر انہوں نے اپنے اس مضمون بہ عنوان ''حیات دوام'' ڈاکٹر محمد عبدالحیٔ صاحب کی یاد میں'' کیا ہے لیکن اُن کی دنیاداری اور خدمت خلق پر ہمہ وقت تیاری کے ساتھ ساتھ

اُن کی شب بیداری اور تہجد گزاری کا تذکرہ نہیں کیا ہے یا سہواً رہ گیا ہے۔میں اتنی بات اس لئے لکھ رہا ہوں کہ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب میرے دادا ڈاکٹر جعفر حسن پروفیسر فورنسک میڈیسن پٹنہ میڈیکل کالج کے شاگرد تھے اور کئی بار غریب خانے پر تشریف لا چکے تھے۔میرے ابا جان نے انہی کے زیر علاج رہتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کی۔تو ڈاکٹر صاحب دوسرے دن پرسہ دینے بھی آئے اور قل یا قرآن خوانی میں اپنی جلد کلام مجید کی لے کر آئے اور فاتحہ خوانی تک دوزانو بیٹھے رہے تھے۔

دوسرے ڈاکٹر جن کا بیان کرنا مقصود ہے وہ ہیں ڈاکٹر علی احمد صاحب جن سے ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے کہ اُن کو پہلی بار پٹنہ سیٹی میں احسن الظفر صاحب سابق چیئر مین پٹنہ کارپوریشن جو بعد میں اُن کے چچیا سسر ہوئے سے ملنے گئے تو وہاں اُن کے چھوٹے بھائی سید احمد الظفر سخت بیمار تھے۔وہیں پروفیسر ٹی این بنرجی کو بھی دیکھا کہ اُن سے پہلے اپنا علاج کرا چکے تھے اور ایک صاحب شیروانی پاجامہ اونچی سیاہ ٹوپی ہاتھ میں چھڑی معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر احمد علی ہیں۔سال دو سال بعد جب ان کے والد بیمار ہو کر پٹنہ علاج کے لئے آئے حکیم صالح صاحب کا علاج شروع ہوا تو انہی کی صلاح پر ڈاکٹر علی احمد صاحب سے مشورہ کیا گیا۔ڈاکٹر موصوف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر احمد علی میرے دل میں گڑ گئے۔متوسط قد وجیہ چہرہ کلین شیو کچھ بڑی مونچھیں ڈاکٹر علامہ اقبال کے چھوٹے بھائی لگ رہے تھے.........دوسرے روز میں ان کے مکان پر بجے صبح پہنچ گیا۔ایک گھنٹہ اور انتظار کرنا پڑا۔صبح 8 بجنے والے ہوں گے کہ دائیں طرف کے سائبان سے ملحق ایک کمرہ سے کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ کی آواز آئی....دروازہ کھلا اور اونچی لنگی نیچی قمیض اور دوپلی پہنے ڈاکٹر صاحب....سیدھے ٹیبل کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔ان کے بیٹھتے ہی ایک ملازم نے بہت لمبا سا حقہ سامنے لاکر رکھا....ڈاکٹر صاحب نے حقے کی نے منہ میں لگائی اور سامنے کی مریض کی طرف دیکھا اور کام شروع ہو گیا....ڈاکٹر صاحب تہجد کے وقت اُٹھتے صبح کی نماز کا وقت ہوتے ہی اسی سجادے پر نماز صبح ادا کرتے اور تلاوت یا تسبیح میں مشغول ہو جاتے۔آفتاب پوری طرح بلند ہو جانے کے بعد کمرے سے سیدھے سائبان میں کرسی پر بیٹھ جاتے صرف

حقہ مستقل لبوں سے لگا رہتا، حال سنتے، بولتے کم، نسخہ لکھ کر حوالے کرتے۔کمپونڈر دوا ملنے کی جگہ دواؤں کی ترکیب استعمال غذا پرہیز اور دوسری ہدایات دے دیتا۔ایک پیسہ فیس نہیں.....مریضوں سے فارغ ہوئے درخواست پیش کرنے والوں میں میں بھی تھا۔مجھے انہوں نے کچھ پہچان لیا مخاطب ہوئے۔میں نے والد کو دیکھنے کی درخواست پیش کی وقت دیا وقت پر آئے.....نسخہ لکھا مجھے باہر بلا کر کہا جگر میں زخم ہو گیا ہے علاج کرو اللہ شفا دے گا۔دو چار روز بعد والد کو بہت تیز نمونیہ ہو گیا۔میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں گیا کہ چل کر دیکھ لیجئے وہ بولے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے یہ دوا لے جاؤ استعمال کرو جلد از جلد انہیں اپنے گھر لے جاؤ۔اللہ کو شفا منظور نہیں تھی۔والد صاحب کو نیم بے ہوشی میں گھر لے آیا۔ایک ہفتہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔پٹنہ واپس آیا تو شاید ڈاکٹر علی احمد صاحب نے میری خبر لی۔واقعہ معلوم ہوا تو اپنی فٹن کے شیروانی پاجامہ ٹوپی اور چھڑی میں میرے جھونپڑے میں آئے بولے مجھے اور پہلے آنا چاہئے تھا میں قصوروار ہوں مجھے معاف کر دو۔میں باپ کے غم میں کم ڈاکٹر صاحب کی محبت سے زیادہ متاثر ہو کر رو پڑا تشفی دے کر اور گلے لگا کر رخصت ہو گئے۔اس کے بعد وہ ایک ہی بار میرے گھر آئے۔میرے رشتے کے ایک عزیز کی بچی بیمار ہوئی۔تیز بخار آیا علاج ہوا بخار جاتا رہا مگر ایک صبح سے وہ مستقل رونے اور تڑپنے لگی وحشت میں کئی ڈاکٹروں سے مشورہ لیا گیا ڈاکٹر مسعود ملک، ڈاکٹر عبدالغفور صاحب گرین میڈیکل ہال اور ڈاکٹر منظور احمد۔اسی دہشت میں اس بچی کا اکسرے لیا گیا۔پیتھولوجسٹ ڈاکٹر گوہا آئے پیشاب اور خون ٹسٹ کیا۔صبح سے دوپہر تک تمام جانچ اور تشخیص مکمل ہو گئی۔دوا جلدی جلدی دی جا رہی ہے لیکن اس بچی کی چیخ اور بے قراری میں کمی نہیں آ رہی ہے۔شام کو ڈاکٹر علی احمد صاحب تشریف لائے بچی کو دیکھنے لگے اُن کے سامنے تمام نسخے، اکسرے رپورٹ خون اور پیشاب کی جانچ کی رپورٹ پیش کر دی گئی۔یہ تمام سامنے دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے صرف اتنا کہا" ایں یہ سب ہو گیا بچی کے سر پر اپنے ہاتھ سے دو ایک تھپکی دی کچھ پڑھ کر پھونکا اور کہا کہ اس بچی کے پیٹ میں پاخانہ سخت ہو کر جمع ہو گیا ہے اسے فوراً انیما دو فوراً کمپونڈر آیا انیما دیا گیا۔ڈھیر ساری اجابت ہو گئی۔بچی کو سکون ملا سو گئی۔ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے اٹھے دعا دے کر رخصت ہوئے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔اپنے معالجہ کے اسی سفر میں وہ اعظم نانا کے ہمراہ پٹنہ کی سیر بھی کرتے رہے۔سنیما

بنی کے متعلق سنئے۔ پٹنہ کے واحد خوبصورت الفنشٹن سنیما ہال کے سامنے ایک سات سالہ لڑکا سفید کرتا، ترکی ٹولی پہنے اپنے رشتہ کے ایک بزرگ کی انگلی تھامے کھڑا تھا۔

''یہ کس کا مکان ہے نانا''

یہ مکان نہیں سنیما ہال ہے جی

سنیما ہال کیا ہے نانا

اس میں بولتی تصویر دکھائی دیتی ہے

ہمیں بھی دکھا دیجئے نانا

چنانچہ انھوں نے فلم دیکھی تو مسحور اور طلسم زدہ ہو گئے۔ ''سامنے تصویریں چل رہی تھیں اور بول رہی تھی۔ انھوں نے ہیرو مسٹر وٹھل کی شمشیر زنی کے کمالات، کوٹھا سے بالا خانہ، بالا خانہ سے بارہ دری، بارہ دری سے خواب گاہ کی اچھل کود اور ہندوستانی فلموں کی نامور ہیروئن مس سلوچنا اپنی لافانی مسکراہٹوں کے ساتھ ہر جگہ اُن کی ہمت افزائی کے لئے موجود یہ 1931ء تھا۔ پھر بولتی فلموں کا سرچشمہ پھوٹا تو یہ ایک داستان ہے بلکہ ایک تاریخ ہے جسے دہرانا دردناک ہے کہ فلم انڈسٹری اپنی ابتدا میں کسی کمال پر تھی اور اپنی ترقی کی تقریباً انتہا میں عبرت ناک زوال کی کسی سطح پر ہے۔ 1931ء سے 1960ء تک جب میں نے فلم بینی سے توبہ کی فلم کی داستان میں بیان کروں تو واضح ہو جائے کہ ہمارا تہذیبی معیار جو فلموں کے ذریعہ بھی ہماری زندگی میں داخل ہو کر ہمارے کردار کو بلند کر رہا تھا اور وہ اس ترقی یافتہ دور میں کسی قدر پست ذلیل اور قابل نفرت ہے....''۔

غور فرمایئے وہ 1960ء تک فلم دیکھتے رہے اور اس کے بعد تائب ہو گئے۔ لیکن 1960ء کے بعد بھی تمام فلمیں تو لچر اور بے ہنگم نہ تھیں۔ کچھ نہ کچھ تہذیبی جھلکیاں گنگا جمنا (دلیپ کمار) اور شہر اور سپنا (خواجہ احمد عباس) جو 1964-1961ء کے آس پاس بنی تھیں مجھے آج بھی سوچنے پر مجبور کرتی ہیں تو 1970ء کے بعد بنی ہوئی پاکیزہ (کمال امروہوی) اور کبھی کبھی (چوپڑا) بھی صاف ستھری اور یادگار فلمیں ہیں۔ لیکن کلیم عاجز نے یہاں اپنا تجربہ بیان کیا ہے جس کی میں تردید کرنا نہیں چاہتا..... ان کے اس سفر میں وہ سبزی باغ میں سید حسن وثیقہ

نویس (تلہاڑا سے متصل نیانواں گاؤں کے رہنے والے) کی اس دور کی نفیس حویلی میں قیام پذیر ہوئے۔ ان دنوں لوگ اپنے علاقہ کے کسی رشتہ دار کے یہاں ٹھہرتے تھے جہاں انکو خوش آمدید کہا جاتا تھا اور خاطر تواضع ہوتی تھی۔ وہ سید حسن صاحب وثیقہ نویس کے یہاں اس لئے ٹھہرتے کہ اُن کی بہن کی شادی اعظم نانا کے بڑے بھائی سید اطہر حسین نانا سے ہوئی تھی۔ اب ذرا سید حسن صاحب کے بارے میں بھی جان لیجئے۔ ''یہ سید حسن صاحب پٹنہ رجسٹری آفس میں سب سے زیادہ معزز و معتبر باعزت باوقار باوضع باوفا اور بامروت وثیقہ نویس تھے۔ رجسٹرار کے اجلاس سے متصل ان کی گدی تھی جو سب سے صاف ستھری گدی تھی۔ وزنی دری اور چاندنی کا فرش، پیچھے گاؤ تکیہ، آگے صندوقچہ، بغل میں قلمدان، سامنے حاجت مندوں کی نشست کے لئے فرش۔ ایک طرف پان کا ڈبہ دوسری طرف اگالدان، گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے ہوئے کبھی سرخ ترکی ٹوپی کبھی سفید ململ کی دو پلی ٹوپی کبھی سلک کبھی گرم کپڑے کی شیروانی سفید پاجامہ اور موزہ نمایاں موچھوں اور ہلکی داڑھی، تہذیب شائستگی محبت اور مروت کی زندہ تصویر... آپ کے تصور میں کیا ایسے وثیقہ نویس کا خاکہ آسکتا ہے۔ رجسٹری آفس میں جا کر دیکھ لیجئے ہماری نہیں انسان کی تہذیب ماضی کے غیر ترقی یافتہ دور میں کس بلند سطح پر تھی،۔ پورے شہر میں سید حسن وثیقہ نویس معتبر تھے، کتنوں کے کام آنے والے، کتنوں کا کام نکالنے والے، کتنوں کے حال کے پرساں، کتنے مسافروں کے مسافر نواز کتنے مہمانوں کے میزبان اور ان سب کے طلسم کی کنجی وہی رجسٹرار آفس کی وثیقہ نویسی۔ علاقے میں کسی کو مقدمہ کی پیروی کے لئے آنا ہو تو ان کا ٹھکانہ سید حسن صاحب کی چھوٹی حویلی مریضوں کے علاج کے لئے قیام گاہ ان کی چھوٹی حویلی رشتے ناتوں کے مسائل حل کرنے کو آنے والوں کا گھر وہی حویلی، شادیات کا سامان خریدنے کو آنے والوں کا محفوظ مقام وہی چھوٹی حویلی۔ سید حسن صاحب کی اپنی ضروریات کے علاوہ ایک بڑا ہال اور دو ایک متصل کمرے انہی مہمانوں اور وقتی مسافروں کے لئے وقف تھا۔'' مندرجہ بالا سطور میں انہوں نے ایک تہذیب ہی نہیں ایک دور کی تصویر کھینچ دی ہے جب انسانی رشتے بہت مضبوط تھے اور لوگ بے جھجک دوسروں کے دروازے پر اپنا سامان لئے اُتر جاتے تھے جہاں اُن کی حاجت روائی کے ساتھ ان کی پذیرائی بھی ہوتی تھی۔ مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے جب دو ایک لوگ ہمیشہ مہمان ہوتے تھے۔ ایک بستر بند بندھتا

تھا تو دو یا تین بستر بند کھلتے تھے۔ان کے آرام کا خیال کے ساتھ کھانا پینا اوران کے کام کا بیڑا اٹھانا یہ سب روزمرّہ تھا اور مہمانوں کے چلے جانے کے بعد بھی اُن کے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کے لئے فکر رہتی تھی۔

تو میں بات کر رہا تھا فلموں اور فلم بینی کی کہ اعظم نانا کے حوالے سے سید حسن صاحب وثیقہ نویس کی حویلی اوراُن کی خدمت شعاری کا بھی ذکر آ گیا۔

کلکتہ میں اُن کو ڈراما ،تھیٹر فلم اور گانے سننے کا بھی شوق ہوا۔ تو وہ سہراب جی کبرو والا (بعد میں سہراب مودی) ماسٹر محمد حسین، ماسٹر چھیالال، ماسٹر نثار، کجن بائی، مس مہ جبیں ناز، الفنسٹن تھیٹر، الفریڈ تھیٹر سے بھی ان کا واسطہ ہوا۔نامور ایکٹرس اور ایکٹرسوں کا نام نہیں گنوایا لیکن زندگی کے اس دور میں وہ اپنی شامیں انہی کی دید وشنید میں گزارتے رہے لیکن 1945ء میں جب ان کا پٹنہ میں مستقل قیام ہو گیا اور شادی ہوگئی پھر دوکان داری تو وہ سب مشاغل چھوٹ گئے۔لیکن کلکتہ جب بھی جاتے تو پرویز شاہدی کے یہاں قیام کرتے اوران کو فلم دیکھنے کے لئے مجبور کرتے۔

''جب کبھی کلکتہ جاتا تو اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہوکر اسی دن یا دوسرے دن 6/سرکس رینج میں اُن (پرویز شاہدی) کے 2 کمرے کے فلیٹ میں پہنچ جاتا اور وہ باغ باغ ہو جاتے۔ان کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ ایک ملازم اور ایک باورچی کے ساتھ رہتے تھے۔اسی کمرے میں میرا بستر بھی لگ جاتا۔ ان کے کچھ شاگرد بھی آ جاتے اور پھر ان کا کمرہ آباد ہو جاتا۔ میں انگریزی سنیما کا بہت دلدادہ تھا۔شام میں انہیں اکساتا کہ سنیما چلئے۔وہ سنیما کے شائق نہیں تھے۔ بہت کسمساتے منہ بناتے مگر آخر وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتے۔کبھی میٹرو میں کبھی بلٹز میں ہم لوگ سنیما دیکھا کرتے۔وہ پورے سوٹ میں ہوتے اور میں مکمل لکھنوی لباس میں۔ پرویز شاہدی مجھ سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوئے مگر عزیز بہت رکھتے تھے۔سنجیدہ گفتگو کرتے ،مسکراتے مگر زیادہ نہیں ہنستے۔ہاں اگر ان کے ہم مشرب کوئی آ جاتے جیسے معین احسن جذبی تو پرویز شاہدی کا باطنی جوہر نمایاں ہو جاتا تھا۔وہ عظیم آبادی تھے بہاری تھے۔یہ میری بھی کمزوری ہے اور یہ کمزوری پرویز شاہدی کی بھی تھی۔وہ بہاری پن یعنی سچائی ،سادگی یا کھرے پن کے مظاہرے سے باز نہیں

آتے اور واقعی جب وہ منہ کھولتے تو سب کی ہمت جواب دے دیتی۔ جذبی اور علی سردار جعفری صاحب بھی مات کھا جاتے......

تو کلیم عاجز جس ثقافت کے پروردہ وآوردہ تھے اس کا دائرہ وسیع تو تھا لیکن اس کا مرکزہ دینی عقائد دینی شعائر اور دینی فرائض کے ساتھ ساتھ خانقاہوں کی زیارت ،عرس میں شرکت ،پہلوانی اور کشتی آموزی،سیر وتفریح ،ملنا ملانا (جس سے مجلسی آداب سیکھنے کا موقع میسر ہوتا تھا)اور دوسروں کے دکھ سُکھ میں شریک ہونا بھی تھا (جیسا سطور بالا میں تفصیل سے عرض کیا جا چکا)۔کھیتی باڑی کے مشاغل اور پیشے میں منشی اور براہل زیادہ تر ہندو ہی ہوتے تھے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس سے زیادہ اچھی مثال ہندو مسلم ایکتا کی کہیں نہیں ملے گی۔ لیکن جب سیاست کا رنگ بدلا تو دیکھتے دیکھتے رشتے تقسیم ملک کے پہلے ہی تقسیم ہونے لگے۔

اس سیاسی قلابازی کے باوجود محرم اور چالیسواں کے اکھاڑے اور جلوس میں شریک ہونے والے ہندو بھی عقیدت اور احترام کے رنگ میں نظر آتے تھے۔جلوس 173

ایک اور بات ان دنوں کی .....بہت ہی اہم بات تھی کہ پٹنہ بلکہ تمام بہار میں شیعہ سنی اختلافات کی آگ کبھی لگی ہی نہیں (جیسا لکھنؤ اور یوپی کے دوسرے کچھ شہروں کی روایت بن گئی تھی کہ محرم اور چہلم کے موقع پر سر پھٹول اور زدوکوب کے بغیر جلوس کا خاتمہ ہی نہیں ہوتا تھا اور جس میں کبھی خفیہ کبھی اعلانیہ حکومت کا بھی ہاتھ ہوتا تھا۔ پٹنہ کے ایک چہلم کا ذکر اُنہی کی زبانی سن لیجئے۔جس جلوس کی آمد کا اس وقت ماحول تھا وہ اور کچھ ہی تھا لوگ یوں کھڑے تھے جیسے اپنے مقدر کا فیصلہ سننے والے ہیں۔،جیسے بحث ہو چکی ہے جج بھی خاموش سے مدعی بھی مدعا علیہ بھی اور وکیل بھی۔جیسے درد کا ایک سیلاب آنے والا ہے اور سب کا سب اس سیلاب میں بہ جانا طے ہو۔راہ فرار نہیں۔نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن اعظم نانا بھی میرا ہاتھ تھامے خاموش کھڑے تھے.....کچھ ہلکی آوازیں آنی شروع ہوئیں جیسے لوگ ہلکی آواز میں بول رہے ہوں۔تمام بولیاں ایک اتار ایک چڑھاؤ کے ساتھ جیسے ہر کی زبان میں مشین لگی ہوئی ہو یا قانونی طور پر آواز میں فرق پیدا کرنا ممنوع ہو۔اور پھر جلوس کا اصل مجمع سامنے نمایاں ہوا۔خاموش لوگ سر جھکائے نظریں نیچی کئے ننگے سر ننگے پاؤں ،سفید کرتا سفید پاجامہ پیشانیوں سے پسینے کے قطرے عارض پر بہتے ہوئے اور

مجمع کے حلقے میں کچھ لوگ جیسے نشہ میں ہوں ایک عجیب درد کی مستی ایک عجیب جوش میں جیسے اپنے قتل کا پروانہ لئے ہوئے ، قتل گاہ کی طرف جھومتے جھامتے جارہے ہوں ۔ منہ سے کچھ آواز نکل رہی ہے ایک ساتھ ایک لہجے میں ایک زیر و بم کے ساتھ جھک کر اُٹھتے ہیں اور ہر زیر و بم کے ساتھ پھٹے ہوئے گریبان میں کھلی چھاتی پر پڑتے ہیں ۔ جھڑاپ جھڑاپ جھڑاپ چھاتیاں ضربوں سے سرخ اور پھولی ہوئی مگر ہاتھوں کی سخت ضرب سہنے کو سر اُٹھائے ہوئے تیار شاید نئے خون کی گرمی تھی ۔ دھوپ کی شدت پیاس کی شدت جذبۂ محبت کے سامنے پانی پانی تھی ۔ مجھے یاد نہیں کہ اہل جلوس یا اہل جلوس کے دردمند تماشائیوں میں جن میں ڈاکٹر اعظم نانا اور میں بھی شامل تھا، پیاس کی شدت میں بھی کسی کو پانی پیتے دیکھا ہو نہ مجھے کہیں برف کا ٹھیلا دیکھنا یاد ہے نہ پانی کا گھڑا، نہ گلاس نہ جگ ۔ آپ تو سمجھ گئے ہوں گے ۔ یہ چالیسواں کا دن تھا اور حضرت امام کے دلدل کا جلوس تھا ۔ میں نے اہل جلوس میں انھیں بھی دیکھا جنھیں برسوں بعد پہچانا کہ یہ نواب مبارک علی خاں صاحب ہیں ۔ یہ نواب عباس علی خاں ہیں یہ نواب مہدی علی خاں عرف میاں ہیں ۔ یہ نواب علی سجاد ہیں، حکیم سید محمد صالح ہیں ۔ یہ علی اکبر کاظمی ہیں یہ محمود علی خاں ہیں ....نواب احمد علی خاں ہیں اور نواب اسمٰعیل علی خاں عرف جنن صاحب ہیں اور انہیں بھی دیکھا ہے جنہیں بعد میں پہچانا لیکن ان کا نام اب بھول گیا بچے بھی جوان بھی بوڑھے بھی کمزور بھی............لیکن اس وقت توانائی اور ناتوانی کی کوئی تقسیم نہیں تھی ۔ سب کی شہ رگ سے ایک ہی لہو ایک ہی رفتار اور ایک ہی گرمی سے گزر رہا تھا، نہ ننگے سر دھوپ کچھ تپش اثر انداز تھی نہ ننگے پاؤں کے نیچے زمین کی حدت...... حضرت امام حسین کی پیاس سب پر طاری تھی ۔ ان کی شفقت سب پر غالب تھی ۔ وہ اس لذت سے آشنا ہو چکے تھے اور ہر ایک چیز سے ناآشنا تھے میں اس وقت شریعت کی بات نہیں کرتا کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں میں تو اس عقیدت اور محبت کی بات کر رہا ہوں جن کی اہمیت عالم اسلام کے بچے بچے میں جوان جوان میں بوڑھے بوڑھے میں عورت عورت میں مرد مرد میں موجود ہے کہ یہ سب روح کی دھکتی رگ سب کا ایمان ہے سب کا دین ہے ۔"

اپنے والد کے انتقال کے تقریباً 5 برسوں بعد ان کی شادی پٹنہ سیٹی میں ہوئی ۔

انہیں روزی روٹی کی فکر کرنی پڑی اور جو فیصلہ انھوں نے کیا اس سے پٹنہ میں مستقل

قیام کی صورت نکل آئی۔ ورنہ فسادا کتوبر 1946ء کے وقت اگر وہ تلہاڑا میں موجود ہوتے تو اُن کے ساتھ کیا ہوا ہوتا نہیں معلوم۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی والدہ اور بہنوں کی شہادت کا زخم ان کے سینے میں ہمیشہ رستا رہا۔ یہ پوری داستان ان کی زبانی سنئے۔

''یہ بات شروع ہورہی ہے 1945ء سے جب میں نے دنیا کو جھیلنے اُس کا مقابلہ کرنے اور آئندہ اسے شکست دینے اور دیتے رہنے کا فیصلہ کرکے بی این کالج کے سامنے مولوی سلیم صاحب ہیڈ کلرک انکم ٹیکس کی نئی بنی ہوئی دکان کرایہ پر لے کر کچھ پرانی الماریاں رنگ و رغن سے درست کر کے کچھ لکڑی اور لوہے کی کرسیاں اور ایک بے رنگ بنچ کہیں سے لا کر بینت کی شیتل پاٹی (چٹائی) بچھا کر دوکان کے کنارے میں ایک چھوٹی سی صندوقچی لے کر اس کے سامنے ایک چوکی بچھا کر بیٹھ گیا۔ ایک پرانی سنگر مشین خریدی شکور میاں درزی کہیں سے مارے دھکڑے (کھدیڑے) آ گئے۔ 25/روپے ماہوار اور کھانے ناشتے پر انہیں دکان میں رکھ لیا۔ بیوی ایک سائبان تین چھوٹی کوٹھریوں اور ایک بڑے کمرے صحن میں کنواں اور کنارے میں ایک بیت الخلاء والے کھپڑے کے مکان میں رہنے لگی۔ میں صبح کی نماز سے فارغ ہو کر دکان کھولتا، جھاڑو لے کر فرش صاف کرتا اور دوکان کے اندر کا اٹکن چٹکن باہر فٹ پاتھ کے سڑک پر گرا کر جھاڑو پٹکتا ہوا دکان میں داخل ہوتا اور الماریاں جھاڑ کر چوکی پر چھوٹی صندوقچی کے قریب کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ رزق کیا آنے والا ہے کس شکل میں آنے والا ہے اس سے بے نیاز ہو کر اپنے مطالعہ کے مشغلے میں لگ جاتا۔ مختلف شکلوں میں رزق کے سامان آتے اور اس سے گائے کا خالص دودھ اور آٹھ دس روپے بکرے کا اچھا سالن اور سبزیاں خرید کر بیوی کے حوالے کرتا۔ ایک ملازم باہر کے کام کے لئے ایک ماما باورچن اندر کے لئے رکھ کر ٹھاٹھ سے دودھ ملائی اور بیوی کے ہاتھ کا بہترین ذائقہ دار کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتا کسی دن شام کو سفید ململ کا کرتا لٹھے کا پاجامہ اور سلکیا سرج کی شیروانی پہن کر رام پوری سیاہ مخملی ٹوپی سر پر آراستہ کر کے جیب میں ویسٹرن کی گھڑی میں سلوری چین ڈال کر پٹنہ سیٹی کے چوک پر تھوک دکانداروں کے یہاں جاتا اور مارواڑی تھوک فروش آیئے نواب صاحب آیئے نواب صاحب کہہ کر کھڑے ہو جاتے۔ بازار سے کچھ کم شرح میں میرا کپڑے کا سامان درست کر کے رکشے پر رکھ دیتے اور اس کے ایک کنارے پر مجھے بٹھا کر مع

شیروانی پاجامہ ،موزہ جوتا ٹوپی اور گھڑی روانہ کردیتے۔ آئندہ تکیہ والے توشک والے مشہور ہوجانے والے کلیم عاجز چوک سیٹی، بی این کالج ۵ میل رکشہ پر پہنچ جاتے اور پھر چوکی پر صندوقچی کے سامنے اردو اور انگریزی کتابیں رسالے رکھ کر مطالعہ کے لئے بیٹھ جاتے۔ رزق لے کر آنے والے خریدار آتے میری دوکان کو دیکھتے اور پھر میری شکل کو دیکھتے میری وجاہت دیکھتے میری وضع دیکھتے اور مرعوب ہوکر بغیر بحث کئے، مولائی کئے سامان لے کر کیش میمو کے ساتھ قیمت ادا کر کے سلام کرتے ہوئے رخصت ہوجاتے۔ دکان چلتی رہتی وضع داری نبھتی رہی اور خریدار کی شکل میں آنے والے جسٹس بھونیشور پرشاد، جسٹس سرجو پرشاد، نول کشور ایڈوکیٹ، کھدیڑن سنگھ ایڈوکیٹ، چیئر مین ڈسٹرکٹ بورڈ، اور ڈاکٹر ترپاٹھی پریسیڈنٹ جن سنگھ پارٹی اور اُن کی بیوی ڈاکٹر پانڈے آ کراسی بے رنگ لکڑی کے بنچ پر بیٹھتے اور مجھے اپنی بغل میں بٹھا کر سودا خریدتے، منہ مانگا دام تکیہ، توشک، لحاف خریدتے اور میری پیٹھ پر پیار سے ایک دو تھپکیاں دے کر رخصت ہوجاتے۔‘‘

یہاں اپنی دوکانداری اور سڑک پر جھاڑو دینے کے بیان کے ساتھ ساتھ اپنی وضع داری اور شیروانی پاجامہ ٹوپی کو بھی اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ میں شامل کر کے وہ اپنے تہذیبی انسلاکات کو زیر بحث لانا نہیں بھولتے۔ بین السطور یہ مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مغربی اقدار اور تہذیب وثقافت سے خود کو شعوری طور پر دور رکھا۔ یہ بات اُن کی ذات تک تو درست کی جاسکتی ہے لیکن اُن کے بعد اُن کی اولاد اور نسلوں تک بھی کیا ایسا ہی معاملہ رہا؟ اب مغربی ملبوس ضرورت بھی ہے معیار بھی۔

پٹنہ سیٹی کی بجھتی ہوئی روشنیوں اور مٹتی ہوئی قدروں سے اُن کا بالواسطہ تعلق بھی اُن کے دل ودماغ پر انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔ بچپن ہی سے وہ اعظم نانا کے ساتھ لودی کٹرہ اور فصاحت کے میدان میں اُن کے جاننے والوں اور رئیسوں کے مردان خانے کی نشست گاہوں تک طرز گفتگو ادب آداب، اور علمی مسئلے پر بحث مباحث کا مشاہدہ بھی کر چکے تھے۔ تین بھائیوں (قاضی عین الحق، قاضی ریاض الحق اور قاضی سراج الحق (جو تلہاڑا کے مسلم کش فسادات کے دوران اکیلے گہار لڑتے ہوئے پٹنہ پہنچ گئے تھے) کا تذکرہ بھی ہے اول الذکر دونوں کے درمیان اُن کے استاد حفیظ اللہ صاحب (صفیر بلگرامی کے شاگرد رشید حضرت بدر آروی کے ارشد تلامذہ میں سب سے ممتاز)

کے سامنے گفتگولڑانے کافن سیکھنے کی روداد بھی بیان کرتے ہیں۔

یہاں بھی بین السطور میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ رئیسوں اورنوابوں کے مردان خانے یا وسیع وعریض بیٹھک میں بچوں کی تعلیم وتربیت کس نہج پر ہوتی تھی اوراُن کے لئے کیسے استاذ یا اتالیق مقرر کئے جاتے تھے۔افسوس! کہ اب یہ سب باتیں افسانہ بن گئی ہیں ورنہ پٹنہ سیٹی ادب ہی نہیں علوم متدوالہ کا گہوارہ بھی تھا۔افسوس اس بات پر ہے کہ ہم وہ نہیں جانتے جوجاننا چاہئے اور سنی سنائی باتوں پر جواس دورکی خوبیوں کونظرانداز کرکے صرف اس کی خامیوں پرمرکوز رہتا ہے آنکھیں بندکرکے یقین کرلیتے ہیں اور بہت ساری حقیقتیں آنکھوں سے اوجھل رہ جاتی تھیں۔جن میں نقصان ہمارازیادہ ہےاوروں کاکم۔

میں ایک بات اورعرض کردوں۔کلیم عاجز کے یہاں ماضی توہےاس کی یادیں ہیں۔ نوسٹلجیا ہے کیا کروں یہ لفظ کچھ اس طرح مروج ہوگیا ہے کہ اسے لکھے بغیر چارہ نہیں۔لیکن اُن کے یہاں ماضی پرستی نہیں ہے۔وہ اگرلودی کٹرہ کی نشست گاہ کا تذکرہ کرتے ہیں توفتوحہ ریلوے اسٹیشن کے تختہ کی گمٹی والاسن سن کرتی ہوئی چائے اور خستہ کلچے کھلانے والے کوبھی نہیں بھولتے۔ہلسہ، اسلام پور،ڈیانواں اورکرائے پرسرائے کے اہل علم اہل ذوق چائے ناشتہ کے شائق نہ بھی ہوتے تو ان کی رفاقت قبول کرلیتے اوران کی چائے پی کر دل کے دامن وگریباں کوگل بوٹے سے سجا کر اُٹھتے۔دیرتک چٹخارہ لیتے (ص26 پرویز شاہدی نمبر جولائی14 تا15/مارچ،سنگم)

سطور بالا میں جن چند بستیوں کا ذکر ہواوہاں کے لوگ زمین سے گھاس کی طرح یک جان رہتے تھے۔روزمرّہ کی ضروریات کے لئے اور دوسری سہولیات کے لئے فتوحہ ہوکر بہار شریف،راجگیر ،، پٹنہ اورکلکتہ تک اُن کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا۔1946ء کے فسادات اور تقسیم کے بعد کی غیرانسانی سیاست نے وہ بساط ہی الٹ دی جواس کی سالمیت کی ضامن تھی۔

انھوں نے اپنی ماں کے بارے میں تفصیل سے نہیں لکھا ہے۔صرف ان کی شہادت کا بیان ہی ہے یا اُس واقعہ کی روداد جوانہوں نے تلہاڑا کوفساد سے بچانے کی خاطر اُس وقت کی بہار حکومت کے ایک وزیر کے دولت کدہ پرصبح 8 بجے سے سہ پہر 4 بجے تک گزارش اور مسلسل گزارش میں صبراور بےتابی کے درمیان خودکو بےقابوہوتے اورسنبھالتے ہوئے گزاردی۔انہوں نے اپنی

ایک شرارت کا بھی ذکر کیا ہے کہ ایک بار اپنے بہنوئی حمایت صاحب کسی کام سے ہلسہ گئے تو یہ بھی ساتھ ہو لئے کہ سیر وتفریح ہو جائے گی لیکن جب ہلسہ میں شام ہوگئی تو ماں کی محبت نے جوش مارا اور یہ دونوں 10 میل کا فاصلہ طے کر کے پاپیادہ رات گئے تلہاڑا پہنچے۔ وہاں ان کی رگ شرارت پھڑکی تو انھوں نے بالکل دیہاتی گنوار اور بدمعاشوں کی زبان اور لہجے میں اعلان کیا کہ دروازہ کھولو ہم لوگ ڈاکو ہیں......اُس وقت اُن کے زنان خانے کی ڈیوڑھی پر منگلی میاں 45 سال، ہارون عمر 30 سال اور چندو ہارون کا چھوٹا بھائی سب ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اور خوف کے مارے ہارون اور منگلی میاں تو چپ ہو رہے۔ صرف ہارون نے شور مچایا چور ڈاکو، لیکن کلیم عاجز نے جب دوبارہ ڈاکو ہونے کا اعلان کیا تو ان کی اماں نے پہچان لیا ''ارے یہ تو کلیم بول رہا ہے۔'' انھوں نے ماں کی ممتا کے بارے میں سوال کیا ہے کہ اس کا درجہ بڑا ہے یا اس مرد فقیر (جس نے ان کو لسی پلائی اور جس کا ذکر بعد میں آئے گا) کی روحانیت کا، جو انہیں انارکلی لاہور کی خاک چھانتے ہوئے ملا تھا۔''

''مجھے ماں سے بے حد محبت رہی۔ ایسی محبت جو دنیا میں کسی سے نہیں ہوئی۔ لیکن افسوس ہے کہ میں محبت ہی کرتا رہ گیا خدمت نہ کر سکا۔ میری یاد میں وہ صرف ایک مرتبہ بیمار ہوئیں۔ میں پٹنہ میں تھا گھر میں صرف چھوٹی بہن تھی اور ملازمین۔ اماں کو ٹائیفائڈ ہوا۔ ایک مہینہ دیہات میں ذی فراش رہیں۔ علاج واجب ہی واجب تھا۔ مجھے کوئی اطلاع نہیں۔ ایک ماہ بعد دوسرے ذریعہ سے خبر ملی۔ دوڑا ہوا تلہاڑا پہنچا۔ بخار اتر چکا تھا اور اسی روز انھوں نے غذا لی تھی۔ میں جا کر رونے لگا کہ آپ نے مجھے اپنی علالت کی خبر تک نہ دی وہ ہنس پڑیں۔ تمہیں تردد ہو جاتا اسی لئے خبر نہ دی۔'' ....5 سال بعد شہید ہوئیں تو جنازہ اٹھانے کا شرف بھی مجھے نہ بخشا کیونکہ مجھے تکلیف ہوتی اور قبر کا نشان بھی نہ چھوڑا کہ مجھے فاتحہ پڑھنے کی زحمت ہوتی۔ یہ دنیا بھی عجب تماشا گاہ ہے۔ یہاں لوگ جیتے ہیں تو اپنے آرام و تکلیف کو سوچتے ہیں لیکن کچھ بے وقوف ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندہ بھی رہتے ہیں تو دوسروں کے آرام کے لئے اور مرتے بھی ہیں تو دوسروں کے آرام کا ہی خیال رکھتے ہیں۔

..........اور غیرت اور اپنا کام کر گئے نہ انتظام غسل نہ اہتمام تکفین۔ نہ جنازہ اٹھانہ

مزار بنا لیکن ایک جشن رہا۔جشن کے ساتھ زندگی اور جشن کے ساتھ موت۔موت کے وقت بھی تنہائی نہ رہی اور موت کے بعد بھی تنہائی نہیں۔خلوت قبر اور گوشہ مزار کا کیا ذکر۔ایک ایک ایوان ہے اوران ایوانوں میں ان مجلسوں میں ان انجمنوں میں نہ کوئی صدر ہے نہ کوئی میسر مجلس ہے نہ کوئی امیر ہے نہ غریب ہے۔نہ کوئی کسی کا دشمن ہے نہ مخالف ہے۔ایک کا ایک فدائی ایک کا ایک جاں نثار۔ان انجمنوں کا دروازہ اگر کھول سکتے ہیں تو کھولئے۔کھول کر جھانکئے۔کوئی کسی کے سینے سے چمٹا ہوا ہے کوئی کسی کے گلے سے لگا ہوا ہے۔کسی نے کسی کا پاؤں پکڑ رکھا ہے کوئی ہاتھ سے لپٹا ہوا ہے......ماں جب زخم کھا کر گری تو پندرہ سالہ بیٹی ہائے اماں، کہہ کر اماں پر گر پڑی اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی رخصت ہوئیں۔ایک لطف کا منظر اور دیکھئے جب زندگی کی نا امیدی ہو گئی۔بہت سی ماؤں نے بہت سی بیٹیوں نے بہت سی بہنوں نے قرآن نکالا اور رحل نکالا اور قطار سے رحل پر قرآن رکھ کر ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے زور زور سے قرآن خوانی میں مصروف ہوگئیں۔موت آئی اور ایک طرف سے دو تین چار پانچ چھ سات دس بیس تیس چالیس .....لیکن آخر آخر تک نہ ایک دوسرے سے ہاتھ چھوٹا نہ زبان بند ہوئی۔موت بھی حیران رہ گئی۔اس کی آنکھوں میں چکا چوند آ گئی یہ گھروں میں جھاڑو دینے والی بیٹیاں، یہ قاعدہ بغدادی اور عم سپارہ پڑھنے والی بہنیں.... یہ پان چبانے والی اور زردہ پھانکنے والی بیبیاں موت کے سامنے اتنی دیدہ دلیری، اتنی بے نیاز اور اتنی خندہ جبیں ہو جائیں گی؟ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے آواز میں آواز ملا کر قرآن پڑھتے ہوئے یوں اس کا استقبال کریں گی جس طرح تقریب میں منڈوے کے نیچے بیٹھ کر سر میں سر ملا کر گیت گاتی ہوئی گھر میں آنے والے نوشے کا استقبال کرتی ہیں۔''

اور تلہاڑا پر بربادی کے بادل جب منڈلا رہے تھے وہ اُس وقت جس دربار میں دستگیری کے لئے حاضر ہوئے اس روداد بھی انہی کی زبانی (صبح نو مارچ۔اگست 1961ء)

جب ہزاروں سروں پر موت منڈلا رہی تھی تو اس وقت جو سب سے بڑے چارہ ساز بنائے گئے تھے ان کے قبضۂ اختیار میں 'تریاک' دے دیا گیا تھا تاکہ وقت ضرورت جہاں حاجت ہو استعمال کیا جائے اور اس کے منتقل کرنے کا سامان بھی ان کے زیر اقتدار تھا۔میں کسی طرح گرتا پڑتا اُن کی خدمت میں بہ مشکل حاضر ہوا۔صبح کے 8 بجے تھے، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ صاحب

ابھی وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ میں ان کے ڈرائنگ روم میں بدترین قسم کی اضطرابی کیفیت کے ساتھ ٹہلتا رہا آنسو تو خشک ہو چکے تھے قدموں میں لرزش اور ہاتھوں میں لرزہ البتہ قائم تھا اور ایک ایک منٹ قیامت کے برابر گزر رہا تھا کہ نہ معلوم کیا ہو رہا ہے اور کیا نہ ہو جائے۔ نو بج گئے۔ معلوم ہوا صاحب ناشتہ کر رہے ہیں۔ تقریباً دس بجے برآمد ہوئے۔ صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ میں نے ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ جتنی طاقت زبان میں رہ گئی تھی صرف کر دی۔ وہ خاموش سنتے رہے کچھ دیر کے بعد پوچھا ''یہ ٹرک کہاں بھیجنا ہے تلہاڑا، تلہاڑا'' اللہ اکبر نا ممکن ہے وہاں تک پہنچانا ہی ممکن نہیں'' حضور پہنچانا بھی آپ کے قبضہ قدرت میں ہے'' کیونکر ممکن ہے؟ آپ چاہیں تو انتظام ہو سکتا ہے۔ اچھا غور کرنے دیجئے غور ہوتا رہا وقت گزرتا رہا۔ دوسرے کام بھی ہوتے رہے اور ہر دس منٹ پر میں انہیں مخاطب کرتا رہا۔ حضور ٹھہریئے صاحب! کیا آپ نے بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے لیکن! آفریں ہے ان وزیر با تدبیر کی خدمت گزاری پر کہ سہ پہر بلکہ چار بجے تک انہوں نے اس معاملہ کی گمبھیرتا کو نہ سمجھا نہ کوئی بھی عملی قدم اٹھایا۔ وہ چاہتے تو عالی مرتبہ پولیس افسران یا دانا پور فوج کے صاحب اقتدار سے مشورہ تو کر سکتے تھے یا اس وقت کے انگریز گورنر سے ہی صلاح لے سکتے تھے وہ اپنے کسی ملاقاتی سے مل کر ان کی دعوت شبینہ اور مرغن غذاؤں کی فہرست سن کر لطف لیتے رہے اور چار بجے کچھ لٹے پھٹے لوگ ایک ٹرک میں تلہاڑا سے کسی طرح جان بچا کر اترے اور انہیں انجمن کے لٹنے کی خبر دی۔ اب اُن سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور انہوں نے ڈاکٹر صاحب وزیر موصوف کو اُن کی بے حسی کم ہمتی اور بے عملی پر اپنے دل کا غبار نکال لیا۔ لیکن غبار تو نکلا ہی نہیں وہ تو برسوں آنسوؤں آہوں کی صورت انہیں صدمہ سے چور کرتا رہا۔ مجھ سے ایک مرتبہ بر سبیل گفتگو کلیم عاجز صاحب نے ان وزیر موصوف کا نام بتا کر میرے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔ یہ وہی ڈاکٹر صاحب وزیر موصوف ہیں جن کے بارے میں ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب آزادی ہند Inidia wins freedom میں لکھا ہے کہ بہار کا وزیر اعلیٰ انہی کو ہونا چاہئے تھا اور یہ کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی اور حق تلفی ہوئی۔ بعد میں اُس وقت کے وزیر اعظم نے انہیں مرکزی کابینہ میں شامل کر لیا تھا۔ تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ موجودہ وقت کے اکابرین اور اعیان سلطنت بھی انہی گذشتہ دور کے ناموران سے مختلف نہیں ہیں جن کو طاقت استعمال کرنے کا

موقع میسر ہوا ہے وہ بھی اپنے فرائض منصبی کو بجالانے سے ہچکچاتے ہیں مبادا اُن پر فرقہ پرستی کا الزام نہ آجائے اور یہ نہیں سوچتے کہ اُن کے اپنے فرقے کے تئیں بھی ان کے کچھ حقوق واجب الادا ہیں جن کو بجانہ لانے سے اُن کو زمانہ کیسے یادرکھے گا۔ عاقبت تو ان کی خراب ہوگی ہی جس کی طرف اُن کا کچھ دھیان ہی نہیں ہے۔

خدائے تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو طرح طرح سے آزماتا رہتا ہے تب کہیں جا کر اُس کی شخصیت شعلوں میں تپ کر کندن بن کر نکھرتی ہے۔ اکتوبر 1946ء کے تلہاڑا مسلم کش فسادات جس میں کلیم عاجز کی ماں بہن سمیت کل 23/افراد کی جان گئی تھی کی آگ ابھی بجھی بھی نہیں تھی ان کی آنکھوں سے دھند چھٹی بھی نہیں تھی کہ دسمبر 1946ء میں ان کو ایک اور صدمہ جھیلنا پڑا۔ چھوٹے بھائی نسیم گھر سے غائب ہوگئے۔ جمعہ کا دن تھا دن کو کھانے بیٹھے تھے تو میاں نسیم غائب۔ انہوں نے سوچا کہ کہیں دوستوں میں ہوں گے لیکن جب رات گئے تک وہ جہاں جہاں تلاش کرسکتے تھے تلاش کرنے پر بھی نہیں ملے تو اُن کی تشویش وحشت میں بدل گئی۔ دسمبر کی ہڈیوں میں اترنے والی ٹھنڈک میں اُن کے حواس گم تھے کہ کیا کریں نہ کریں۔ اُن کے ایک عزیز ڈاکٹر امتل اکرمی جو آرہ سے تشریف لائے ہوئے تھے کی صلاح پر میاں نسیم کا بکس کھولا گیا تو اس میں ایک خط ملا اور کچھ کپڑے غائب صندوقچی سے پچاس روپے انہوں نے لئے تھے اور خط میں اس طرح کا مضمون تھا۔ ''بھیا! آپ کو حادثات نے اتنا متاثر کیا کہ میں اپنی کفالت کا بار آپ پر ڈالنا ظلم سمجھتا ہوں۔ آپ اپنی صحت کی فکر کیجئے۔ میں جماعت اسلامی کے صدر دفتر کی طرف جارہا ہوں'' اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ڈاکٹر امتل اکرمی صاحب جو گھڑی دو گھڑی کے لئے اُن سے ملنے آئے تھے اور جو لباس پہن کر آئے تھے وہی ان کا سامان تھا لیکن وہ ان کے ساتھ امرت سر ہوتے ہوئے سیالکوٹ روانہ ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ مولانا مودودی امیر جماعت اسلامی کا قیام سیالکوٹ میں تھا جبکہ جماعت کا صدر دفتر دارالاسلام واقع تحصیل پٹھان کوٹ تھا وہ امرتسر میل سے 4 بجے صبح روانہ ہوئے اور دن کے گیارہ بجے امرتسر پہنچ گئے۔ یہ تقسیم ہند سے تقریباً 8 ماہ پہلے کی بات ہے اس لئے ہر سمت پگڑیاں ہی پگڑیاں تھیں کلاہ دار سڈول پگڑیاں بھی اور بے کلاہ والی لٹ پٹی پگڑیاں بھی۔ قلیوں کی خاصی تعداد بھی پگڑی دار تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے جس قلی کو

آواز دی اس کی شکل اس کا لباس کلیم عاجز کے حافظے سے محو نہ ہوسکا۔اس کی عمر تقریباً 60 سال رہی ہوگی۔ پنجابی ہوتے ہوئے بھی اس کا قد پنجابیوں جیسا نہیں بلکہ بہ مشکل 5 فٹ 3/ انچ رہا ہو گا۔سر کے بال سیاہ تھے مگر داڑھی مونچھ کے بال سفید ہو چکے تھے۔اُن سے اُجرت اٹھنی طے ہوئی۔اس نے چلتے چلتے سوال کیا کہ وہ کہاں سے آرہے ہیں اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ پٹنہ بہار سے تو وہ ایک دم ٹھہر گیا۔اورانہیں عجیب نظروں سے دیکھتا رہا جب اُس قلی نے ان کا سامان سیالکوٹ جانے والی گاڑی کی برتھ پر رکھا اور بستر کھول کر سیٹ پر بچھا دیا تو حسب وعدہ اٹھنی لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تم بہار سے آئے ہو اور سیالکوٹ جارہے ہو اگر تم میرے گھر چلتے تو بہار بھیجنے کے لئے جو دو دھلی ہوئی پگڑیاں رکھی ہیں انہیں دیتا۔ میں نے ایک کوٹ اور پگڑی بغیر دھلی ہوئی ریلیف میں دے دی کیونکہ اس وقت میرے پاس یہی دو چیزیں میسر تھیں۔غور فرمایئے انسان دوستی نے امیروں کے محلوں اور دولت مندوں کے ایوانوں سے نکل کر کہاں پناہ لی تھی۔امرتسر کے ایک قلانچہ مزدور کے دل میں۔اُن کے اصرار پر بھی اس نے اپنی اجرت نہ لی او رسلام علیکم کہہ کر رخصت ہو گیا۔کلیم عاجز نے اس واقعہ کو یاد کر کے لکھا ہے'' میں خوش ہوں کہ اس کا یہ احسان میرے سر پر رہ گیا۔اگر اس نے اپنی مشقت کی اٹھنی لے لی ہوتی....تو مجھے امرتسر یاد رہتا نہ وہ قلی۔مگر اس کے ادنیٰ احسان نے اسے میرے خیالات کی دنیا میں غیر فانی بنا دیا۔تماشہ ہے کہ اس نے آٹھ آنے میں ایک سودا تو کیا لیکن وہ نہیں جانتا کہ کیا سودا کیا۔اس نے ایک اٹھنی مجھے بخشی اور مجھے عمر بھر اپنی شاعرانہ کمائی کا ایک حصہ اس کی یاد کو نذر کرتے رہنا ہے۔ پتہ نہیں منافع کس کی گرہ میں رہا میری یا اس کی۔شاید میری ہی گرہ میں۔اگر وہ زندہ ہوگا تو مجھے بھی بھول گیا ہوگا اور ممکن ہے بہار کو اور بہار کے اس حادثہ عظیم کو بھی بھول گیا ہو۔لیکن مجھے صرف اس کی اٹھنی ہی یاد نہیں، مجھے امرت سر کا اسٹیشن یاد ہے جو اس کی دن رات کی مشقتوں کی آماجگاہ ہے وہ پلیٹ فارم یاد ہے جہاں اس کے ننگے پاؤں موسم کے اثرات سے لاپرواہ سرد و گرم زمانہ سے بے نیاز گردش میں رہا کرتے ہوں گے۔اس کے شکن آلود سخت ہاتھ اور اس کا بے شکن چہرہ یاد ہے۔اس کی سفید داڑھی اور سیاہ بال یاد ہیں۔اس کا میلا پائجامہ اور گیروا کرتا یاد ہے اور سب سے زیادہ مجھے اس کی نگاہیں یاد ہیں جو میرے ہاتھ اٹھنی دیکھ کر اس نے میرے چہرے پر ڈالی تھی۔.....وہ تو رخصت

ہوگیا اور میں دیر تک پلیٹ فارم کے ہجوم میں گم ہوتی ہوئی اس مرد مستغنی کی پشت دیکھتا رہا جس کا ظاہر کتنا ہیچ مقدار اور باطن کس قدر بیش قیمت تھا.....کوئی بات تھی جس نے اس جم غفیر میں اسے نمایاں رکھا میں دور تک اسے دیکھتا رہا وہ اوجھل ہوگیا تب بھی میں ادھر ہی دیکھتا رہا۔میری آنکھیں تھک گئیں اور وہ غم جسے میں نے اب تک اپنی پوری قوت سے دبا رکھا تھا زنجیریں توڑنے لگا۔(صبح نو ۶۰۔۶۱ ایضاً)''رونا دل کو سنوار دیتا ہے ٹھیک جس طرح برسات چاندنی رات کو نکھار دیتی ہے لیکن نہ ہر وقت کے آنسو اچھے لگتے ہیں اور نہ ہر موقع پر ضبط کام آتا ہے۔اگر میں اس قلی کے سامنے رونے لگ جاتا تو مضحکہ خیز تماشا بن جاتا لیکن پلیٹ فارم پر اگر کچھ دیر تک یوں ہی دوڑتا رہتا اور آنسوؤں کے لئے گوشہ نہ تلاش کرتا تو دیوانہ ہوجاتا۔عام طور سے کہا جاتا ہے کہ بڑا آدمی وہ ہے جو بڑا سے بڑا غم جھیل جائے مگر اُف نہ کرے....(ایضاً)

سیالکوٹ پہنچ کر بھی وہ اس دل نواز قلی کے خیالوں میں ڈوبے رہے کہ ڈاکٹر امتل نے اُن کو جھنجھوڑا جن کے یہاں جانا تھا رات گئے اُن کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا۔ایک نان بائی کی دکان میں پہنچے۔اس نے سمجھ لیا کہ یہ باہر سے آئے ہیں تو تازہ بہ تازہ بنا ہوا گوشت اور گوبھی کا پکا ہوا سالن اور گرم گرم روٹیاں اس محبت اور خلوص سے کھلائیں کہ وہ آج تک اُس کا ذائقہ نہیں بھول سکے۔اور یہ لوگ اپنے میزبان قاضی حمید اللہ صاحب کے دولت کدہ پر پہنچ ہی گئے جہاں پھر دسترخوان بچھا اور یہ لوگ مسجد گئے جہاں چند اور لوگوں سے تعارف ہوا۔لیکن صبح طلوع آفتاب کے ساتھ احمد دین صاحب کے یہاں سے اُن کی طلبی آگئی اور وہ لوگ اُن ہی کے بھیجے ہوئے تانگے پر سوار ہو کر اُن کے یہاں پہنچ گئے۔یہ اے ڈی اظہر یا احمد دین اظہر عربی فارسی کے ماہر ڈاکٹر اقبال کے ہم جلیس قانون کے بیرسٹر اور عارضی حکومت میں وزیر مالیات لیاقت علی خاں کے سکریٹری کے عہدہ پر فائز رہ چکے تھے۔اُن کی پذیرائی جس طرح وہاں ہوئی اور جس طرح کا ناشتہ پیش کیا گیا وہ اُن کے لئے یادگار تھا۔اظہر صاحب سے دوران گفتگو جب کلیم عاجز نے انہیں بتایا کہ فسادات سے پٹنہ تو اتنا متاثر نہیں ہوا اصل غارتگری تو مضافات میں ہوئی تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ پٹنہ کے باشندہ ہیں اور فسادات سے متاثر نہیں ہوئے۔لیکن جب پڑھائی کے بارے میں سوال وجواب ہوا تو ڈاکٹر امتل صاحب نے ان کے پڑھائی میں جی نہ لگنے کی وجہ بتا دی کہ اُن کے والد کا انتقال

کچھ دنوں قبل ہو چکا تھا اور والدہ فسادات کی نذر ہوئیں تو اظہر صاحب جیسے جہاندیدہ بھی گھبرا گئے اور جب امتل صاحب کے والدہ کے ساتھ گھر کے 23/افراد کے قتل کی خبر دی تو ان کے ہاتھ سے حقے کی نے چھوٹ گئی۔ کچھ دیر تک وہ پریشان ادھر سے اُدھر ٹہلتے رہے پھر خود پر قابو پا کر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ اس ذہنی تکدر کو دور کرنے کی کوشش میں کلیم عاجز کی صحت کا مذاق بھی اُڑاتے رہے۔ اُن کے ایک بھائی نے اُن کی شیروانی پر اپنا اوور کوٹ ڈال دیا۔ اور جب اظہر صاحب کو نسیم کی گمشدگی کا علم ہوا اور یہ بھی کہ وہ مراد پور میں ابوالاعلیٰ مودودی کے یہاں مل سکتے ہیں تو اپنی گاڑی میں لے کر روانہ ہوئے۔ راستہ بھر شہر کے مقامات اور شہر سے باہر کے علاقوں کی خصوصیات بھی بتاتے رہے۔ دن کے گیارہ بجے وہ مراد پور پہنچے۔ اظہر صاحب کی شناسائی مودودی صاحب سے کافی پرانی تھی انہوں نے یہاں نسیم کے بارے میں بتایا کہ وہ یہاں نہیں آئے ہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے صدر دفتر واقع پٹھان کوٹ گئے ہوں۔ اسی خبر نے کلیم عاجز کو سنبھالا دیا اور کچھ دیر کے بعد انہوں نے اجازت مانگی اور وہاں سے رخصت ہوئے۔ اظہر صاحب نے بتایا کہ پٹھان کوٹ جانے کے لئے انہیں پہلے لاہور جانا ہوگا وہاں رات بھر قیام کر کے دوسرے دن پٹھان کوٹ جاؤ چنانچہ وہ انہیں سیالکوٹ کے بس اڈے پر چھوڑ گئے اور دہلی کا اپنا بتا دے کر کہا کہ جب بھی موقع ملے مجھ سے ملو۔ مودودی صاحب کے بارے میں کلیم عاجز کی یہ رائے تھی سنتے چلئے کہ وہ جتنے اچھے اور جس بلند پایہ کے مصنف ہیں اُس رتبے کے خطیب اور مقرر نہیں۔ اس معاملہ میں اظہر صاحب کا پلڑا بھاری رہا کہ وہ زبان کے ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ گفتگو کے بھی ماہر ہیں۔ اُن کا پرزہ جیب میں احترام سے رکھ کر وہ اُن سے گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے ''اس خدا پرست اپ ٹو ڈیٹ صاحب جس کا لباس کلیسا کا تراشا ہوا مگر دل کعبہ کا پروردہ تھا جس کی صورت مغربی مگر سیرت حجازی تھی اور جس کے چھ چھ فٹ کے خوش وضع خوش پوش بھائی اسی پردیسی کا سامان قلیوں کی طرح اپنے اپنے کندھوں پر اُٹھا کر ایسے خوش ہوں جیسے اپنے گھر کی لٹی ہوئی دولت اٹھا رہے ہوں۔''

جب وہ سیالکوٹ سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے تو دن کے ۳ بج چکے تھے۔ راستے کے دلکش مناظر پر اُن کی نگاہ تو پڑتی لیکن وہ اپنی دھن میں اور نسیم کی تلاش میں اس طرح ڈوبے

ہوئے تھے کہ اُن کی جانب دھیان ہی نہ دے سکے۔ لاہور پہنچ کر ایک تانگہ میں سوار ہو کر انارکلی کے ایک کشادہ پھاٹک والے ہوٹل میں اترے۔ وہاں استقبالیہ پر اُن کی نگاہ میز پر رکھے ایک لکڑی کے بکس پر پڑی جس پر موٹے حروف میں لکھا تھا: ''برائے مظلومان بہار''۔ یعنی فسادات بہار کے لئے اہل لاہور عملی امداد سے غافل نہ تھے۔ ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہ تھا۔ شاگرد پیشہ میں ایک خالی کوٹھری میں ان کو ٹھہرانے کی پیش کش ہوئی لیکن جب رجسٹر میں نام اور پتہ کا اندراج ہوا تو منیجر صاحب کا رویہ ہمدردی سے لبریز ہو گیا اور انھوں نے اپنے کمرے میں قیام کی تجویز پیش کی۔ لیکن یہ لوگ اس کوٹھری میں ہی رکے۔ ایک مظلوم بہار کے لئے یہ جذبہ کسی ایک خاص جگہ نہیں بلکہ سیالکوٹ سے لاہور پٹھان کوٹ ہر جگہ کلیم عاجز کو کچوکے لگا تا رہا۔ اور اُن کی ہمت افزائی بھی کرتا رہا۔ انسانیت پر اُنکا ایمان متزلزل نہیں ہوسکا وہ اسی طرح اپنے وجود کی تمام تر توجہ سے میاں نسیم کی تلاش میں لگے رہے۔ اس کوٹھری میں ایک ہی چار پائی تھی لیکن فوراً دوسری چار پائی بھی مہیا ہو گئی اور گرم پانی بھی۔ وضو کر کے ان لوگوں نے نماز ادا کی اور کلیم عاجز صاحب ڈاکخانہ کی تلاش میں انارکلی کے بازار سے گزرنے لگے۔ اپنے بیان میں وہ شہزادہ سلیم کی انارکلی، امتیاز علی تاجؔ کے ڈرامے انارکلی کے ساتھ ایک ہوش وخرد سے عاری مرد بزرگ کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جو اپنی دس گیارہ سال کی انارکلی کو جلے ہوئے ملبوں اور ویران کھنڈروں میں پکارتے پھرتے تھے۔ اپنی یادداشت کو کھولتے ہوئے خود کلامی اور خاموشی کے درمیان وہ ایک بڑی دوکان کے سامنے آ گئے جو درحقیقت ایک آئینہ خانہ تھا۔ وہ ٹھٹھک کر آئینے کی دکان پر کھڑے ہو گئے خود کو دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ ایک دیکھنے والے کو دیکھ کر جو انہیں گہری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص ایک فقیر تھا جس کے سر کے بال کندھوں سے نیچے آ گئے تھے اور جس کا سرخ وسفید رنگ کمہلا کر گندمی ہو چکا تھا۔ داڑھی سینے پر پہنچ رہی تھی۔ پاؤں میں گھٹنوں سے ٹخنوں تک اور ہاتھوں میں کلائی سے کہنیوں تک موٹے موٹے درجنوں آہنی کڑے پڑے ہوئے تھے۔ ننگا بدن، کمر میں ایک موٹی کملی پڑی ہوئی اور ایک موٹی زنجیر ایک پاؤں کے سب سے نیچے والے آہنی کڑی سے بندھ کر کندھوں اور گردن سے گزرتی ہوئی دوسرے پاؤں کے سب سے آخری کڑے سے بندھی ہوئی تھی اور وہ دونوں آنکھوں سے دونوں طرف کی زنجیر تھامے ہوئے متبسم ہونٹوں اور مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھ رہا

تھا۔اس کی بھیانک صورت اور عجیب وغریب ہیئت اور لباس نے ان کو ڈرایا تو نہیں مگر چونکا دیا۔ وہ گزرا نہیں مگر کھڑا ہو کر انہیں ہی دیکھتا رہا۔انھوں نے جیب سے ایک دونی نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔مگر اس نے کہا ''لسی پینا ہے'' وہ لسی پلانے کے لئے انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔وہ ایک گلی میں مُڑ کر انہیں ایک پنجابی لسّی کی دکان پر لے گیا جہاں لوگ تقریباً ایک بالشت لمبے اور پانچ پانچ انچ چوڑے گلاس میں لسی پی رہے تھے اور چھ آنے فی گلاس کے حساب سے دام دے رہے تھے۔فقیر نے دو گلاس لسی کی فرمائش کی اور کلیم عاجز صاحب کے انکار کے باوجود، دو گلاس لسی کی فرمائش بحال رکھی اور ان کے ہاتھ میں ایک روپے کا سکہ دھرا ہی رہ گیا کہ فقیر نے ایک روپیہ جو غالباً چاندی کا تھا دکاندار کے حوالے کر دیا۔انھوں نے بہ اکراہ گلاس ہاتھ میں لیا اور اس فقیر کے 'پی جا' پر لمبے لمبے گھونٹ لے کر ختم کی۔فقیر نے اُن کے ہاتھ سے گلاس لے کر دوکاندار کو دیا اور سڑک پر پہنچ کر ایک اشارہ کیا '' جا اپنے کام سے لگ جا'' اور بھی کچھ جو انہیں یاد نہیں رہا اور وہ سڑک کی دوسری جانب مڑ کر دونوں ہاتھوں سے دونوں طرف زنجیر تھامے ہوئے جھومتا جھامتا روانہ ہو گیا۔کلیم عاجز لکھتے ہیں: ''عقل اگر اجنبی کو نہ پہچانے تو وہ ناشدنی ہے اس لئے کہ عقل کا کام ہی پہچان اور تمیز ہے لیکن اگر وہ اپنے پہچاننے والے کو نہ پہچانے تو بالکل گردن زدنی ہے۔ .... یہ عقل مٹی سونگھ کر ہزاروں فٹ نیچے زمین کی تہہ میں تیل کے چشموں کو دیکھ لیتی ہے لیکن یہی عقل انسان کا چہرہ دیکھ کر چہرہ سے صرف نو انچ کے فاصلہ پر اسکا دل نہیں دیکھ سکتی۔(ایضاً صبح نو......)

انھوں نے اس فقیر کے بہاری ہونے (جیسا کچھ لوگوں کا خیال) سے انکار کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ کوئی خدارسیدہ بزرگ تھا کہ انارکلی بازار میں آئینہ خانے کے پاس ہزاروں آنے جانے والوں کے درمیان اس کی توجہ خاص، ان کی پیاس کا احساس، لسی کی دعوت، مفلسی کے باوجود مٹھی سے روپے نکال کر دینا، رخصت کے وقت مبہم الفاظ میں اُن کے مقصد کا بات کرنا اس کی روحانیت اور خدارسیدگی کے ثبوت ہیں۔

جب یہ بات ان کی سمجھ میں آتی تب تک وہ مرد فقیر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔اور ہر چند کہ وہ اس کی تلاش میں دوڑتے رہے وہ نہ ملا۔اس فقیر کی روحانیت نے انہیں پہچان لیا تھا اور انہیں ماں کی یاد دلا دی تھی۔اپنے بیانئے میں یہاں پر وہ ماں کی یادوں کو جگاتے ہیں اور اُن کی

شہادت کا بیان کرتے ہیں۔ دراصل وہ کوئی بات کرتے کرتے کسی اور طرف بھٹک جاتے ہیں۔ اُسے فلیش بیک ٹلٹک کہہ لیجئے یا آزاد تلازمہ خیال۔ان کا ذہن اپنے موضوع پر مرکوز رہ کر بھی کئی دوسری یادوں کو سمیٹنے لگتا ہے۔اس لئے پٹنہ سے لاہور تک کا سفر نامہ یادوں کی بازگشت سے اس طرح بھرا ہوا ہے کہ یہ سفر کی روداد کم ہے اور یادداشت یا ڈائری کے اندراجات کی تحریر زیادہ ہے۔

آگے بڑھ کر آخر، ڈاکخانہ مل ہی گیا اور وہ تار گھر تک پہنچ گئے جہاں شیروانی پر لمبی قندھاری ٹوپی پہنے سرخ وسپید رنگ کے ایک بزرگ جوجگر صاحب کی شکل کے چھ فٹ سے زیادہ قد وقامت کے بیٹھے تھے۔انہوں نے تار کا مضمون لکھا ''کہ نسیم اب تک نہیں ملے تلاش جاری ہے'' اوران کی طرف بڑھا دیا۔انہوں نے تار کا مضمون اور پتہ پڑھتے ہی کاؤنٹر کا دروازہ کھول کر انہیں اندر بلاکر کرسی پر بٹھایا اور مخاطب ہوئے آپ بہار کے رہنے والے ہیں؟ جی ہاں بدقسمتی سے، کیا حال ہے؟ آپ نے کیا سنا ہے؟ بہت کچھ سن چکا ہوں اور سننا چاہتے ہیں۔ وہ ہڑبڑا کر کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے، نہیں کہہ کر پنسل سے تار فارم کے بقیہ خانے بھرنے لگے تو پنسل اتنے زور سے دبائی کہ اس کی لیڈ ٹوٹ گئی۔کم بخت انھوں نے پنسل کو زمین پر دے مارا۔قلم لیا۔ ہاتھ میں رعشہ تھا اور ہونٹ دانتوں میں دبے ہوئے۔انھوں نے ٹکٹ کا چارج لکھ کر ان کی طرف بڑھا دیا، انہوں نے رقم ادا کی۔ انہوں نے مہر لگا کر رسید دی اور سلام کر کے رخصت ہوگئے۔ دوبارہ ان دونوں نے کسی کی طرف نہ دیکھا۔دونوں ایک دوسرے سے خوف زدہ تھے۔کلیم عاجز پر تھکن غالب ہو چکی تھی۔صبح بھی آنسو شام بھی آنسو اور وہ اس لئے چھپ رہے تھے کہ ایک قندھاری بڈھا ایک بہاری لڑکے کے آگے رو پڑے تو موت اس کمزوری سے اچھی ہوگی (ایضاً صبح نو) آگے دیکھئے ''خوشی اور غم قطعاً ہم رتبہ نہیں۔غم ایک مستقل حقیقت ہے اور خوشی ایک پرچھائیں۔غم اور خوشی بلا شبہ فنا ہونے والی کیفیات ہیں مگر انہیں ہم وزن حقیقتیں نہیں کہا جاسکتا خوشی کا اثر خوشی حاصل ہو جانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔غم کا اثر غم کے آنے کے بعد شروع ہوتا ہے اسی لئے دونوں کی زندگیوں میں بڑا فرق ہے۔خوشی کی حیات بہت مختصر غم کی زندگی بہت طویل، خوشی رفتنی وگذشتنی ہے،غم رفتنی وگذشتنی نہیں۔(ایضاً صبح نو)

میں مندرجہ بالا خیالات پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔لیکن غم کو بھلا کر زندگی کرنا بڑی بہادری

ہے دل والے کا کام۔رات کے نو بجے وہ ڈاکخانہ سے تار دے کر واپس ہوئے۔اور تیز سردی میں تھکن کے مارے دودھ بسکٹ کھا کر نماز کے بعد پلنگ پر دراز ہو گئے۔مگر منزل کوسوں دور تھی۔رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ نسیم سیالکوٹ میں نہیں ملے،قصبہ مراد پور میں مودودی صاحب کے یہاں نہیں ملے،اب پٹھان کوٹ میں ملنے کی توقع ہے۔اگر وہاں بھی نہیں ملے تو؟ غرضکہ اسی ادھیڑ بن میں رات گزر گئی۔صبح ہوئی تو ناشتہ کے بعد تیز بلکہ بہت ہی تیز ہڈیوں میں گھس جانے والی سر دہواؤں میں تانگہ پر بیٹھ کر یہ دونوں بس اڈے پہنچے۔ڈاکٹر امتل سوٹ میں تھے،کلیم عاجز شیروانی اور ٹوپی میں حسب عادت دوسرے مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے جنہوں نے سوٹ اور کوٹ مفلر اور دستانے اور عورتوں نے مختلف قسم کے رنگین پیراہنوں پر گرم لباس پہن رکھا تھا۔انہیں بہت شاندار بس ملی۔اندر کی نشستیں نرم،آرام دہ،پٹھان کوٹ جموں وکشمیر کے دروازہ ہیکہ وہاں جانے کے لئے یہاں سے گزرنا پڑتا ہے۔سڑک اور دور یہ مناظر بہت ہی جاذب نظر۔ہر دو چار سو قدم پر سنگتروں کے ڈھیر۔راستے میں پا پیادہ مسافر بھی ملے۔2-2، 4-4، 6-6 مسافروں کی ٹولیاں۔حقہ پیتے ہوئے راستے طے کرنے والوں کی سٹک بار بار گشت کرتی۔8 بجے یہ لوگ لاہور سے نکلے تھے اور ظہر کے وقت سے کچھ پہلے ۹ بجے روانہ ہونے والی بس سے پٹھان کوٹ ریلوے اسٹیشن کے قریب پہنچ گئے۔ان دنوں پٹھان کوٹ ایک قصبہ تھا اور ریل کا اسٹیشن بھی معمولی سا ہی۔وہاں سے جماعت اسلامی کا مرکز تقریباً ایک میل تھا۔یہ ڈاکٹر امتل صاحب کے پیچھے پا پیادہ روانہ ہوئے اور تقریباً ۲۰ منٹ میں سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت دارالاسلام پہنچ گئے۔لیکن راستے بھر ہم بیم ورجا کی کیفیت طاری رہی کہ اب کوئی اور منزل نہیں تھی۔اگر خدانخواستہ،امتل صاحب مسجد میں گئے لوگوں سے باتیں کرتے رہے پھر ایک صاحب کو ساتھ لیتے ہوئے واپس آئے....تحقیق ہو گئی۔کلیم عاجز صاحب آنکھیں بند کئے سنتے رہے اس طرح جیسے کچھ بھی سن نہیں رہے ہیں جیسے دم آنکھوں سے نکل چکا ہو ان میں زندہ ہونے اور اُٹھنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ڈاکٹر امتل صاحب کچھ دیر کھڑے رہے پھر نماز میں شامل ہونے چلے گئے،یہ زندگی میں پہلی بار نماز جماعت میں دیدہ ودانستہ بغیر کسی شرعی عذر کے شامل نہیں ہوئے۔نماز قضا ہو گئی کہ ان میں حرکت کی قوت ہی نہیں بچی تھی۔پھر وہ بادل ناخواستہ وہاں سے اس طرح اُٹھے جیسے سپریم کورٹ

سے کوئی مجرم اُٹھتا ہے بالکل خالی الذہن اور مطمئن کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب آگے کچھ نہیں ہونا ہے یا اس بہادر سپاہی کی طرح جو دشمن کے مقابلے میں اپنی تلوار کا آخری ضرب اور اپنی قوت کا آخری شمہ صرف کر چکتا ہے اور اُسکا فرض ادا ہو چکتا ہے۔ سیاست کی بدترین قسم وہ ہے جو فکر اور عمل دونوں کی قوت کو سلب کر دیتی ہے اور انسان خود اپنے وجود کی نفی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن لاہور تک واپسی کا سفر تو طے کرنا ہی تھا کہ پٹنہ واپسی کا سفر۔ ناکامی اور لاحاصلی کا سفر۔ ادھر ہی سے شروع ہونا تھا۔ سو وہ بس میں آنکھیں بند کئے ہوئے لاہور کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں انبالہ، گرداس پور، گوجرانوالا سے ہوتے ہوئے رات کے وقت لاہور پہنچے۔ راستے میں ڈاکٹر امتل صاحب ڈھونڈنے کی جو شکلیں تھیں وہ اختیار کرتے رہے مگر کہیں کچھ پتہ نہیں۔ ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب پٹنہ جانا لاحاصل ہے۔ جب تک ممکن ہو دنیا کی خاک چھانتا پھروں۔ انہوں نے امتل صاحب سے کہا کہ لاہور میں چار دن تو گزر گئے پورے پنجاب کی گرد اڑا دی اب چھوڑیئے پنجاب کو چلئے اخبار کوثر کے دفتر میں۔ نسیم کے نام ایک اعلان شائع کرا دیا جائے۔ اُن کی نظر سے ضرور یہ اعلان گزرے گا اور وہ رحم کھا کر ہم لوگوں سے آملیں گے۔

روزنامہ کوثر لاہور (جماعت اسلامی) کا دفتر لاہور کی قدیم آبادی کے ایک مشہور علاقہ میں تھا۔ تین منزلہ عمارت نیچے دکانیں اور دوسری منزل پر دفتر، تیسری منزل پر چھاپہ خانہ۔ عبدالعزیز صاحب ایڈیٹر کوثر لاہور نے بہت ہمدردی سے ان کی باتیں سنیں اور انھوں نے کرید کرید کر ان کے دل کے زخموں کو لہولہان کر دیا۔ اُن کی نیت اور مصلحت تو وہ جانیں۔ لیکن یہاں درد کے بیان میں خود لذتی مسوکیت (Masochism) کے عناصر یعنی تکلیف میں حصول لذت کی کوشش۔ وہ سوال کرتے رہے اور یہ بہلتے رہے لیکن جب انھوں نے اظہار رائے شروع کر دیا تو یہ سرد پڑ گئے۔ پھر عبدالعزیز صاحب ڈاکٹر امتل صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ اور یہ سوچتے رہے ''.........کوثر کے دفتر سے نکل کر اب کہاں جائیں۔ ایک صورت حال بالکل غیر متعین۔ ایک حال بالکل غیر واضح.....ہر طرف تاریکی، مایوسی۔ اس تاریکی میں ہاتھ پاؤں مارتا تھا، غوطہ لگاتا تھا، ڈوبتا تھا اور ڈوبتے جاتا تھا.....خدا جانے کب تک.....یہ تاریکی کا سفر جاری رہے گا؟ کب تک اس ظلمات میں آب حیوان کی تلاش کرتا رہوں گا اور کیا اس ظلمات سے نجات بھی ملے گی۔ آب

حیوان دستیاب بھی ہوگا؟ یا اس تاریکی میں گم ہوکر رہ جانا ہوگا۔'' (ایضاً صبح نو......)

وہ میز کے خالی حصے پر نگاہیں جمائے ہوئے عبدالعزیز اور ڈاکٹر امتل صاحبان کی آوازیں سنتے رہے کہ ان کے اخبار میں ایک اعلان شائع کرنے کی غرض سے وہ لوگ حاضر ہوئے ہیں تو عبدالعزیز صاحب بڑی فراخ دلی سے اور ہمدردی سے کہا کہ آپ اعلان تحریر کردیجئے۔ وہ اسے کل ہی اوّل صفحہ پر چھاپ دیں گے۔ ڈاکٹر امتل صاحب مضمون لکھنے لگے اور یہ دیوار میں لگے طغروں کو دیکھتے رہے اور زور سے ایک سانس کھینچی کہ دشت پیمائی کی ایک منزل تو ختم ہوئی۔ اب اے عشق کہیں لے چل... جہاں کی ٹھوکریں کھلانا منظور ہو وہیں لے چل....

ابھی یہ طغروں کو گھور ہی رہے تھے کہ داہنی جانب دروازے پر پڑی ہوئی چلمن کے باہر کچھ حرکت سی محسوس ہوئی اور ان کے جسم میں ایک بجلی سی کوندگئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نامعلوم طاقت نے انہیں کرسی پر سے اُٹھا دیا اور اُن پر عجیب سی دیوانگی طاری ہوگئی اور وہ زور سے ہنس پڑا اور ساتھ ساتھ آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ بادامی رنگ کی قمیض پہنے...گلے میں مفلر لپیٹے ....نسیم زینے سے اوپر کی منزل کی طرف جارہے تھے۔....تو کہا گیا ہے در نا امیدی لبے امید است نسیم مل گئے۔ مانگی مراد بر آئی۔ میاں نسیم پٹنہ سے سیدھے لاہور کوثر کے دفتر میں ہی آئے تھے۔ عبدالعزیز صاحب کو اُن کی آمد کی اطلاع بالکل نہیں تھی۔ وہ اس ہوٹل (جہاں کلیم عاجز قیام پذیر ہوئے تھے) سے کچھ ہی دوری پر رہے۔ اگر یہ سفر کوثر اخبار کے دفتر سے شروع ہوتا تو گو ہر مراد فوراً ہاتھ آجاتا۔ شاید خدا کو ان کے جذبہ صادق کا امتحان لینا تھا۔ یہ لوگ ایک دن اور لاہور رکے اور وہاں سے دہلی دو ایک روز کی سیر رہی۔ اور میاں نسیم کو سیر کراتے ہوئے پٹنہ واپس ہوئے تو اس طرح کہ قلی کو دینے کے لئے بھی جیب میں پیسے نہیں بچے تھے، پٹنہ جنکشن پر قلی کو دینے کے لئے رکشا والے سے پیسے دلوائے۔ ڈیرہ پر آ کر اس کی رقم بھگتان کی گئی۔ (ایضاً صبح نو.....)

مگر نسیم کی گمشدگی اور بازیابی کا بیان یہیں پر ختم نہیں ہوتا ہے۔ ایک بار وہ تو اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر بھاگے تھے لیکن ایمرجنسی کے دوران جماعت اسلامی کے تعلق کی بناء پر دھر لئے گئے۔ (ان سے پہلے ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ بھی اسی تعلق کی بنا گرفتار کر لئے گئے تھے)۔ ان کی رہائی کے لئے کلیم عاجز کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا۔ اس کی مختصر روداد بھی سنئے:

’’میرے بھائی نسیم احمد ادھر اُدھر رہ رہے تھے اور اوپر کے کمرے میں مستقل خاموش رہائش پذیر ہوئے۔ ایک دن عشاء کی نماز پڑھ کر میں مسجد سے آیا اور دکان کے پیچھے والی کوٹھری میں رات کا کھانا کھا رہا تھا باہر کا دروازہ کھلا۔ یک بیک تیز قدموں کی دھما دھم ہوئی اور سامنے دروازے سے ایک آدمی قمیض پائجامہ پہنے ہوئے چادر سے بالکل منہ چھپائے داخل ہوا اور اس کے پیچھے انسپکٹر پانڈے اور رام لکھن سنگھ سب انسپکٹر تین چار رائفل بردار سپاہیوں کے ساتھ تیزی سے داخل ہوئے اور دس منٹ بعد میاں نسیم ان آفیسروں اور سپاہیوں اور مخبر کے درمیان اترے اور مجھے سلام کرتے ہوئے اور دعا کیجئے گا کہتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ ڈرامہ ہو گیا اور میں سمجھ گیا۔ پھر کیا کھانا۔ شاید ہم دو ایک آدمیوں کے ساتھ پیر بہور تھانے گئے۔ نسیم احمد سلمہٗ کے لئے ضروری سامان لے کر۔ معلوم ہوا کہ ڈیفنس آف انڈیا رول کے تحت اُن کو گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ علی عباس صاحب کے یہاں گئے اُن کی رائے سے ڈی آئی جی سی آئی ڈی مسٹر چٹرجی کے یہاں گئے ۔انہوں نے رہائی سے انکار کیا کہ اس ڈی آئی آر میں ضمانت نہیں ہو سکتی۔ پھر انہوں نے ایک وکیل کے مشورہ سے چیف جوڈیشیل مجسٹریٹ کے یہاں درخواست دی اور چند دنوں کے بعد سماعت ہوئی اور ضمانت منظور ہو گئی۔ ضمانت کے کاغذات بننے میں ایک دن لگ گیا اور تیسرے دن میاں نسیم کو چھڑا کر گھر لے آئے۔ اُن کو بھنک مل گئی کہ ضمانت کے بعد حکومت نے اُن کو میسا (Misa) کے تحت گرفتاری کا وارنٹ تیار کر رکھا ہے اس لئے میاں نسیم کو دوستوں کے مشورے سے بہار شریف روانہ کر دیا کہ کہیں چھپ جائیں۔ آخر مقدمہ کی پیشی ہوتی رہی۔ کئی سماعتوں کے بعد اُن کی ضمانت جائز قرار دی گئی اور انھوں نے غلطی یہ کی کہ میاں نسیم کو بلوا لیا۔ ان کی رہائی کا فیصلہ سنایا گیا۔ لیکن عدالت میں سادہ پولیس والے اُن کو دوبارہ پکڑ کر تھانہ لے گئے۔ کلیم عاجز بھی میاں نسیم کے ساتھ آئے۔ کرسی پر سب کو بٹھایا گیا کہ چند منٹ تشریف رکھئے پھر چلے جائیے گا۔ تھانے دار سنیئر ایس پی کے یہاں دوڑے کہ داخل دفتر ’’میسا‘‘ کے وارنٹ کو جاری کر کے میاں نسیم کو دوبارہ باضابطہ گرفتار کر لیں۔ کلیم عاجز صاحب تھک کر ایک ستون سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور بے قراری کے عالم میں آنکھیں بند کئے رہے کہ شور ہوا نسیم صاحب کہاں گئے، پورے تھانہ میں ہنگامہ ہونے لگا۔ کلیم عاجز صاحب چونک کر تھانہ کے اندر آئے تو معاملہ سمجھ میں آ گیا کہ پولیس کو

غافل پاکر میاں نسیم احمد فرار ہوگئے ہیں۔ وہ بشاشت سے باہر نکل کر گھر واپس آ گئے۔ کسی پولیس آفیسر نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ نسیم تیزی سے سبزی باغ ہوتے ہوئے کلیم عاجز صاحب کے ایک ہم زلف ولی الحق سنئیر مجسٹریٹ جن سے اُن کو بہت تعلق تھا مچھوا ٹولی چلے گئے اور دو چار دنوں تک چھپے رہنے کے بعد ایک رات بہار شریف چلے گئے۔ کلیم عاجز تھانے سے تقریباً دن کے تین بجے واپس ہوئے تھے لیکن مغرب کے فوراً بعد پولیس کی جیپ آ کھڑی ہوئی اور مسٹر پانڈے انسپکٹر مع رائفل برداروں نے فوراً انہیں تھانہ چلنے کو کہا۔ پھر وہاں انہوں نے پولیس افسران کو کھری کھری سنائی کہ ان کا ضمیر صاف تھا اور میاں نسیم کو بھگانے کے معاملہ میں یہ بالکل بے قصور تھا لیکن ان کو تھانہ جانا ہی پڑا۔ وہاں کافی دیر تک ڈرامہ ہوتا رہا رات کے نو بجے انیل کمار ایس پی کا فون تھانیدار کے پاس آیا اور اُن سے بات کر کے انھوں نے کہا کہ کلیم عاجز صاحب میں بہت شرمندہ ہوں آپ فوراً گھر تشریف لے جایئے۔ یہ انیل کمار صاحب ایس پی تھے جو ایک الیکشن ڈیوٹی موقع پر اُن سے روشناس ہوئے تھے۔'' اس واقعہ کی روشنی میں بہت سارے نتائج نکلتے ہیں کلیم عاجز صاحب کے فعال اور متحرک داغ کی داد تو دینی ہی ہوگی کہ وہ اُس معاملہ میں بھی مطلق ہراساں نہیں ہوئے بلکہ اعلیٰ پولیس افسران سے مل کر اور وکیلوں اور قانونی مشیروں کی مدد سے سرخرو ہوکر نکلے۔ ان کے کردار کا یہ بے داغ پہلو بھی اس وراثت کی دین ہے جس میں کسی انسان کو حقارت کی نظر سے دیکھنا بھی منع تھا اور تکبر بھی۔ ع:

کسے را بہ چشم حقارت مبیں
یا تواضع کند نیک بخت اختیار

اُن کے نگارخانے سے یہ چند نقش ہائے رنگ رنگ میں نے پیش کر دیئے۔ ان میں سے بیشتر اُن کی اپنی ذاتی مشکلات اور شخصی واردات کے ہی متعلق ہیں لیکن ان میں اپنے معاشرے اور اپنی معاشرت کی جھلکیاں بھی اپنا جلوہ دکھلائے بغیر نہیں رہتیں لیکن کروں کیا وہ لفظوں کے طوطا مینا بناتے نہیں۔ اپنے مافی الضمیر کو کبھی نامانوس لفظوں کے پیکر میں چھپاتے نہیں۔ وہ نہ احساس برتری کا شکار ہوئے نہ احساس کمتری کا وہ خود کہتے ہیں کہ ''میں نے جو کچھ لکھا ہے اپنی ذات کی حدود میں لکھا ہے یعنی جو میں نے جانا ہے سمجھا ہے وہی لکھا ہے۔'' (صبح نو، مئی 1946ء)

انہوں نے پٹنہ کے ایک دور کو دیکھا ہے اس کو برتا ہی نہیں اس میں سانس لیا ہے۔ مجلس ادب کے جلسوں میں کبھی کبھی میں بھی شریک ہوا ہوں۔ اس کی نشستوں کی تفصیلی روداد انھوں نے مرتب کی ہے جو مجلس ادب کے نام سے الگ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ ایوب گرلس اسکول کے بانی ایوب ایڈوکیٹ کے بارے میں ان کا مختصر مگر جامع مضمون بھی اسی دردمندی کا عکاس ہے جو دونوں کے مزاج کا مشترک نسب نما ہے۔ مبارک عظیم آبادی صاحب شاگرد و جانشین داغ کے بارے میں بہت ساری باتیں معلومات کا ذخیرہ ہیں۔ عبدالقیوم انصاری سے بھی اُن کے ذاتی مراسم کی نوعیت کا ذکر وہی خلوص باہمی اور مشرقی تہذیب کی خصوصیات کو اُجاگر کرتا ہے۔ ڈاکٹر حبیب جو میرے بچپن میں سبزی باغ میں ہومیوپیتھی مطب کے روزانہ سیکڑوں مریضوں کا علاج کرتے تھے اور جو ادب وشاعری کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اُن کو بھی اس بے ساختگی سے یادوں کے منظر نامے میں شریک کیا ہے کہ ان کے ساتھ وہ دور زندہ ہو جاتا ہے۔ اپنی کچھ تحریروں میں وہ بات سے بات نکالتے ہوئے دور نکل جاتے ہیں اور نفس مضمون سے الگ ہو کر یادوں کے چراغ روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ ''عشق ہر شخص کے بس کا نہیں پیارے جاؤ:: یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ'' اس کی ایک بین مثال ہے جس میں اپنا بیان اپنی دوکان کا حال زار وہاں آنے جانے والے اکابرین کے کئی سطور میں نام، دور دراز سے آنے والے سفارش طلب لوگوں کی امداد کا ذکر، رات گئے فون پر گوش برآواز ہونا، اس کے بعد کے صفحات پر ڈاکٹر حبیب الحق کی مسیحائی کے قصے، اُن کے انتقال کی خبر پر ان کے گھر جانا اُن کے بیٹے سے ملنا۔ اور صرف ایک جملے ''ڈاکٹر صاحب اور اُن کے بیٹے میں بہت فرق نظر آیا''۔ میں بہت کچھ کہہ جانا، عطر فروش ایجنٹ سے سابقہ اور اسے میرے پاس بھیجنا۔ امتحان گاہ میں جمعہ کے دن ۱۱ بجے بلایا گیا تو یہ ملازمت سے استعفیٰ دینے کو تیار ہو گئے تب جا کر وہ معاملہ ٹلا۔ لیکن پٹنہ یونیورسٹی کے جغرافیہ کے پروفیسر سوریش پرشاد اکزامنیشن انچارج ان کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ آگے ایک محفل قوالی کا ذکر ہے جو خدا بخش کتب خانے میں برپا ہوئی تو دو صفحات کے بعد اسلام پور پہنچ جاتے ہیں اور خانقاہ اسلام پور کے عرس 1413ھ، 5 رمحرم کی تفصیل لکھتے نہیں تھکتے پھر وہاں کے محفل سماع کے ساتھ امیر خسرو کی نعتیہ غزل:

جاں زمن بردی و در جانی ہنوز

درد ہا دادی و درمانی ہنوز

اُس کے بعد کسی کا یہ شعر سنانے لگتے ہیں:

سینے میں دل ہے دل میں داغ داغ میں سوز و ساز عشق

پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا راز عشق

پھر اپنے اشعار سنانے لگتے ہیں۔

یہ زخم خوردۂ غم پھر بھی ہیں عجیب و غریب

یہ اپنے درد سے کیا کیا نہ کام لیتے ہیں

یہ روز کرتے ہیں اپنا جگر لہو اور روز

کلام کہتے ہیں داد کلام لیتے ہیں

پھر اپنی ایک اور غزل سنانے لگتے ہیں:

غرض کسی سے نہ اے دوستو کبھو رکھیو

بس اپنے ہاتھ میاں اپنی آبرو رکھیو

زمانہ سنگ سہی آئینے کی خو رکھیو

جو دل میں رکھو وہی سب کو رو برو رکھیو

(میں نے صرف دو ہی اشعار پیش کیے)

پھر 40 / 35 سال پہلے شاہ ارزاں کے حضرت شاہ حامد حسین سجادہ نشیں کا آخری دور یا اس کے صاحبزادے کی سجادگی کا عہد تھا عرس کی تقریب میں اردو غزل بہت کم سُنی۔ زیادہ تر فارسی حضرت امیر خسرو یا حافظ شیرازی کی غزلیں حضرت جامی کی نعتیں یا بزرگوں کی تصنیف ٹھمریاں۔انھوں نے پہلی بار سنی تھی۔

پیہو پیہو کر کے ہوگئی پپیہرا

یا دل کا حال مورا کوئی نہ جانے

سیاں جانے کہ جانے مورا جیرا

پھر اس محفل سماع میں کہرام مچانے گردش کرنے والے چیخنے والے جیسے انگاروں پر چل

رہے ہوں۔ دل کی آگ سانسوں سے بھی نکل رہی ہے اور قدموں سے بھی۔'' اور آخر میں یہ شعر:

مت پوچھئے کس کے عاشق ہیں چپ رہنما ہمارا کافی ہے
اک پردہ نشیں کا راز ہے یہ بس اتنا اشارہ کافی ہے

تو بس اتنا اشارہ کافی ہے کی تکرار سے اور فرش پر کتنے لوگوں کی زبان سے مصرع ثانی کی تکرار سے کوئی دل تھام لیتا، کروٹیں لیتا تو کوئی چیخ کر روتا۔

یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ
عشق ہر شخص کے بس کا نہیں پیارے جاؤ

(زبان وادب، جلد۲۱، ص3، مئی 1995ء)

شکیب جلالی (1934ء۔1966ء) کیٹس (1821ء-1795ء) شیلی (1822ء-1792ء) پنڈت دیا شنکر نسیم ....) کی جواں مرگی کا شہرہ تو چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن کلیم عاجز نے ایک ایسے جوان مرگ شاعر کا سراغ لگا کر اس کے کچھ اشعار سے اسے گمنامی میں ڈوبنے سے بچا کر زبردست کام انجام دیا ہے۔ یہ اپنی تحقیق بہار میں اردو شاعری کا ارتقاء 1857ء سے 1916ء تک کے سلسلے میں خاک چھان رہے تھے۔ ان کی جستجو انہیں ایک ٹیلے پر بنی ہوئی چھوٹی سی مسجد میں لے گئی جہاں علامہ شوق نیموی کے صاحبزادے عبدالرزاق فوق نیموی سے ملاقات ہونے پر اُن کے عالم جذب وکیف بے نیازی اور استغنا نے مشکل سے مخاطبت کا موقع دیا۔ اُن کا مدعا سن کر کتابوں کے ڈھیر سے ایک میلی کچیلی کتاب عنایت کی جو اردو کے غالباً سب سے کمسن شاعر مرزا علی رضا ضیاء عظیم آبادی کا مجموعہ غزلیات تھا۔ کتاب پر ضیاء عظیم آبادی کے برادر نسبتی کا لکھا ہوا تقریظ وتعارف موجود ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ 7رمحرم 1319ھ کو ہی ہیضہ ہو گیا اور 8رمحرم کو بعد طلوع فجر بیس اکیس سال میں انتقال کیا۔ لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ غمِ جاناں کی شدت سے مجبور ہو کر زہر کھالیا۔ اعزہ واحباب نے پولیس کی تحقیق وتفتیش اور واقعہ کے طشت از بام ہو جانے کی رسوائی کے خوف سے حقیقت پر پردہ ڈالا اور ہیضہ سے انتقال کرنا مشہور کر دیا۔ انہوں نے موت سے پہلے ایک مطلع کہا تھا:

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک دردسا دل میں ہوتا ہے

ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

میں نے اس مطلع کو نور جہاں کی آواز میں سنا تھا۔اسی سے ایک فلمی گانے کی ابتداء ہوتی ہے۔آج بھی یہ شعر ذہن میں گونجتا رہتا ہے۔ضیاء عظیم آبادی کے بارے میں اور تفصیلات کلیم عاجز نے درج کی ہیں اوران کے اشعار بھی۔میں بس اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔اُن کی تحقیق کا کام بہت ہی معیاری ہے جس کی داد قاضی عبدالودود دے چکے ہیں (کچھ خامیوں کی طرف اشارے کے ساتھ)اور کلیم الدین احمد وڈاکٹر اختر اور ینوی نے اس کے بارے میں اپنی مثبت رائے کا اظہار کیا ہے۔پٹنہ کے شاعر فضل حق آزاد، ولی الحق اور علامہ ظہیرالحسن شوق نیموی عظیم آبادی کے متعلق بھی انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ ابوالکلام آزاد، مغل شہزادگان،شہزادہ رئیس بخت اور شہزادہ زبیدہ بخت اور درجنوں معروف شخصیتوں کے استاذ جامع الازہر اور مصر وعرب کے کئی درسگاہوں میں داخل نصاب کتاب آثار السنن کے مصنف 33-32 سال کی عمر میں مشاہیر روزگار میں شمار ہونے والے جوانی میں دبستان لکھنؤ کے ادبی علمی اور فنی معرکے جیتنے والے یادگار وطن نعمہ راز، ازاحتر الاغلاط،الاصلاح،سرمہ تحقیق جیسی علمی فنی اور تحقیقی کتب کے مصنف دینیات اور حدیث کے موضوع کے ماہر پٹنہ عظیم آباد سے تقریباً 20 میل دور ایک کوردہ دیہات کے رہنے والے جہاں 1988ء تک کوئی سڑک نہیں جاتی تھی۔33 سال کی عمر میں شعروسخن وعلم وفن کی خوبی پر پہنچ کر صرف 44 سال کی عمر میں گزر گئے۔ضیاء عظیم آبادی انہی کے شاگرد تھے۔

کلیم عاجز ماضی کے ہی یادگار نہیں تھے بلکہ اپنے دور کے ادبی اور شعری منظر نامے سے بھی غافل نہیں تھے۔دیکھئے انہوں نے افسانوں کے متعلق کیا رائے دی ہے۔اختلاف کرنا آپ کا حق ہے لیکن اُن کی بے لاگ لپٹ بات کی دلیل سن لیجئے ”میں جب مکتب میں اردو فارسی کی درسی کتابیں پڑھتا تھا اُسی وقت سے کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوا۔پرانی داستانیں تمام پڑھ ڈالیں پھر اسکول میں آیا تو اردو کے تقریباً تمام ناول نگاروں کو پڑھ ڈالا۔پھر رسالے کا شوق ہوا تو عالمگیر، نیرنگ خیال،ساقی،ادبی دنیا،کلیم،رومان،نگار ہمایوں...وغیرہ کے تمام افسانہ نگاروں کو پڑھا۔اب موجودہ افسانہ نگاری کے تکنیک میں لکھے ہوئے موضوع بحث کے بعض افسانوں کو پڑھ کر بے اختیار پریم چند کے دونوں بیل ہیرا اور موتی یاد آجاتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ ذہنی اعتبار سے تو خیر

بیل ہوں، کاش واقعی بیل بن کر ان میں گھل مل جاتا کیونکہ ان جانوروں کی محبت اور محبت کے بیان میں مجھے زیادہ خلوص اور سادگی نظر آئی۔'' (ماہنامہ صبح نو، ایضاً، جون 60ء، مارچ 61ء)

کلیم عاجز شعر و ادب کے ساتھ تبلیغی جماعت سے بھی منسلک ہوئے۔ اس کار خیر کا میلان شاید اُن کے مزاج میں کہیں خوابیدہ تھا لیکن اس تخم کو بارور کرنے میں پہلے افتخار فریدی اور ساتھ ہی حضرت جی یعنی انعام الحسن صاحب کی دست خاص کی آبیاری۔اور قلبی و روحانی اشتراک نے معجزہ کر دکھایا۔انھوں نے ان سے پہلی ملاقات اور اُن کے طریق کار کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے اعادے سے کچھ حاصل تو نہیں ہوگا لیکن اتنا بتادوں کہ وہ ایک پاؤں سے معذور تھے اور بیساکھی کے سہارے چلتے پھرتے تھے لیکن خدمت کا جوش وولولہ اُن کی اُس ناتوانی کو ایسی توانائی عطا کر چکا تھا کہ وہ جہاں جاتے تبلیغی جماعت کا کام اس خلوص اور جاں نثاری سے انجام دیتے کہ لوگ ان کے گرویدہ ہوجاتے اور وہ اپنے حسن سلوک اور نیک نیتی سے باعمل لوگوں کی ایک جماعت تیار کر لیتے۔افتخار فریدی صاحب جمعیت الاحرار کے مستعد جاں سپار اور ہمہ وقت تیار رکن تو تھے ہی تبلیغی جماعت سے آشنائی ہوئی تو ان پر بصیرت کا دروازہ کھل گیا۔اُن کی سمجھ میں آ گیا کہ مولوی الیاس صاحب کی تحریک ایسی ہے جس نے زندگی ، موت، حیات اور کائنات بعدالسمات کو اپنی آغوش میں ہی نہیں لے لیا ہے بلکہ بادی روحانی، عقلی اور ماورائی دینی دنیاوی مذہبی اور تہذیبی معاشرتی سیاسی انفرادی، اجتماعی تمام پہلوؤں کو اپے اندر سمیٹ لیا ہے۔وہ اپنے تمام اثاثے سرمائے تمام صفات اور بڑائی بلکہ دیوانگی اور ہشیاری کے ساتھ اس تحریک میں کود پڑے۔کلیم عاجز اُن کے قافلہ میں شامل ہوئے تو بعد میں قافلہ سالار ہوگئے اور بہار کے امیر جماعت بنا دیئے گئے۔ان ہی کے ہمراہ ایک بار پھلواری شریف گئے۔ فریدی صاحب سجادہ نشیں حضرت شاہ امان اللہ صاحب کے حجرے میں گئے تو اُن دونوں کے کام کی ستائش بھی کی اور یہ جملہ بھی فرما گئے کہ وہ کلیم عاجز صاحب سے کہئے کہ داڑھی رکھ لیں۔ یہ پٹنہ کے امیر ہیں۔'' اُس وقت کلیم عاجز صاحب پی، ایچ ڈی کر رہے تھے۔فریدی صاحب ہر سال دو تین بار پٹنہ آتے کبھی کلیم عاجز صاحب کے یہاں قیام کرتے۔معذوری کے باعث بار بار اوپر نیچے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اوپر اپنے کمرے میں ہی جماعت سے نماز ادا کرتے اور امامت کلیم عاجز کو کرنی پڑتی۔

ایسے بے غرض اور جامع کمالات انسان کی خوبیوں کے بیان کو دفتر چاہئے۔لیکن اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کلیم عاجز کی سربراہی میں ایسے ایسے جاں نثاروں کو ایک جگہ جمع کرکے ان سے کئی جگھوں پر عالی شان اجتماع کرکے خواص وعوام کو زندگی کی اعلیٰ اقدار سے روشناس کرایا۔اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم زعما اور اکابرین اُن کی دعائیہ مجالس میں شریک ہوتے رہے جو حضرت ہی کی ذات بابرکات کا کرشمہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ کئی موقعوں پر ان اجتماعات کا نقشہ ہی درہم برہم ہوتا نظر آتا تھا جسے ان کی مشترکہ کوششوں سے حکام کی منظوری مل سکی تھی۔حضرت جی کے بیان کے ساتھ.وہ حضرت مولانا یوسف صاحب کا بھی ذکر کرتے رہتے ہیں کہ دونوں کے طریق کار میں بہت فرق تھا۔یوسف صاحب طویل تقریر کرتے نہیں تھکتے تھے۔ مگر ان کی زبان کتابوں کی نہیں ہوتی تھی۔الف ب ت ث ج ح خ وغیرہ تو ایک ہی زبان کے لیکن اُن کا آپس میں جوڑ کتابوں کی زبان سے بالکل الگ اس کی اصطلاحیں جانی پہچانی ہوئی نہیں،تین تین چار چار گھنٹوں کی تقریروں میں بھی یہ شائبہ نہیں گزرتا کہ وہ جو کچھ فرمارہے ہیں اس کی دلیل کیا ہے وہ اس سراپا دلیل ہی ہوتیں۔لوگ آتے جاتے لیکن صاحب کی تقریر جاری رہتی۔ اور یوسف صاحب کی پشت پر جو شخصیت متوجہ کرتی وہ تھی حضرت جی انعام الحسن کی ذات گرامی۔ انہیں کلیم عاجز صاحب نے کبھی کسی مجلس یا نشست مسجد میں تقریر کرتے نہیں یکھا۔وہ مختصر گوئی کی قوت میں یقین رکھتے تھے اور(اجتماعات سے دل برداشتہ) دراصل یوسف صاحب نے اپنے طریق کار سے اس تبلیغی جماعت کو پال پوس کر جوان کیا۔وہ اجتماعات سے کام لینے میں بھی یقین کرتے تھے۔..1960ء مارچ میں تبلیغی جماعت میں شرکت کے بعد کلکتہ،آسنسول کے 10 روزہ سفر نے ان کی مزاج کی اینٹھن ختم کردی تھی۔پھر 31/دسمبر 1966ء کو باضابطہ نوری مسجد میں اس کا باقاعدہ آغاز ہوا۔افتخار فریدی صاحب کے ذریعہ یہ یوسف صاحب اور حضرت جی دونوں سے روشناس ہوئے اور دیکھتے دیکھتے اس جماعت کے روح ورواں بن گئے تو حضرت جی کی آنکھو ں میں علامہ اقبال کا یہ شعر جھلک جاتا

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارجہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

''حضرت جی کی آنکھوں میں کارجہاں کی وسعت اور پہنائی نظر آئی۔کام اتنا بڑھ گیا کہ اسے کیسے سنبھالا جائے اور کیسے محفوظ رکھا جائے اس درد نے بصیرت کا دروازہ کھولا۔حضرت جی کی کم سخنی بلکہ خاموشی کا یہی پیغام تھا کہ بہت کچھ بولا جاچکا ہے وہ بول کانوں میں گونجتے ہیں دلوں میں محفوظ ہو چکے ہیں۔خیمہ وخرگاہ کی ضرورت نہ مال وسامان کی ضرورت۔اب تو آہ نیم شبی اور نالہ سحر گاہی کی ضرورت ہے۔خاموش قربانی کی ضرورت ہے۔افتخار فریدی صاحب کے بقول حضرت یوسف کبھی نرمی اور کبھی سختی سے فرماتے تھے کہ ''اپنی شخصیت نہ بناؤ شخصیت کو توڑو'' اس کی تفسیر کرکے میں اس جملہ کے جہان معنی اور فصاحت وبلاغت کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔ویسے اپنی شخصیت کو توڑنا ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔یہ کام کرکے دکھایا افتخار فریدی صاحب نے جو ہر ایک سے جھک کر ملتے تھے۔

اب حضرت جی کے تین جملے ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے کلیم عاجز صاحب کی موجودگی میں کچھ اہل علم کو مخاطب کرکے کہا تھا جن میں پروفیسر بھی شامل تھے ''بھائی! مسلمانوں کا منصب حکومت نہیں خلافت ہے۔حکومت جبر ہے خلافت صبر ہے۔حکومت کی حکمرانی جسموں پر ہے خلافت کی حکمرانی دلوں پر ہے'' جو پروفیسر حضرات (کم ازکم چھ عدد) جو جماعت اسلامی سے متاثر تھے آنکھیں پھاڑ کر حضرت جی کو دیکھنے لگے۔''دراصل وہ لوگوں سے عملی وابستگی کے طلبگار ہوتے تھے۔اسی لئے سیدھی سادی بات کرتے خطابت کی صناعی اور آراستگی سے محفوظ بات، دل سے نکلی ہوئی بات، تاثیر سے بھرپور۔سننے والے چہرہ زیادہ دیکھتے۔میں نے کسی ایک شخص کو بھی آج تک نہ دیکھا کہ ان کی مختصر گفتگو کے دوران اس کا سر جھکا ہوا ہو۔پورا کا پورا مجمع ٹکٹکی باندھے حضرت کو دیکھتا جیسے اس کے جسم اور روح کا ایک حصہ اس کوشش میں ہو کہ کوئی جلوہ نگاہوں سے رائگاں نہ ہو اور کوئی لفظ گوش سماعت میں داخل ہونے سے بچ نہ رہے۔اس توجہ اور انہماک کا تعلق لذت سے نہیں کیفیت سے ہے۔لذت جلد آسودہ ہو جاتی ہے۔لذیذ سے لذیذ چیز آسودہ کردیتی ہے اور لذت کا وزن آہستہ آہستہ کم ہوتا رہتا ہے۔لیکن کیفیت ایسی چیز ہے جس کی کوئی حد نہیں کوئی انتہا نہیں......لذت بہرحال مادی ہے کیفیت کا تعلق روح سے ہے جس قدر محبت حضرت جی سے لوگوں کو تھی وہ بطور مثال ہی پیش کی جاسکتی ہے۔'' (ایضاً ص 214)

بجنور، ارریہ، بتیا، بھاگلپور کے اجتماعات جو منگراہاٹ بنگال سے شروع ہوئے تھے کا خاتمہ بنگلور میں ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت جی اجتماعات سے دلبرداشتہ ہو گئے لیکن ان اجتماعات نے جن لوگوں کو یکجا کیا، جن اہل علم کی ذہنیت میں گداز پیدا کیا اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو جو پیغام دیا وہ اس تحریک کے کارناموں کو یادگار بنائے رہے گا۔ ان دنوں وہ جوش اور ولولہ تو نہیں نظر آتا، یہ تحریک ابھی آہستہ رو ہے۔ شاید وقت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لیکن کوئی بندۂ خدا کب اسے تیز گام کر دے، دلوں کو حرارت سے لب ریز کر دے اور نئے طریقے سے خلوص کی عظمت کو نشان زد کر دے۔ مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔

نامور ادیب جناب ارمان نجمی کا تعلق پٹنہ (بہار) سے ہے۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:162-189
Dr. Ameena Tahseen, Ms. Ameena Tabassum, Muslim Khawateen ki Talimi Taraqqi o Baikhtiyari...

ڈاکٹر آمنہ تحسین، آمنہ تبسم

مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی و بااختیاری میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا رول ۔ایک تحقیقی جائزہ

ہندوستان میں ''خواتین کی بااختیاری'' پچھلے کئی برسوں سے منصوبہ بندی و پالیسی سازی کا حصّہ رہی ہے۔گذرے برسوں میں سرکاری سطح پر خواتین کے تحفظ اور ترقی و بااختیاری کے ضمن میں کئی پالیسیز، پروگرامس اور قوانین کی تشکیل کے ساتھ ساتھ مختلف النوع اقدامات اپنائے گئے۔ باوجود ان سب کوششوں کے آج بھی ہندوستانی خواتین مجموعی طور پر زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں حاشیائی حیثیت پر ہیں اور ایک باوقار و تحفظ بھری زندگی سے محروم ہیں۔ ہندوستان کے تکثیری سماج میں خواتین کی حیثیت کا جائزہ لیں تو مذہب، ذات پات اور طبقاتی دائروں میں خواتین اور بھی مختلف امتیازات، مسائل، ظلم، جبر و استحصال کا شکار نظر آتی ہیں۔اس تناظر میں ''مسلم خواتین'' کی حیثیت پر نظر ڈالیں تو 'مسلم خواتین بہ حیثیت ''اقلیتی طبقہ'' مزید پست حیثیت کی مالک، تعلیم و ترقی سے دور اور بے اختیار نظر آتی ہیں۔اس حقیقت کا انکشاف مختلف رپورٹس مثلاً سچر کمیٹی رپورٹ، مشرا کمیشن رپورٹ یا دیگر کئی سرکاری وغیر سرکاری سطح پر کئے گئے تحقیقی مطالعات میں ہوا ہے۔اس ضمن میں زویا حسن اپنی کتاب ''ان ایکول سیٹیزن (2004)'' میں لکھتی ہیں۔

> ''مسلم خواتین' تین سطحوں کی بناء پر ناموافق حالات کا شکار ہیں۔ایک بہ حیثیت اقلیتی طبقہ کی فرد کے، بہ حیثیت عورت اور بہ حیثیت غریب عورت کے۔ صنفی امتیازات اور عدم مساوی مقام و مرتبہ مسلم خواتین کی وضع کردہ بے اختیاری (Structured Dis empowerment) کو فروغ

دیتے ہیں۔''

کسی بھی ملک وسماج کی ترقی کا راز تمام خواتین کی ترقی و بااختیاری میں مضمر ہے۔ خواتین کو بنیادی حقوق اور تعلیم وترقی سے دور رکھ کر ملک کی ترقی کا خواب نہیں دیکھا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ خواتین کو تمام بنیادی حقوق دیے جائیں تاکہ ان کی شخصیت اور صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما ہوسکے اور وہ ایک اہم سماجی فرد کی حیثیت سے ملک وسماج کی ترقی کا حصہ بن سکے۔ یوں تو خواتین کی بااختیاری کے متعلق بے شمار تعریفیں لکھی گئیں لیکن یہاں اقوامِ متحدہ کی پیش کردہ تعریف بیان کی جارہی ہے۔ جس کے مطابق

''خواتین کی بااختیاری کا مطلب ہے ان کے بنیادی حقوق کو قبول کرنا اور اس طرح کا ماحول تیار کرنا جس میں وہ مردوں کے برابر مساوی مقام پاسکیں۔''

خواتین کی بااختیاری دراصل وہ ہمہ پہلو اور مسلسل عمل ہے جس میں انھیں ایسا سازگار ماحول یا مواقع فراہم کرنا ناگزیر ہے جس میں وہ تعلیم یافتہ، باشعور، خود مکتفی وفیصلہ ساز فرد کی حیثیت سے ترقی کے مرکزی دھارے میں شامل ہوسکیں نیز پورے تحفظ وحقوق کے حصول کے ساتھ سماج میں باوقار زندگی گذار سکیں۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب سماج میں ان کے مقام ومرتبہ اور ان کے حقوق کو قبول کیا جائے۔ جسے صدیوں سے نظر انداز کیا جاتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اکیسویں صدی میں بھی خواتین ایک حاشیائی طبقہ کی حیثیت پر فائز ہیں۔ ان کی حیثیت میں بہتری اور انھیں ملک کے مرکزی دھارے میں شامل کرنا تب ہی ممکن ہے جب وہ تعلیم وہنرمندیوں کے زیور سے آراستہ ہونگی۔ تاہم ہندوستانی خواتین کو آج بھی تعلیم کے حصول میں سینکڑوں رکاوٹیں درآتی ہیں۔ جبکہ یہ ناگزیر ہے کہ تعلیم تک ان کی رسائی کو آسان اور ممکن بنایا جائے اور انھیں تمام تر سہولتیں فراہم کی جائیں جس میں ان کی شخصیت اور پوشیدہ صلاحیتوں کا فروغ ہوسکے۔ تعلیم کو سماجی، معاشی اور ثقافتی تبدیلی اور شخصیت سازی کا اہم آلہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا تعلیم یافتہ خواتین ان تبدیلیوں کی ایک اہم ایجنٹ کی حیثیت سے اہم کردار ادا کرسکتی ہیں اور ملک کی ترقی میں شامل ہوسکتی ہیں۔

تحقیقی رپورٹس کے مطابق ہندوستان میں' سماجی، تہذیبی و معاشی سطح پر آج بھی ایسی

بے شمار رکاوٹیں ہیں جو تعلیمِ نسواں کے فروغ میں حائل ہیں ۔ان رپورٹس میں لڑکیوں کی پست تعلیمی حیثیت کے متعلق یوں تو بے شمار اسباب کی نشاندہی کی گئی لیکن ان ہی میں ایک اہم سبب مختلف علاقوں میں مادری زبان میں اسکول و کالجس کی عدم موجودگی بھی بتائی گئی ہے۔ ہندوستان میں لڑکیوں کے لیے عموماً انگلش میڈیم کے برخلاف مادری زبان میں تعلیم دلانے کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ انھیں اگر مادری زبان میں تعلیم کی سہولت میسر نہ ہو تو ان کی تعلیم کا سلسلہ کہیں نہ کہیں رک جاتا ہے۔ان حقائق کے تجزیہ سے یہ واضح ہوا کہ مادری زبان میں نہ صرف بنیادی تعلیم بلکہ، اعلیٰ و پیشہ وارانہ تعلیم کی فراہمی خواتین کی ترقی و بااختیاری میں بہترین و مثبت تبدیلی کا باعث بن سکتی ہے۔ ہندوستان ایک ہمہ لسانی ملک ہے جس میں اردو زبان بولنے والوں کی تعداد بنا کسی مذہبی تخصیص کے کروڑوں میں ہے جبکہ مسلمانوں کی اکثریت اردو زبان بولتی ہے اور لڑکیوں کے لیے اردو ذریعہ تعلیم کو پسند بھی کرتی ہے۔لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلم خواتین کی ترقی و بااختیاری میں اردو ذریعہ تعلیم نہایت موثر کردار ادا کرسکتی ہے۔

مقاصد:

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) کا قیام 1998ء میں عمل میں آیا۔اس کے قیام کے مقاصد میں اردو زبان میں روایتی اور فاصلاتی طرزِ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ و پیشہ وارانہ تعلیم فراہم کرنا نیز تعلیمِ نسواں پر خاص توجہ دینا ہے۔تعلیم نسواں کے فروغ کے مقصد کی تکمیل کے لیے چند ایک سہولتیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ جیسے خواتین کے لیے ٹیوشن فیس میں رعایتیں، داخلہ کی حدِ عمر میں اضافہ،لڑکیوں کے ہاسٹلس ،ڈے کیر سنٹر کا قیام،صنفی مساوات کے متعلق حسّیت پذیری کے لیے مسلسل توسیعی وتربیتی پروگرامس وغیرہ قابلِ ذکر ہے شامل ہیں۔اردو میں روایتی اور فاصلاتی طرزِ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ و پیشہ وارانہ تعلیم کے مواقعوں کی بناء پر مسلم معاشرہ کا ایک بڑا طبقہ اس یونی ورسٹی سے فیض یاب ہورہا ہے۔اس جامعہ کے مختلف کورسس سے مستفید ہونے والوں میں کثیر تعداد لڑکیوں کی رہی ہے۔اس تناظر میں یہ جائزہ لینا ناگزیر لگتا ہے کہ

☆ مانو کا قیام مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی میں کس حد تک مددگار ثابت ہورہا ہے؟

☆ اردو ذریعہ تعلیم، مسلم خواتین کو بااختیار بنانے میں کس درجہ معاون ثابت ہورہی ہے؟

تحقیقی طریقہ کار:

پیشِ نظر مقالہ میں مانو کے قیام سے تا حال مختلف تعلیمی شعبوں سے مستفید ہونے والی طالبات کے حوالے سے مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی اور بااختیاری کا جائزہ لیا گیا۔اس مطالعہ کے لیے کھوجی تحقیق کے طریقہ کار کو اپنایا گیا اور بنیادی و ثانوی ماخذات کے تجزیے کے بعد نتائج اخذ کئے گئے۔مطالعہ و تجزیہ دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں دستیاب ریکارڈ کی بنیاد پر اردو ذریعہ تعلیم سے مسلم خواتین کی اعلیٰ و پیشہ وارانہ تعلیم میں شمولیت کا جائزہ لیا گیا اور دوسرے حصہ میں بنیادی ماخذات کے تجزیہ سے مسلم خواتین کی بااختیاری کو جانچنے کی کوشش کی گئی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مانو کے قیام سے بڑی حد مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی اور بااختیاری ممکن ہو پا رہی ہے اور ہندوستان بھر میں ایسا ماحول تیار ہو رہا ہے جس میں مسلم خواتین کی ہمہ پہلو بااختیاری کے لیے راہیں ہموار ہونے لگی ہیں۔

تحقیق و تجزیہ:

مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے روایتی و فاصلاتی طرزِ تعلیم کے تحت مختلف کورسس میں داخلہ لینے والی طالبات کے ریکارڈ کا متنی تجزیہ کیا گیا اور حسبِ ذیل نتائج اخذ کیے گئے۔

مانو میں تعلیمی سلسلہ اگرچہ کہ 1999 سے فاصلاتی طرز پر گریجویشن کی سطح سے شروع ہوا لیکن روایتی تعلیم کے ذریعہ پوسٹ گریجویشن کی شروعات 2004 میں ہوئی۔سال بہ سال مختلف شعبوں کی وسعت ہوتی گئی۔تا حال مختلف مضامین میں تعلیم و تحقیق کی سہولتیں دستیاب ہیں۔جبکہ 2007 کے بعد سے مختلف شہروں میں اسکولس بھی قائم کیے گئے۔ مانو کے تین ماڈل اسکولس مسلمانوں کی گنجان آبادی والے شہروں حیدرآباد، دربھنگہ اور نوح (میوات) میں قائم ہیں۔ بالخصوص یہ اسکولس شہر کے پسماندہ علاقوں میں قائم کیے گئے تا کہ ضرورت مند افراد کی رسائی ان اسکولس تک ہو سکے اور انھیں معیاری تعلیم مہیا کی جاسکے۔قیام کے بعد سے ان اسکولس میں طلبہ و طالبات کے داخلہ کا کل تناسب بالترتیب 52% اور 48% فیصد رہا۔تفصیل نیچے دی گئی جدول میں دیکھی جاسکتی ہے۔

Table-2

Number of Students enrolled in MANUU Model Schools

(from the year of Establishment to academic year 2015 - 16)

Schools	Year of Establish ment	Total No. of Candi-dates	No. of Male Candi-dates	% of Male Candi-dates	No. of Female Candi-dates	% of Female Candida-tes
MMS Hyderabad	(2007-08)	1551	563	36%	988	64%
KMMS Darbhanga	(2007-08)	1538	884	57%	654	43%
KMMS Nuh	(2009-10)	1023	679	66%	344	34%
	Total	4112	2126	52%	1986	48%

مانو میں ایس ایس سی کے بعد ITI's اور Polytechnic جیسے پروفیشنل کورس بھی چلائے جاتے ہیں۔ یہ صنعتی تربیتی ادارے (ITI's) حیدرآباد، بنگلور اور دربھنگہ میں قائم ہیں۔ یہ ادارے یونیورسٹی کے ایک اہم مقصد یعنی اردو ذریعہ تعلیم سے تکنیکی و پیشہ وارانہ مضامین کی تعلیم کی فراہمی کی تکمیل کر رہے ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان کورس میں طالبات کا تناسب بہت کم ہے یا نہیں کے برابر ہے۔ تینوں ITI's میں کل طلبہ و طالبات کی تعداد 1494 ہے جن میں 99% فیصد طلبہ اور صرف 1% فیصد طالبات شامل ہیں۔ ان شواہد سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم معاشرے میں تکنکی تعلیم لڑکیوں کے لیے اب بھی غیر ضروری یا معیوب سمجھی جاتی ہے۔ نیچے دی گئی جدول میں ان کی تفصیل ملاحظہ کیجیے

Table - 3

Number of Students enrolled in MANUU ITI's, from the Date of Establishment to 2015 - 16 (Hyderabad, Bangalore &Darbhanga)

Schools	Year Of Establish ment	Total No. of Candi-dates	No. of Male Candi-dates	% of Male Candi-dates	No. of Female Candi-dates	% of Female Candi-dates
Hyderabad	(2007-08)	961	951	99%	10	1%
Bangalore	(2008-09)	164	156	95%	08	5%
Darbhanga	(2008-09)	369	368	99.73%	01	0.27%
	Total	1494	1475	99%	19	1%

سچر کمیٹی رپورٹ میں ملک کے مختلف علاقوں میں پالی ٹکنک کے قیام کی سفارش کی گئی تھی ۔جس کے مدِ نظر حیدرآباد، دربھنگہ اور بنگلور میں تین پالی ٹکنیک کالجس قائم کئے گئے ۔اس تعلیمی وتکنیکی پروگرام سے کئی مسلم طلبہ فیض یاب ہورہے ہیں۔اس میں داخلہ لینے والے طلبا کی کل تعداد 2932 ہے۔لیکن حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ اس تعداد میں 96% فیصد لڑکے شامل ہیں جبکہ صرف 4% فیصد لڑکیوں نے اس میں داخلہ لیا ہے۔اگر ہم ان کالجس کو ریاستی سطح پر علیحدہ کر کے دیکھیں تو ہمیں حیدرآباد کے پالی ٹکنیک کالج میں طالبات کو تناسب 6% فیصد نظر آئیگا۔جبکہ بنگلور اور دربھنگہ میں صرف 2%، 2% فیصد طالبات ہی موجود ہیں۔ان حقائق سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں ابھی لڑکیوں کے لیے پیشہ وارانہ کورسس کی تعلیم کا رجحان بہت زیادہ فروغ نہیں پایا ہے۔ذیل میں دیے گئے جدول میں تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں۔

Table -4

Number of Students in MANUU Polytechnics, from the Date of Establishment to 2015 - 16 (Hyderabad, Bangalore &Darbhanga)

Schools	Year Of Establish ment	Total No. of Candi-dates	No. of Male Candi-dates	% of Male Candi-dates	No. of Female Candi-dates	% of Female Candi-dates
Hyderabad	(2008-09)	1384	1305	94%	79	6%
Bangalore	(2008-09)	773	761	98%	12	2%
Darbhanga	(2008-09)	775	763	98%	12	2%
	Total	2932	2829	96%	103	4%

سچر کمیٹی رپورٹ یا دیگر رپورٹس میں مسلم خواتین کی اعلیٰ تعلیم میں کم شمولیت کی نشاندہی کی گئی تاہم مانو کے قیام کے بعد سے خواتین کی خاطر خواہ تعداد گریجویشن کی تعلیم کے حصول کے لیے آگے آرہی ہیں۔فاصلاتی طرزِ تعلیم کی وجہ سے مسلم خواتین کے تعلیمی موقف میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے جبکہ روایتی طرزِ تعلیم کے لیے بھی کئی ایک لڑکیاں آگے آئی ہیں۔ذیل کے جدول 5 اور 6 میں دونوں طرزِ تعلیم کے تحت خواتین کی شمولیت کو دیکھا جاسکتا ہے۔

Table-5

Total Number of Students (Under Graduate Programme-Distance Mode) from the Date of Establishment to 2015 - 16

Programme	Year of Establish ment	Total No. of Candi-dates	No. of Male Candi-dates	% of Male Candi-dates	No. of Female Candi-dates	% of Female Candi-dates
B.A	(1998-99	2,73,574	1,37,095	50%	1,36,482	50%
B.Com	(2001-02)	9,909	8,187	83%	1,722	17%
B. Sc	(2001-02)	29,845	14,461	48%	15,375	52%
	Total	3,13,328	1,59,743	51%	1,53,579	49%

Table-6

Total Number of Students (Under Graduate Programme - Regular Mode) from the Date of Establishment to 2015 - 16

Programme	Year of Establish ment	Total No. of Candi-dates	No. of Male Candi-dates	% of Male Candi-dates	No. of Female Candi-dates	% of Female Candi-dates
B.A	(2014-15)	154	117	76%	37	24%
B.Com	(2016-17)	36	33	92%	03	8%
B. Sc	(2014-15)	380	226	59%	154	41%
	Total	570	376	66%	194	34%

فاصلاتی نظام تعلیم میں انڈر گریجویٹ پروگرامس کی شروعات سنہ 99-1998 میں ہوئی۔اس طرزِ تعلیم کے تحت B.A, B.Com اور B.Sc تینوں کورسس شروع کیے گئے۔ان تعلیمی پروگرامس میں 99-1998 سے لیکر 16-2015 تک طلبہ و طالبات کی کل تعداد 3,13,328 رہی جن میں %51 فیصد مرد اور %49 فیصد خواتین شامل رہیں۔اگران پروگرامس کو علیحدہ کرکے دیکھیں تو B.A میں طلبہ و طالبات کا تناسب %50،%50 فیصد رہا جبکہ B.Com میں %83 فیصد طلبہ اور %17 فیصد طالبات رہیں اور B.Sc میں %48 فیصد لڑکے جبکہ %52 فیصد لڑکیاں شامل رہیں۔انفرادی طور پر اگر دیکھا جائے تو فاصلاتی تعلیم کے انڈر گریجویٹ پروگرام میں سائنس مضامین میں طالبات کے داخلہ کا تناسب زیادہ ہے۔

مانو کے فاصلاتی طرز تعلیم اور روایتی طرز تعلیم کے انڈر گریجویشن کورسس میں B.A,

B.Comاور B.Sc تینوں کورسس شامل ہیں۔ فاصلاتی طرز تعلیم میں 51% فیصد طلبہ اور 49% فیصد طالبات شامل ہیں۔ جبکہ روایتی طرز تعلیم کے انڈر گریجویٹ کورسس میں 66% فیصد طلبہ اور 34% فیصد طالبات شامل ہیں۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ دونوں قسم کے طرز تعلیم میں طالبات کا رجحان B.A, B.Com سے زیادہ سائنس کے مضامین کی طرف زیادہ ہے۔ اس بڑھتے رجحان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کی دستیابی کے نتیجے میں طالبات روایتی سوچ سے ہٹ کر کچھ اور کرنے کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں۔

Table-7

Total Number of Students (Post Graduate Programme - Distance Mode) from the Date of Establishment to 2015 - 16

Programme	Year of Establishment	Total No. of Candidates	No. of Male Candidates	% of Male Candidates	No. of Female Candidates	% of Female Candidates
M.A (Urdu)	(2004-05)	56,766	30,935	54%	25,831	46%
M.A (History)	(2005-06)	14,461	8,128	56%	6,322	44%
M.A (English)	(2006-07)	26,6385	15,692	59%	10,946	41%
M.A (Islamic Studies)	(2014-15)	469	364	78%	105	22%
	Total	98,334	55,119	56%	43,214	44%

فاصلاتی طرز تعلیم میں پوسٹ گریجویشن کورس کی شروعات 2004-05 میں ہوئی۔ جن میں ایم اے (اردو، ہسٹری، انگلش اور اسلامیات) شامل ہیں ان پروگراموں میں ابتداء سے لیکر 2015-16 تک طلبہ و طالبات کا تناسب 56% اور 44% فیصد ہے۔ تفصیل کے لیے جدول نمبر 7 ملاحظہ کی جا سکتا ہے۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ گریجویشن سطح تک طلبہ و طالبات کی تعداد لاکھوں میں تھی لیکن پوسٹ گریجویشن تک آتے آتے ان کی تعداد کم ہوگئی ہے اور ان میں طالبات کی تعداد اور تناسب میں بھی کافی فرق آ گیا ہے۔ جہاں گریجویشن سطح میں طالبات کی تعداد 1,53,579 تھی

وہیں وہ پوسٹ گریجویشن تک آتے آتے صرف 43,109 تک پہنچ گئی۔ یعنی ایک لاکھ سے بھی زیادہ فرق آ گیا ہے۔

Table-8

Total Number of Students (Post Graduate Programme - Regular Mode) from the Date of Establishment to 2015 - 16

Programme	Year of Establish ment	Total No. of Candi- dates	No. of Male Candi- dates	% of Male Candi- dates	No. of Female Candi- dates	% of Female Candi- dates
Urdu	(2004-05)	250	180	72%	70	28%
English	(2004-05)	503	425	83%	87	17%
Hindi	(2007-08)	159	102	65%	57	35%
Persian	(2007-08)	570	376	66%	194	34%
Arabic	(2007-08)	316	293	93%	23	7%
Tran.Stu	(2006-07)	126	10	80%	25	20%
DWE	(2004-05)	144	45	31%	99	69%
Pub. Add	(2006-07)	150	76	51%	74	49%
Pol.Sci	(2012-13)	50	29	58%	21	42%
S.W	(2007-08)	160	150	94%	10	6%
Is.Stu	(2012-13)	49	42	86%	07	14%
M.Com	(2012-13)	49	43	88%	06	12%
	Total	2,166	1,682	78%	484	22%

جدول نمبر (8) کے مطابق مانو کے روایتی طرز تعلیم کے پوسٹ گریجویٹ پروگرام میں طلبہ و طالبات کی کل تعداد 3,016 ہے جن میں 2461 یعنی 78% طلبہ اور 555 یعنی 22% فیصد طالبات شامل ہیں۔ روایتی طرز تعلیم میں پوسٹ گریجویشن کی سطح پر طالبات کا تناسب صرف 22% فیصد ہی ہے۔ اور ان میں بھی ہر مضمون میں یہ تناسب یکساں نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے سماج میں پدرسری نظام کا غلبہ ہے جس کا راست اثر طالبات کی تعلیم پر پڑتا ہے۔ آج کے دور میں بھی ہمارے سماج میں بہت سارے افراد دقیانوسی خیالات کے نظر آئینگے جو نہ صرف لڑکیوں کی تعلیم بلکہ انھیں پوسٹ گریجویشن یا اس سے آگے کی تعلیم حاصل کرنے سے روکتے ہیں۔ مانو میں بہت سارے شعبہ جات ایسے ہیں جہاں طالبات کا تناسب نہیں کے برابر ہے۔ جن میں قابل ذکر

شعبہ فارسی، کامرس اینڈ بزنس مینجمنٹ، سوشل ورک اور عربی شامل ہیں جہاں طالبات کا تناسب پوسٹ گریجویشن کورس میں بالترتیب 1% فیصد، 6%، 6% فیصد اور 7% فیصد ہے۔ اس کے بعد M.Com اور MCJ میں 12% بارہ فیصد، اسلامک اسٹڈیز اور MCJ میں 14%، 14% فیصد، انگلش میں 17% فیصد، مطالعات ترجمہ میں 20% فیصد، M.Sc (Math's) میں 24% فیصد، ایم اے (اردو) میں 28% فیصد، ہندی میں 35% فیصد طالبات موجود ہیں۔ جبکہ مانو میں صرف تین شعبہ جات ایسے ہیں جہاں طالبات کا تناسب 50% یا اس سے زیادہ ہے۔ ان میں شعبہ سیاسیات میں 42% اور نظم ونسق عامہ میں 49% فیصد اور شعبہ تعلیم نسواں میں سب سے زیادہ 69% فیصد طالبات موجود ہیں۔

اگر پوسٹ گریجویشن پروگرامس کے فاصلاتی اور روایتی طرز تعلیم کا تقابل کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فاصلاتی طرز تعلیم میں طالبات کا تناسب 44% فیصد ہے جبکہ روایتی طرز تعلیم میں یہ تناسب گھٹ کر صرف 22% فیصد ہی رہ گیا۔

Table-9

Number of Students in Professional Courses from the Date of Establishment to 2015 - 16

Programme	Year of Establish ment	Total No. of Candi-dates	No. of Male Candi-dates	% of Male Candi-dates	No. of Female Candi-dates	% of Female Candi-dates
B. Tech	(2004-05)	152	147	97%	8	3%
MBA	(2005-06)	536	506	94%	30	6%%
MCA	(2012-13)	100	88	88%	12	12%
MCJ	(2004-05)	214	185	86%	29	14%
	Total	1002	926	92%	76	8%

پوسٹ گریجویشن کے بعد جب ہم پروفیشنل کورسس کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں ہمیں بہت زیادہ (Gender Gap) صنفی خلاء نظر آتا ہے۔ پروفیشنل کورسس میں ہم نے B.Tech، MBA، MCA اور MCJ کو رکھا ہے۔ ان پروگراموں میں طلبہ وطالبات کی کل تعداد 1002 تھی جن میں 92% فیصد لڑکے اور صرف 8% فیصد لڑکیوں نے داخلہ لیا۔ پروفیشنل کورسس میں

لڑکیوں کے داخلے کی کمتر شرح سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلم معاشرہ میں تعلیمِ نسواں کے متعلق اگر چہ کہ تبدیلی آرہی ہے لیکن ابھی بھی پروفیشنل کورسس کی جانب رجحان کم نظر آتا ہے۔

ماہرین تعلیم کے مطابق تعلیم کے فروغ میں تربیت یافتہ اساتذہ موثر رول ادا کرتے ہیں لہذا یہ زور دیا گیا کہ سماج میں بہترین اساتذہ تیار کیے جائیں۔ جبکہ اردو میڈیم اسکولس میں تربیت یافتہ یا ہنر منداساتذہ کی سخت ضرورت محسوس ہوتی آئی ہے۔ وقت کی اس اہم ضرورت کے پیشِ نظر مولانا آزاد یونیورسٹی نے دوسالہ B.Ed فاصلاتی طرز تعلیم کے تحت شروع کیا جس میں 2004-05 سے لیکر 2015-16 تک طلبہ و طالبات کی کل تعداد 7,637 تھی جن میں 66% فیصد لڑکے اور 34% لڑکیاں شامل ہیں۔ یہ پروگرام سارے ہندوستان میں جملہ 23 سنٹرس میں دستیاب ہے۔

Table-10

Number of Students in Education & Training Programme-(Distance Mode) from the Date of Establishment to 2015-16 (B.Ed)

Course	Year of Establishment	Total No of Candidates	No of Male Candidates	% of Male Candidates	No. of Female Candidates	% of Female Candidates
B. Ed (DM)	2005-06	7637	5022	66%	2615	34%
	Total	7637	5022	66%	2615	34%

Table-11

Number of Students in Education & Training Programme-(Regular Mode) from the Date of Establishment to 2015-16 (B.Ed)

Course	Year of Establishment	Total No of Candidates	No of Male Candidates	% of Male Candidates	No. of Female Candidates	% of Female Candidates
D. El. Ed	2001-02	1416	435	29%	981	69%
B. Ed	2004-05	1509	989	66%	520	34%
M. Ed	2007-08	618	497	81%	121	19%
	Total	3543	1921	54%	1622	46%

مانو کے روایتی طرز تعلیم کے شعبہ تعلیم و تربیت میں تین تربیتی پروگرامس (D.Ed2001-02)، (B.Ed2004-05)، M.Ed(2007-08) اور دو تحقیقی پروگرامس M.Phil اور Ph.D چلائے جاتے ہیں۔ ان تین تربیتی پروگراموں میں کل طلبہ و طالبات کی تعداد 3543 ہے جن میں 54% فیصد طلبہ اور 46% فیصد طالبات شامل ہیں۔ اگر ہم ان پروگراموں کو علیحدہ کرکے دیکھیں تو ہمیں طالبات کا سب سے زیادہ تناسب D.Ed میں ملتا ہے جو 69% فیصد ہے۔ جبکہ B.Ed میں 34% فیصد اور M.Ed میں 19% فیصد طالبات شامل ہیں۔ ڈی ایڈ میں طالبات کا تناسب سب سے زیادہ ہے اور آگے بڑھتے بڑھتے B.Ed میں 34% فیصد اور اعلیٰ تعلیم تک آتے آتے صرف 19% فیصد ہی رہ جاتا ہے۔ جبکہ ایجوکیشن میں ایم فل اور پی ایچ ڈی تک یہ تناسب بالکل گھٹ جاتا ہے۔

Table-12

Number of Students in Research Programme (M. Phil) (from the year of commencement of the programme to academic year 2015-16)

Departments	Year of Establish ment	Total no of Candi-dates	No of Male Candi-dates	% of Male Candi-dates	No. of Female Candi-dates	% of Female Candi-dates
Urdu	(2006-07)	114	81	72%	32	28%
English	(2006-07)	66	46	70%	20	30%
Hindi	(2007-08)	102	61	60%	41	40%
Persian	(2007-08)	28	24	93%	02	7%
Arabic	(2010-11)	41	40	98%	01	2%
Tran.Stu	(2011-12)	47	41	87%	06	13%
W. E	(2006-07)	102	31	30%	71	70%
Pub. Add	(2009-10)	40	19	48%	21	52%
CSSEIP	(2009-10)	53	43	81%	10	19%
Mgt. Stu	(2012-13)	13	13	100%	00	0%
E & T	(2013-14)	09	07	78%	02	22%
	Total	615	406	66%	209	34%

مانو میں تحقیقی پروگرام ایم فل اور پی ایچ ڈی کی شروعات سنہ 07-2006 میں ہوئی۔
مختلف شعبہ جات جیسے اردو، انگلش، ہندی، فارسی، عربی، مطالعات ترجمہ، ویمنس اسٹڈیز، نظم ونسق عامہ، CSSEIP، مینجمنٹ اسٹڈیز، اور تعلیم وتربیت میں ایم فل (M.Phil) کا کورس دستیاب ہے۔ان تمام شعبہ جات میں پروگرام کی ابتداء سے لیکر 16-2015 تک طلبہ وطالبات کی کل تعداد 615 رہی۔جن میں 66% فیصد طلبہ اور 34% فیصد طالبات شامل ہیں۔لیکن طالبات کا تناسب بعض شعبوں میں زیادہ اور بعض میں صفر بھی رہا۔جیسے شعبہ مینجمنٹ اسٹڈیز میں طالبات کا تناسب 0% فیصد صفر رہا۔جبکہ سب سے زیادہ طالبات کا تناسب شعبہ ویمنس اسٹڈیز میں 70% فیصد رہا۔اس کے علاوہ شعبہ عربی میں 2% فیصد طالبات، فارسی میں 7% فیصد، مطالعات ترجمہ میں 13% فیصد، شعبہ تعلیم وتربیت میں 22% فیصد، CSSEIP میں 19% فیصد، اردو میں 28% فیصد انگلش میں 30% فیصد، ہندی میں 40% فیصد اور شعبہ نظم ونسق عامہ میں 52% فیصد طالبات شامل ہیں۔
جبکہ Ph.D میں مختلف شعبہ جات جیسے اردو، انگلش، ہندی، فارسی، عربی، مطالعات ترجمہ، ویمنس اسٹڈیز، نظم ونسق عامہ، CSSEIP، مینجمنٹ اسٹڈیز، تعلیم وتربیت، MCJ اور IT شامل ہیں۔اس پروگرام میں 07-2006 سے لیکر 16-2015 تک طلبہ وطالبات کی کل تعداد 329 رہی۔جن میں 71% طلبہ اور 29% فیصد طالبات شامل ہیں۔Ph.D میں بھی دو شعبہ مینجمنٹ اسٹڈیز اور عربی ایسے ہیں جن میں طالبات کا تناسب 0% فیصد رہا۔جبکہ ویمنس اسٹڈیز میں سب سے زیادہ 63% فیصد طالبات نے داخلہ حاصل کیا۔اس کے علاوہ شعبہ فارسی میں 20% فیصد، مطالعات ترجمہ میں 17% فیصد، شعبہ تعلیم وتربیت میں 27% فیصد، CSSEIP میں 20% فیصد، اردو میں 18% فیصد انگلش میں 29% فیصد، ہندی میں 41% فیصد اور شعبہ نظم ونسق عامہ میں 48% فیصد، MCJ میں 14% فیصد اور کمپیوٹر سائنس میں 25% طالبات شامل ہیں۔

پیشِ نظر مقالہ میں مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی بااختیاری کو بھی

جاننے کی کوشش کی گئی۔اس کے لیے چند ایک معیارات بنائے گئے جیسے حصولِ علم کے لیے کورس کا انتخاب، تعلیمی مدارج کو طے کرنے اور آگے بڑھانے میں ان کی فیصلہ سازی نیز تعلیم کی فراغت کے بعد ملازمت سے جڑنے کے رجحان کے علاوہ بنیادی حقوق وحاصل مراعات اور مواقعوں کے متعلق ان کی معلومات کو جانچا گیا۔اس مطالعہ کے لیے مانو میں زیر تعلیم 300 طالبات کا انتخاب کیا گیا۔منتخبہ نمونہ میں مختلف شعبوں اور تعلیمی و تحقیقی پروگراموں میں شریک طالبات و اسکالرز کو شامل کیا گیا۔منتخبہ نمونے کے تجزیہ سے یہ واضح ہوا کہ جواب دہندہ گان کا تعلق ملک کے مختلف شہروں نیز قصبات سے ہے۔ان میں 264 لڑکیاں غیر شادی شدہ اور 66 شادی شدہ خواتین شامل ہیں۔منتخبہ نمونہ کی سماجی حیثیت کے تجزیہ سے یہ شواہد بھی ملے کہ مانو کے قیام سے یہ تبدیلی آئی ہے کہ مسلم لڑکیاں شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھ رہی ہیں یا کچھ وقفہ کے بعد تعلیمی سفر میں شمولیت اختیار کر رہی ہیں۔

مانو میں تعلیم حاصل کر رہی طالبات کا تعلق یوں تو ملک کی تقریباً ریاستوں سے ہے لیکن اکثریت ریاستِ تلنگانہ، بہار اور اتر پردیش، اور مغربی بنگال سے تعلق رکھتی ہیں۔ جبکہ کشمیر سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی شرکت بھی ہر برس کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ان حقائق کے پیشِ نظر دو باتوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ایک یہ کہ مانو کے قیام سے مسلمانوں میں تعلیمِ نسواں کے فروغ کا رجحان بڑھ رہا ہے یہی وجہ ہے کہ دور دراز کے مقامات سے والدین اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیج رہے ہیں۔اس بات کی تصدیق لڑکیوں کے اقامت خانے میں ہر برس بڑھتی تعداد سے بھی ہوتی ہے۔ دوسری توجہ طلب بات یہ ہے کہ مختلف تحقیقی رپورٹس بالخصوص سچر کمیٹی رپورٹ میں مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی والی ریاستوں میں بہار،، مغربی بنگال اور اتر پردیش کے مختلف اضلاع کی نشاندہی کی گئی تھی۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان ریاستوں سے بھی زیادہ تعداد میں لڑکیاں حصولِ علم کے لیے آرہی ہیں۔مسلم معاشرے میں یہ ایک مثبت تبدیلی ہے جس کے نتیجے میں تعلیمِ نسواں کا فروغ اور بااختیاری کے لیے ماحول تیار ہو رہا ہے۔اس روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے امکانات روشن ہو رہے ہیں ۔

Table -13

جواب دہندگان کے والدین کی تعلیمی قابلیت

سلسلہ نشان	تعلیمی قابلیت	والد	تناسب	والدہ	تناسب
1.	ناخواندہ	-	-	61	20%
2.	خواندہ	22	7%	71	24%
3.	سکنڈری اسکول	86	29%	121	40%
4.	10th کلاس	94	32%	47	16%
5.	انٹرمیڈیٹ	52	17%	-	-
6.	گریجویٹ	37	12%	-	-
7.	پوسٹ گریجویٹ	9	3%	-	-
	جملہ تعداد	300	100%	300	100%

300 طالبات کے منتخبہ نمونے میں 245 لڑکیاں یعنی 82% طالبات خاندان کی پہلی لڑکی یا خاتون ہیں جو اعلیٰ تعلیم یا تحقیقی پروگرام سے وابستہ ہوئی ہیں۔ منتخبہ نمونے کے والدین کے نہ صرف تعلیمی موقف کو جدول نمبر 13 میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے بلکہ والد اور والدہ کی تعلیمی حیثیت میں صنفی فرق کو بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اس جدول کے مطابق جواب دہندہ گان کے والد نا خواندہ نہیں ہیں جبکہ خواندہ کا فیصد 7% ہے۔ جبکہ 20% فیصد جواب دہندگان کی والدہ ناخواندہ ہیں اور 24% خواندہ ہیں۔ جبکہ 29% جواب دہندگان کے والد سکنڈری اسکول تک تعلیم حاصل کئے ہوئے ہیں اور 40% جواب دہندگان کی والدہ بھی سکنڈری اسکول تک پڑھی ہیں۔ 32% فیصد جواب دہندگان کے والد ایس ایس سی کامیاب ہیں اور 16% فیصد ماؤں نے بھی ایس ایس سی کامیاب کیا ہے۔ جبکہ 17% فیصد جواب دہندگان کے والد انٹرمیڈیٹ، 12% فیصد جواب دہندگان کے والد نے گریجویشن اور 3% جواب دہندگان کے والد نے پوسٹ گریجویشن کیا ہے۔ جواب دہندگان کی ماؤں میں ایس ایس سی کے آگے تعلیم حاصل کرنے والی نہیں رہیں۔

تحقیق میں شامل جواب دہندگان کے والد یا شوہر مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں جن

میں روزانہ اجرت پیشہ، زرعی شعبہ سے وابستہ، غیر سرکاری ملازمین اور تجارت پیشہ وغیرہ شامل ہیں مجموعی تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ نمونے میں موجود جواب دہندگان کے اکثر والدین غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جواب دہندگان کے والد کی اکثریت یعنی 43% فیصد روزانہ اجرت کے کام کرتے ہیں اس کے علاوہ 17% فیصد والد زرعی شعبہ سے وابستہ ہیں اور 6% فیصد والد غیر سرکاری ملازمین ہیں جبکہ 32% فیصد جواب دہندگان کے والد تجارت پیشہ ہیں۔ صرف 2% افراد سرکاری ملازمت سے وابستہ ہیں۔ آمدنی کی شرح بھی دس ہزار سے تیس ہزار کے درمیان رہی۔

جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 54% فیصد طالبات نے ''اردو'' اسکولس میں تعلیم حاصل کی ہے جبکہ دوسرے نمبر پر 25% فیصد جواب دہندہ طالبات نے ''ہندی'' زبان میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اور 18% فیصد جواب دہندہ طالبات نے انگلش میڈیم میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن اردو کو دوسرے لازمی مضمون کی طرح پڑھا ہے۔ 3% طالبات دینی مدرسہ کی فارغ ہیں۔

حصول علم کے مقام پر دستیاب سہولیات کے بارے میں جب سوال کیا گیا تو 21% فیصد علاقوں میں اردو میڈیم اسکولس / پیشہ وارنہ کالجس / اسکالرشپ کی سہولت دستیاب ہے جبکہ 19% فیصد علاقوں میں صرف اردو میڈیم اسکولس اور اسکالرشپ کی سہولت موجود ہے۔ اس کے علاوہ 11% فیصد علاقوں میں صرف اردو میڈیم اسکولس اور 11% فیصد علاقوں میں اردو میڈیم اسکولس کے علاوہ کالجس بھی دستیاب ہیں۔ ان تمام کے علاوہ 12% فیصد علاقوں میں اردو میڈیم اسکولس / کالجس / پیشہ وارنہ کالجس اور گرلز ہاسٹلس کی بھی سہولیات دستیاب ہیں۔ جبکہ 26% فیصد علاقوں میں ان میں سے کسی قسم کی بھی سہولت دستیاب نہیں ہے۔

مندرجہ بالا جدول کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں حکومت کی جانب سے فراہم کردہ کئی پروگرام اور پالیسیوں کے باوجود آج بھی لڑکیوں کو حصول علم میں کئی رکاوٹیں درپیش ہیں۔ اس تحقیق اور تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ آج بھی 26% فیصد علاقے حصول علم کے مقام پر کسی بھی قسم کی سہولیات سے محروم ہیں۔ اسکے برخلاف 21% فیصد علاقوں میں اردو میڈیم اسکولس / پیشہ وارنہ کالجس / اسکالرشپ کی سہولت دستیاب ہے جبکہ 19% فیصد علاقوں میں صرف اردو میڈیم اسکولس اور اسکالرشپ کی سہولت دستیاب ہے اور 12% فیصد علاقوں میں اردو میڈیم

اسکولس / کالجس / پیشہ وارنہ کالجس کے ساتھ ساتھ گرلز ہاسٹلس کی سہولت دستیاب ہے۔

جواب دہندگان کے تعلیمی سفر بغیر کے تجزیہ سے پتہ چلا کہ %77 فیصد طالبات نے بنا کسی رکاوٹ کے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا جبکہ %23 فیصد طالبات نے کہا کہ انکے تعلیمی سفر میں بہت سی رکاوٹیں پیش آئیں لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے مسلسل کوشش کرتی رہیں، اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئیں۔

جب ان %23 فیصد طالبات سے تعلیمی سفر میں پیش آنے والی رکاوٹوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کی گئی تو مختلف نظریات اور وجوہات سامنے آئیں۔ جن میں %31 فیصد طالبات کے گھر میں لڑکیوں کی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی اسلئے انھیں زبردستی تعلیم کو روکنا پڑا۔ جبکہ %31 فیصد جواب دہندگان نے کہا اسکول / کالج گھر سے بہت دور فاصلے پر تھا اسلئے انھیں گھر میں آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے روکا جاتا۔ %23 فیصد طالبات نے کہا کہ اپنی مادری زبان میں آگے تعلیم کی سہولت کا نہ ہونا، تعلیم میں روکاوٹ کی وجہ بنی، کیونکہ وہ دوسری زبانوں پر اتنی قدرت نہیں رکھتے تھے کہ آگے تعلیم حاصل کرسکے۔ جبکہ %15 فیصد طالبات نے کہا کہ گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے ان کی تعلیم روک دی گئی تھی۔ لیکن مانو یونیورسٹی کے قیام کے بعد بہت ساری بلکہ ہزاروں کی تعداد میں طلبہ وطالبات کو اپنی مادری زبان میں علمی پیاس بجھانے کا موقع ملا۔

مانو میں کئی ایسی طالبات موجود ہیں جو نہ صرف اپنا پہلا کورس مکمل کرچکی ہیں بلکہ اسکے بعد بھی وہ دیگر کورسس میں داخلہ حاصل کرتے ہوئے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ طالبات تقریباً 8 یا 10 سال سے مانو سے جڑی ہیں۔ اور اپنی مادری زبان میں تعلیمی پیاس بجھا رہی ہیں۔ مانو میں نہ صرف روایتی / عصری بلکہ پروفیشنل کورسس نے بھی طلباء وطالبات کو اپنی طرف راغب کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

جواب دہندگان کی اکثریت یعنی %83 فیصد طالبات کو اپنا تعلیمی سفر جاری رکھنے میں گھر کے افراد کی رضامندی حاصل رہی، لیکن اسکے برخلاف %17 فیصد طالبات ایسی بھی رہیں جن کو گھر کے افراد کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ تعلیم کے حصول سے روکنے کی وجوہات جو سامنے آئیں وہ ذیل کی جدول میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

Table-14

لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق نظریاتی رکاوٹیں

سلسلہ نشان	آگے کی تعلیم سے روک نے کی وجہ	جواب دہندگان	تناسب
1.	لڑکیوں کی تعلیم کو غیر ضروری سمجھنا	12	24%
2.	جلد شادی کا تصور	16	32%
3.	لڑکیوں کے مقابلہ لڑکوں کو ترجیح دینا	10	20
4.	اعلیٰ تعلیم کو شادی میں رکاوٹ سمجھنا	12	24%
	جملہ تعداد	50	100%

وجوہات واسباب کے تجزیہ سے واضح ہوا کہ 24% فیصد گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے، اور 24% فیصد گھرانوں میں اعلیٰ تعلیم کو لڑکی کی شادی میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ اکثریت 32% فیصد گھرانوں میں آج بھی کم عمری کی شادی کا رواج باقی ہے، اسکے علاوہ 20% فیصد گھرانے ایسے بھی ہیں جہاں لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابل کمتر سمجھا جاتا ہے۔

طالبات کی اکثریت نے یعنی 83% فیصد نے تعلیم کے حصول کو خود مکتفی ہونے سے تعبیر کیا اور روزگار سے جڑنے نیز معاشی حصہ داری کا مقصد بتایا۔ جبکہ 18% طالبات نے والدین یا شوہر کی مرضی پر انحصار کیا۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں جہاں دنیا ایک طرف گلوبل ویلیج بن چکی ہے بغیر کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے دنیا کا تصور ناممکن ہے بلکہ یوں کہا جائے تو کم نہ ہوگا کہ دنیا Touch Screen ہوگئی ہے۔ تاہم اردو معاشرہ میں آج بھی ایسے افراد کی اکثریت ہے جو ٹکنالوجی کی ترقی سے کوسوں دور ہے۔ اس حقیقت کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ جب جواب دہندگان سے یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ آیا وہ یونیورسٹی میں داخلہ حاصل کرنے سے پہلے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا استعمال کرنا جانتی تھیں یا نہیں؟ تو جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 77% فیصد طالبات کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا استعمال کرنا نہیں جانتی تھیں، جبکہ 23% فیصد طالبات نے کمپیوٹر سے خواندگی کا اظہار کیا۔

تعلیم کو انسان کی ذہنی وفکری ترقی نیز پوشیدہ صلاحیتوں کی پہچان اور خوداعتمادی پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ مانا جاتا ہے۔یہی وہ خصوصیات ہیں جو بااختیاری کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔لہٰذا یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ اردو ذریعہ تعلیم کس حد تک ان خصوصیات کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہورہی ہیں۔تحقیق میں شامل جواب دہندگان سے تعلیمی سفر کے دوران ذہنی وفکری تبدیلیوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کی گئی جواب دہندہ طالبات کی اکثریت یعنی 31% فیصد طالبات نے کہا کہ اردو ذریعہ تعلیم کی وجہ سے انھیں ''تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کا موقع ملا'' اور ترقی کے نئے راستے ان پر آشکار ہونے لگے۔ 20% جواب دہندہ طالبات نے تمام جوابات پر نشان ثبت کیا جن میں ''خوداعتمادی کا فروغ،تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کا موقعہ، ذہنی وفکری سوچ میں تبدیلی،اپنے حقوق سے آگاہی،خود مکتفی ہونے کا شعور'' وغیرہ شامل ہے۔ 13% فیصد جواب دہندہ طالبات نے اپنی ''ذہنی وفکری سوچ میں تبدیلی'' کہا اور 15% فیصد جواب دہندگان نے اپنے اندر ''خوداعتمادی کو فروغ'' دیا ہے۔اسکے علاوہ 11% فیصد طالبات نے کہا کہ تعلیم کے ذریعہ ہی انسان اچھے اور برے میں فرق کرتا ہے اور ''اپنے حقوق سے واقفیت'' حاصل کرتا ہے جبکہ 10% طالبات نے کہا کہ تعلیم نہ صرف انھیں اچھا انسان بناتی ہے بلکہ نامناسب حالات میں انھیں ''خود مکتفی ہونے'' میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

Table-15

اردو میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع کے نتائج

سلسلہ نشان	تبدیلیاں	جواب دہندگان	جملہ تناسب
1.	خوداعتمادی کا فروغ	44	15%
2.	تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کا موقع	94	31%
3.	ذہنی وفکری سوچ میں تبدیلی	40	13%
4.	اپنے حقوق سے آگہی	32	11%
5.	خود مکتفی ہونے کا شعور بیدار ہوا	30	10%

20%	60	تمام جوابات	.6
100%	300	جملہ تعداد	

شخصیت میں مثبت تبدیلی کے متعلق جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 94% فیصد طالبات نے ہاں میں جواب دیا، جن میں جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 29% فیصد طالبات نے کہا کہ ''زندگی کو دیکھنے کے نظریہ میں مثبت تبدیلی آئی'' ہے، یعنی انھیں اپنی زندگی اور دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے بہت سارے مواقع دستیاب ہوئے ہیں۔ 18% فیصد جواب دہندہ طالبات نے کہا کہ وہ پہلے کوئی بھی بات کو سمجھنے اور فیصلہ لینے کے لئے ماں باپ پر منحصر ہوتی تھیں۔ لیکن تعلیم نے انھیں اس قابل بنایا کہ ''وہ خود فیصلہ کرنے کی مجاز بن پائیں''۔ جبکہ 21% فیصد طالبات نے بتایا کہ وہ ''خود فیصلہ کرنے کی مجاز بن پائیں، دوسروں کی صحیح رہنمائی کرنے کے قابل بن پائیں، زندگی کو دیکھنے کے نظریے میں مثبت تبدیلی اور سماج کی روایتی سوچ وفکر کو مٹانے میں انھیں کامیابی ملی ہے'' وغیرہ شامل ہیں۔ تفصیلات جدول نمبر (16) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

Table -16

مانو کے ذریعہ شخصیت میں مثبت تبدیلی۔ وجوہات

جملہ تناسب	جواب دہندگان	تبدیلی کی حد	سلسلہ نشان
18%	53	آپ خود فیصلہ کرنے کی مجاز بن پائیں	.1
21%	63	دوسروں کی صحیح رہنمائی کرنے کے قابل بن پائیں	.2
29%	87	زندگی کو دیکھنے کے نظریہ میں مثبت تبدیلی	.3
12%	35	سماج کی روایتی سوچ وفکر کو مٹانے میں کامیابی	.4
20%	62	تمام جوابات	.5
100%	300	جملہ تعداد	

خواتین کی تعلیم وترقی اور بااختیاری میں مانو کے 91% فیصد طالبات نے مثبت جواب

دیااوراس جامعہ کے اہم رول کی نشاندہی کی۔جبکہ 9% فیصد طالبات جواب نہیں دے پائیں۔

Table - 17

خواتین کی ترقی اور بااختیاری میں مانو کا رول۔وجوہات

سلسلہ نشان	وجوہات	جواب دہندگان	جملہ تناسب
1.	سماجی ومعاشی ترقی میں	94	31%
2.	معلومات کی وسعت میں	68	23%
3.	ذہنی وفکری تبدیلی میں	57	19%
4.	ایک فیصلہ ساز فرد بننے میں	81	27%
	جملہ تعداد	300	100%

جدول نمبر 17 کے مطابق جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 31% فیصد طالبات نے سماجی ومعاشی ترقی میں مانو کے رول کو اہم مانا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ان کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے راستہ کھل گئے اور جب وہ طالبات اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے تو ظاہری بات ہے کہ ان میں اتنی قابلیت پیدا ہو جائیگی کہ وہ سماج میں اپنا مقام بنا پائیں گے جس سے ان کی معاشی ترقی بھی ممکن ہوگی۔اسکے بعد دوسرے نمبر پر یعنی 27% فیصد طالبات نے کہا کہ انھیں ''ایک فیصلہ ساز فرد بننے میں مدد ملی''۔وہ اب کسی بھی معاملہ میں آزادانہ طور پر فیصلہ کرنے کی مجاز بن پائی ہیں۔23% فیصد طالبات نے کہا کہ انکی معلومات میں کافی وسعت ہوئی ہے اور 19% فیصد طالبات نے جواب دیا کہ ان کی ''ذہنی وفکری سوچ میں تبدیلی'' واقع ہوئی ہے۔

اس تجزیہ کے بعد مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کا قیام اور اردو ذریعہ تعلیم عمومی طور پر پورے مسلم معاشرہ بالخصوص خواتین کے لیے نہایت معاون ومددگار ثابت ہورہا ہے۔خواتین کے لیے جہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے راستے ہموار ہوئے ہیں وہیں ان کی بااختیاری کی طرف بھی رجحان بڑھا ہے۔جو ان کی سماجی ومعاشی حیثیت میں بہتری کے لیے ناگزیر ہے۔

اختتامیہ

- مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی مسلم خواتین کے تعلیمی موقف کو بدلنے میں موثر رول ادا کررہی ہے۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع اور دیگر سہولیات کی دستیابی کے نتیجے میں تعلیمِ نسواں کے متعلق مسلم معاشرہ کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اگرچیکہ پیشہ وارانہ کورسس اور چند مضامین کی طرف پیش قدمی کم ہے لیکن مجموعی طور پر اعلیٰ تعلیم اور تحقیقی پروگرامس میں خواتین کی شمولیت مستقبل کے اچھے امکانات کی نشاندہی کررہی ہے۔
- مسلم خواتین کی پست تعلیمی حیثیت کے لیے جن اسباب کی نشاندہی کی گئی ان کے سد باب میں مانو ایک اہم رول نبھارہی ہے۔
- مانو کے فاصلاتی نظامِ تعلیم کے تحت ملک کے طول وعرض میں جملہ 159 تعلیمی سنٹرز قائم ہیں۔ ان میں بیشتر وہ مقامات ہیں جنھیں مسلمانوں کی پست تعلیمی حیثیت کی بنیاد پر نشاندہی کی گئی۔ جن ہیں قابلِ ذکر اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال وغیرہ کے مختلف علاقے ہیں۔ ان علاقوں سے تعلق رکھنے والی زیادہ سے زیادہ طالبات فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم میں شامل ہورہی ہیں۔ ریاستِ کشمیر سے بھی داخلہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد میں ہر برس اضافہ ہورہا ہے۔
- مانو میں تعلیم حاصل کررہی طالبات کا تعلق یوں تو ملک کی تقریباً ریاستوں سے ہے لیکن اکثریت ریاستِ تلنگانہ، بہار اور اتر پردیش، اور مغربی بنگال سے تعلق رکھتی ہے۔ جبکہ کشمیر سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی شرکت بھی ہر برس کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر دو باتوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ ایک یہ کہ مانو کے قیام سے مسلمانوں میں تعلیمِ نسواں کے فروغ کا رجحان بڑھ رہا ہے یہی وجہ ہے کہ دور دراز کے مقامات سے والدین اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیج رہے ہیں۔ اس بات کی تصدیق لڑکیوں کے اقامت خانے میں ہر برس بڑھتی تعداد سے بھی ہوتی ہے۔ دوسری توجہ طلب بات یہ ہے کہ مختلف تحقیقی رپورٹس بالخصوص سچر کمیٹی رپورٹ میں مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی والی ریاستوں میں بہار،، مغربی بنگال اور اتر پردیش کے مختلف اضلاع کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان ریاستوں سے بھی زیادہ تعداد میں لڑکیاں حصولِ علم کے لیے آرہی ہیں۔ مسلم معاشرے میں یہ ایک مثبت تبدیلی ہے جس

کے نتیجے میں تعلیمِ نسواں کا فروغ اور بااختیاری کے لیے ماحول تیار ہو رہا ہے۔اس روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے امکانات روشن ہو رہے ہیں ۔

- فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نتیجے میں ترکِ تعلیم کو کم کرنے میں مدد مل رہی ہے۔اس تعلیمی پروگراموں میں شامل ہونے والی بیشتر خواتین تعلیم کے دوران کہیں ترکِ تعلیم کی تھیں تاہم انھیں تعلیم کو جاری رکھنے کا دوبارہ موقع فراہم ہوا۔دینی مدارس سے فارغ التحصیل طالبات بھی مانو کے تعلیمی پروگرامس میں شامل ہو رہی ہیں۔

- مانو کے تین ماڈل اسکولس مسلمانوں کی گنجان آبادی والے شہروں' حیدرآباد، دربھنگہ اور نوح (میوات) میں قائم ہیں۔ بالخصوص یہ اسکولس شہر کے پسماندہ علاقوں میں قائم کیے گئے تا کہ ضرورت مند افراد کی رسائی ان اسکولس تک ہو سکے اور انھیں معیاری تعلیم مہیا کی جا سکے۔قیام کے بعد سے ان اسکولس میں طلبہ و طالبات کے داخلہ کا کل تناسب بالترتیب 52% اور 48% فیصد رہا۔قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان اسکولس میں ترکِ تعلیم کرنے والے طلبا رہے لیکن ان میں لڑکوں کی تعداد زیادہ رہی۔جبکہ دسویں جماعت کا امتحان لکھنے والوں میں لڑکیوں کی تعداد قابلِ لحاظ رہی۔

- تینوں ITI's میں کل طلبہ و طالبات کی تعداد 1494 ہے جن میں 99% فیصد طلبہ اور صرف 1% فیصد طالبات شامل ہیں۔ان شواہد سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم معاشرے میں تکنکی تعلیم لڑکیوں کے لیے اب بھی غیر ضروری یا معیوب سمجھی جاتی ہے۔ابھی لڑکیوں کے لیے پیشہ وارانہ کورسس کی تعلیم کا رجحان بہت زیادہ فروغ نہیں پایا ہے۔

- فاصلاتی طرز کے تعلیمی پروگرامس میں گریجویشن کے لیے 99-1998 سے لے کر 16-2015 تک طلبہ و طالبات کی کل تعداد 3,13,328 رہی جن میں 51% فیصد مرد اور 49% فیصد خواتین شامل رہیں۔ فاصلاتی تعلیم کے انڈر گریجویٹ پروگرام میں سائنس مضامین میں طالبات کے داخلہ کا تناسب زیادہ ہے۔روایتی طرزِ تعلیم کے گریجویشن کورسس میں 66% فیصد طلبہ اور 34% فیصد طالبات شامل ہیں۔اس طرزِ تعلیم میں بھی سائنس کی طرف لڑکیوں کا رجحان زیادہ دکھائی دے رہا ہے۔اردو ذریعہ تعلیم میں مواقع کے نتیجے میں بہت سی خواتین سائنسی مضامین کی تعلیم تک رسائی حاصل کر رہی ہیں۔

- مانو کے فاصلاتی طرز تعلیم میں پوسٹ گریجویشن کورس کی شروعات تعلیمی سال 2004-05 سے ہوئی۔ اس طرزِ تعلیم کے ساتھ 2016 تک ایم۔اے، اردو، ہسٹری، انگلش اور اسلامیات مضامین میں داخلہ لینے والے افراد میں مرد و خواتین کا تناسب بالترتیب 56% اور 44% فیصد رہا۔ جبکہ روایتی طرز تعلیم کے پوسٹ گریجویٹ پروگرام میں اگرچہ کئی مضامین میں تعلیم فراہم کی جارہی ہے لیکن تجزیہ میں یہ بات واضح ہوئی ہے کہ استفادہ کرنے والوں کی تعداد کم ہے۔ جیسے 2015-2016 داخلہ لینے والوں میں کل تعداد 3,016 رہی۔ جن میں 2461 یعنی 78% لڑکے اور 555 یعنی 22% فیصد لڑکیاں شامل ہیں۔ اگر پوسٹ گریجویشن پروگرامس کے فاصلاتی اور روایتی طرز تعلیم کا تقابل کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فاصلاتی طرز تعلیم میں طالبات کا تناسب 44% فیصد ہے جبکہ روایتی طرز تعلیم میں یہ تناسب گھٹ کر صرف 22% فیصد ہی رہ گیا۔ جبکہ بعض ایسے مضامین ہیں جن میں لڑکیوں کا رجحان نہایت کم ہے۔ مجموعی طور پر گریجویشن کی بہ نسبت پوسٹ گریجویشن تک آتے آتے لڑکیوں کا تناسب کم ہوتا نظر آرہا ہے۔ باوجود اس کے ایک بڑی تعداد میں خواتین کا پوسٹ گریجویشن تک تعلیم حاصل کرنا ایک اہم تبدیلی کی نشاندہی کررہا ہے۔
- پروفیشنل کورسس جیسے B.Tech، MBA، MCA اور MCJ، تعلیمی پروگراموں میں طلبہ و طالبات کی کل تعداد 1002 رہی۔ جن میں 92% فیصد لڑکے اور صرف 8% فیصد لڑکیاں شامل ہیں۔ پوسٹ گریجویشن و پروفیشنل کورسس کے یہ اعداد و شمار بتا رہی ہیں کہ مسلم معاشرہ میں آج بھی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم یا پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہت سی رکاوٹیں درپیش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خاطر خواہ تعداد وہاں تک نہیں پہنچ سکتی، جس کی واضح تصویر ہمارے سامنے موجود ہے۔
- سچر کمیٹی رپورٹ میں مسلم طبقہ میں تعلیم کی کمی یا غیر معیاری تعلیم کے اسباب میں ایک اہم سبب تربیت یافتہ ٹیچرس کی کمی بتائی گئی۔ بالخصوص اس رپورٹ میں تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لیے تربیت یافتہ خاتون اساتذہ کی ضرورت پر توجہ دلائی گئی۔ اس ضمن میں مانو ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ فاصلاتی طریقہ تعلیم سے بی ایڈ کا دو سالہ تربیتی پروگرام 2004-05 سے شروع کیا

گیا۔تب سے لیکر 16-2015 میں داخلہ لینے والے افراد کی کل تعداد 7,637 تھی جن میں 66% فیصد طلبہ اور 34% طالبات شامل ہیں۔اس تربیتی پروگرام کے نتیجے میں سینکڑوں افراد بشمول خواتین کو اپنی تعلیمی وسماجی حیثیت کو بدلنے کا موقع مل رہا ہے۔شعبہ تعلیم وتربیت کے تحت روایتی طرز پر تین تربیتی پروگرامس (D.Ed 2001-02)، B.Ed(2004-05)، M.Ed(2007-08) دستیاب ہیں۔ان تین تربیتی پروگراموں میں کل طلبہ وطالبات کی تعداد 3543 رہی جن میں 54% فیصد طلبہ اور 46% فیصد طالبات شامل ہیں۔اگر ہم ان پروگراموں کو علیحدہ کرکے دیکھیں تو ہمیں طالبات کا سب سے زیادہ تناسب D. El.ed میں 69% فیصد نظر آئیگا۔جبکہ B.Ed میں 34% فیصد اور M.Ed میں 19% فیصد طالبات شامل ہیں۔تربیتی پروگرامس کے مدارج میں اضافہ کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی شرکت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔پھر بھی ایک قابلِ لحاظ تعداد ان تعلیمی پروگرامس سے استفادہ کررہی ہیں اور مختلف سرکاری وغیر سرکاری اسکولس میں تدریس انجام دے رہی ہیں۔

- مانو میں تحقیقی پروگرام ایم فل اور پی ایچ ڈی کی شروعات سن 07-2006 میں ہوئی۔ مختلف شعبہ جات میں ایم فل (M.Phil) کا کورس دستیاب ہے۔ان تمام شعبہ جات میں پروگرام کی ابتداء سے لیکر 16-2015 تک ریسرچ اسکالرس کی کل تعداد 615 رہی۔جن میں 66% فیصد مرد اور 34% فیصد خواتین شامل ہیں۔قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تحقیقی پروگرامس میں خواتین کی شمولیت بعض شعبوں میں زیادہ اور بعض میں بالکل نہیں ہے۔

- پی ایچ ڈی پروگرام میں تاحال ریسرچ اسکالرس کی کل تعداد 329 رہی۔جن میں 71% مرد اسکالرز اور 29% فیصد خاتون اسکالرز شامل ہیں۔قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تحقیقی پروگرامس میں خواتین کی شمولیت بعض شعبوں میں زیادہ اور بعض میں بالکل نہیں ہے۔تاہم اقلیتوں یا یونی ورسٹی اسکالرشپ کی فراہمی کے نتیجے میں خواتین تحقیقی پروگراموں میں شامل ہو رہی ہیں۔ورنہ ماضی میں تعلیم کے اس اعلیٰ درجہ پر مسلم خواتین کے لیے تعلیمی خرچ ایک بڑی رکاوٹ بنا رہا۔

- منتخبہ موضوع پر مطالعہ وتجزیہ کے لیے مانو کی 300 طالبات کا انتخاب کیا گیا۔منتخبہ نمونہ میں مختلف شعبوں اور تعلیمی وتحقیقی پروگراموں میں شریک طالبات واسکالرز کو شامل کیا گیا۔

جواب دہندہ گان کا تعلق ملک کے مختلف شہروں نیز قصبات سے ہے۔ان میں 264 لڑکیاں غیر شادی شدہ اور 66 شادی شدہ خواتین شامل ہیں۔منتخبہ نمونہ کی سماجی حیثیت سے یہ شواہد مل رہے ہیں کہ مسلم لڑکیاں شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھ رہی ہیں یا کچھ وقفہ کے بعد تعلیمی سفر میں شمولیت اختیار کر رہی ہیں۔خواتین کی تعلیم میں شرکت کو یقینی بنانے کے لیے مانو میں حدِ عمر میں اضافہ، فیس کی رقم میں کمی اور دیگر سہولیات کی فراہمی کے نتیجے میں بہتر نتائج سامنے آرہے ہیں۔

- 300 طالبات کے منتخبہ نمونے میں 245 لڑکیاں یعنی 82% طالبات خاندان کی پہلی لڑکی یا خاتون ہیں جو اعلیٰ تعلیم یا تحقیقی پروگرام سے وابستہ ہوئی ہیں۔ 52% ایسی طالبات رہیں جو مانو میں نہ صرف اپنا پہلا کورس مکمل کر چکی ہیں بلکہ اسکے بعد بھی وہ دیگر کورسس میں داخلہ حاصل کرتے ہوئے اپنی آگے کی تعلیم کے سلسلہ کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ چند ایک ایسی طالبات ہیں جو گریجویشن کی تکمیل کرتے ہوئے پی ایچ ڈی تک پہنچ گئی ہیں اور تقریباً 8 یا 10 سال سے اس یونیورسٹی سے جڑی ہوئی ہیں۔
- تجزیہ سے یہ واضح ہوا کہ اردو ذریعہ تعلیم کے مواقع نے خواتین میں نہ صرف تعلیم کے فروغ کا رجحان پیدا کیا ہے بلکہ روزگار سے وابستگی اور معاشی حیثیت کو بہتر بنانے کی خواہش بھی پیدا کی ہے۔
- جواب دہندگان نے بتایا کہ معلومات کے ذرائع تک رسائی، حقوق سے آگاہی، کمپیوٹر وانٹرنیٹ کا استعمال اور انگریزی بول چال میں مہارت کے کورس کے علاوہ سیمینارز اور مختلف تربیتی وادبی اور ثقافتی پروگرامس میں شرکت جیسے پروگرامس ان کی شخصیت سازی میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ مجموعی طور پر ان میں تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی اور فیصلہ سازی کا فروغ ہو رہا ہے۔ جس سے وہ ایک بااختیار فرد بن سکتے ہیں اور ملک وسماج اور اپنے خاندان کی ترقی کے حصہ دار بن سکتے ہیں،۔ جیسا کہ حاصل شدہ مواد کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آئی۔ طالبات کی اکثریت یعنی 91% فیصد طالبات نے ''اہم رول'' ہے کہا۔ جبکہ 9% فیصد طالبات صحیح جواب نہ دے پائیں۔
- طالبات نے بتایا کہ مانو میں تعلیم حاصل کرنے سے انکی شخصیت میں مثبت تبدیلی آئی

ہے اور خود اعتمادی کا فروغ ہوا ہے۔ جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 94% فیصد طالبات نے ہاں میں جواب دیا، ان میں جواب دھندگان کی اکثریت یعنی 29% فیصد طالبات نے کہا کہ ''زندگی کو دیکھنے کے نظریہ میں مثبت تبدیلی آئی'' ہے، یعنی انھیں اپنی زندگی اور دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے بہت سارے مواقع دستیاب ہوئے۔ 18% فیصد جواب دھندہ طالبات نے کہا کہ وہ پہلے کوئی بھی بات کو سمجھنے اور فیصلہ لینے کے لئے ماں باپ پر منحصر ہوتی تھی۔ لیکن تعلیم نے انھیں اس قابل بنایا کہ'' وہ خود فیصلہ کرنے کی مجاز بن پائیں''۔ اسکے بعد 21% فیصد طالبات نے تمام جوابات پر ٹک لگایا۔ جن میں'' آپ خود فیصلہ کرنے کی مجاز بن پائیں، دوسروں کی صحیح رہنمائی کرنے کے قابل بن پائیں، زندگی کو دیکھنے کے نظریے میں مثبت تبدیلی، سماج کی روایتی سوچ وفکر کو مٹانے میں کامیابی ملی'' وغیرہ شامل ہیں۔ ہمارے سماج میں آج بھی پدرسری نظام کا غلبہ اتنا زیادہ شامل ہیکہ ہم چاہتے ہوئے بھی پرانے روایات کو بدلنے کی کوشش میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہم سماج میں رائج روایتی سوچ وفکر کو مٹانے میں دشواری محسوس کرتے ہیں، لیکن ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ ایسی ہی کوشش ہماری تحقیق میں شامل جواب دھندگان نے کی اور 12% فیصد طالبات'' سماج میں رائج روایتی سوچ وفکر کو مٹانے میں کامیاب'' بھی ہوئے۔

- سفارشات میں لڑکیوں نے مزید سہولتوں نیز ہنرمندیوں کے تربیتی اور شعور بیداری پروگراموں کی ضرورت پر زور دیا۔
- اس تجزیہ کے بعد مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام اور اردو ذریعہ تعلیم عمومی طور پر پورے مسلم معاشرہ بالخصوص خواتین کے لیے نہایت معاون و مددگار ثابت ہورہا ہے۔ خواتین کے لیے جہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے راستے ہموار ہوئے ہیں وہیں ان کی بااختیاری کی طرف بھی رجحان بڑھا ہے۔ جو ان کی سماجی و معاشی حیثیت میں بہتری کے لیے ناگزیر ہے۔

سفارشات:

ان نتائج کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مانو کے تحت مزید اسکولس اور گریجویشن سطح کے کالجس بالخصوص مسلمانوں کی کثیر آبادی والے علاقوں میں لڑکیوں کے کالجس کے ساتھ ساتھ ہاسٹلس قایم کیے جائیں اور مکمل مفت تعلیم دی جائے تو اور بھی بہترین نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ مرکزی حکومت پالیسی سطح پر اس جانب توجہ دے اور مسلمان خواتین کی ترقی و بااختیاری کے لیے مزید اقدامات کو اپنائے اور انھیں مابعد سچر کمیٹی لائحہ عمل کا حصّہ بنایا جائے تو یہ کام ممکن ہوسکتا ہے۔ منسٹری آف ماینارٹی ویلفیر کی جانب سے لڑکیوں کے لیے مختلف مہارتوں کے فروغ کے تربیتی پروگرام منعقد کیے جائیں۔ بلکہ اسے اردو یونیورسٹی کے نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ منسٹری آف ویمن اینڈ چائلڈ ویلفیر، نیشنل ویمن کمیشن یا اسٹیٹ ویمن کمیشن کی جانب سے ہر برس صنفی مساوات کے پروگرامس منعقد کیے جائیں۔

ڈاکٹر آمنہ تحسین مرکز برائے مطالعاتِ نسواں، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی انچارج ہیں۔
آمنہ تبسم مرکز برائے مطالعاتِ نسواں، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:190-199
Dr. Iqbalun Nisa, Maqbool-e-Am Adab, Ibne Safi aur Sinfi Masawaat

اقبال النساء

مقبولِ عام ادب، ابنِ صفی اور صنفی مساوات

اردو میں مقبولِ عام ادب کی اصطلاح انگریزی popular literature سے ماخوذ ہے۔ مقبولِ عام ادب بظاہر ایسے ادب کو کہا جاتا ہے جسے معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی شوق سے پڑھتے اور لُطف اندوز ہوتے ہوں۔ مقبولِ عام ادب کو سنجیدہ ادب یعنی serious literature کے زمرے سے خارج سمجھا جاتا ہے بلکہ اِسے کمتر درجے کا ادب سمجھا جاتا ہے۔ سنجیدہ ادب تدبّر و تفکّر، انکشاف و اکتشاف اور جمالیاتی قدروں سے مُزیّن ہوتا ہے۔ وہ عمیق مشاہدے، شخصی تجربے اور کڑی ریاضت کے بطن سے برآمد ہوتا ہے اور سنجیدہ ادب کے کئی کارنامے دائمی بقا کے حامل ہوتے ہیں اور کبھی کبھی کلاسیکی مرتبے پر فائز ہوجاتے ہیں۔ سنجیدہ ادب میں آفاقیت کا وہ جوہر ہوتا ہے کہ وہ کسی مخصوص زماں و مکاں کے اندر وجود میں آنے کے باوصف زماں و مکاں کی حدود سے ماورا ہوجاتا ہے۔ گذرتے وقت کے ساتھ اس کے پیرایۂ بیان یا اسلوب پر کہنگی کے سائے دراز ہونے لگتے ہیں لیکن اُس کی ادبی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی تو اُس کا پُرانا متروک محاورہ ایسی خوبی بن جاتا ہے کہ عصری تخلیق کار اپنی فنّی کاوشوں میں اُسے برت کر انہیں نئی معنویت سے ہمکنار کردیتا ہے۔ میر تقی میر کو گزرے دو صدیاں ہوگئیں۔ ناصر کاظمی نے اپنی شعری کاوشوں میں نہ صرف میر کے لب و لہجے کی بازآفرینی کی بلکہ کئی شعرا نے میر کی لفظیات کو اپنے کلام کا حصہ بنالیا۔ دو صدیوں پُرانی کتاب باغ و بہار کو ہم آج بھی پُرشوق دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سعدی شیرازی کو گذرے آٹھ صدیاں ہوگئیں، اُن کی حکایات اور دانش پاروں کی دلچسپی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ کسی موزوں صورتِ حال میں اُن کا کوئی شعر یا فقرہ بے ساختہ زبان پر آجاتا

ہے۔شیکسپئیر اور مولانا روم نے اپنے ادبی افکار سے پوری دنیا کو اپنا اسیر کر رکھا ہے۔ پڑھنے والے سنجیدہ ادب کے کئی حصوں کو اپنا جُز وِاظہار بنا کر اپنی تحریر و تقریر کی وقعت و دلکشی بڑھاتے اور اپنی قوّتِ ترسیل کی بلاغت کو دو چند کر دیتے ہیں۔سنجیدہ ادب پڑھنے والے کے ذہن پر دیرپا نقش چھوڑتا ہے اور اُس کے ذہنی تموّل میں فروغ کا باعث بنتا رہتا ہے۔

مقبولِ عام ادب سنجیدہ ادب کی بہت ساری خوبیوں سے خالی ہوتا ہے۔اِس کی پہلی پہچان یہ ہے کہ یہ شعلۂ مستعجل کی طرح چکا چوند پیدا کر کے اندھیروں میں گُم ہو جاتا ہے۔مقبولِ عام ادب کی ادبی بقا کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔اپنے وقت میں وہ پڑھنے والوں کی زبردست توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔وقت گذر چکنے کے بعد وہ تاریخ کے کوڑے دان کی زینت بن کر رہ جاتا ہے۔ادب کے جاوداں شہ پاروں کی طرح اُس کی تخلیق میں خونِ جگر صرف نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ریاضت طلب ہوتا ہے۔حیاتِ انسانی کے تجربات کی گہرائی اور تفکّر کی بھی اُسے کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔اُس کی اہمیت اور دلچسپی وقتی ہوتی ہے اور گذرتے وقت کے ساتھ معدوم ہوتی چلی جاتی ہے۔اردو میں اے آر خاتون، نسیم حجازی، رئیس احمد جعفری، رضیہ بٹ، ایم اسلم، عفّت موہانی، نسیم انہونوی، دت بھارتی، عادل رشید، اظہار اثر، اکرم الہ آبادی، گلشن نندہ، عارف مارہروی، مسعود جاوید، صادق حُسین سردھنوی، مظہرالحق علوی وغیرہ کے ناول مقبولِ عام ادب کے اہم نام ہیں۔اپنے اپنے دور میں اُن کی تحریروں کی بڑی دھوم تھی۔شائقین اُن کے ناولوں کے مشتاق رہا کرتے تھے۔آج ان میں سے بیشتر ادبی اُفق سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

سنجیدہ ادب اپنی دائمی قدروں کے باوجود ہر قاری کی دلچسپی کا ضامن نہیں ہوتا۔اُس کے لیے ایک مخصوص ذہنی معیار اور تربیت یافتہ ذوق شرط ہے۔عام قاری کے مقابلے میں اعلیٰ ادب کے تقاضوں پر پورے اُترنے والے قاری ہر دور میں اقلیت میں رہے ہیں۔عام قاری ہمیشہ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔ وہ لُطفِ مطالعہ کے لیے مقبولِ عام ادب کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ وقتی حظ و مسرّت مقبولِ عام ادب کی سب سے اہم قدر ہے۔قاری اُسے پڑھتا بھی وقت گذاری کے لیے ہے۔مقبولِ عام ادب کے ذریعے نہ وہ زندگی کی کوئی بڑی بصیرت حاصل کرنا چاہتا ہے اور نہ اپنے ذہن کو تھکانا چاہتا ہے۔وہ اِس سُبک مطالعے کے ذریعے صرف اپنے ذہن

کی تروتازگی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

مقبولِ عام ادب اور صنفی مساوات کا موضوع بڑی وسعت کا حامل ہے۔ یہاں اُس کے تفصیلی جائزے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں مقبولِ عام ادب کے سرتاج، ابنِ صفی کے حوالے سے صنفی مساوات کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔

اردو میں مقبولِ عام ادب کا سب سے بڑا نام ابنِ صفی کا ہے۔ بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی کے دوران ابنِ صفی مقبولِ عام ادب کے بے تاج بادشاہ بنے رہے۔ اس عرصے میں ملک کا شاید ہی کوئی پڑھا لکھا گھرانہ ہوگا جہاں ابنِ صفی کو نہ پڑھا گیا ہو۔ ابنِ صفی سے ہمارے مقبول عام ادب کا ایک پورا عہد منسوب ہے۔ ابنِ صفی نے 1952 اور 1980 کے درمیان کوئی دو سو سے زیادہ ناول لکھے۔ مقبولِ عام ادب کی روایت کے خلاف ابنِ صفی کی وفات کے بعد بھی اُن کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اُن کے قاریوں کی بڑی تعداد آج بھی اُن کے ناولوں کے کئی کئی دور اُسی انہماک وشوق کے ساتھ پورے کرنے میں مشغول ہے جس انہماک سے ایک سچّا دیندار مسلمان قرآنِ کریم کے دور پورے کرتا رہتا ہے۔

ابنِ صفی کے ناولوں کے کئی امتیازات ہیں۔ جرائم وجرائم کی تفتیش اور مجرم کو قرار واقعی سزا، جاسوسی ناولوں کا مرکزی سروکار رہے۔ دوسرے جاسوسی فکشن نگار اس بنیادی سروکار کے دائرے میں چکر کاٹ کر رہ جاتے ہیں۔ ناول پورا ہوا اور آسودگی کا وہ احساس کہ ایک مہم کامیابی سے سر کر آئے ہوں اور بات وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ابن صفی اپنے پڑھنے والوں کو جرم وسزا کے اس دائرے کے متوازی متعدد دائروں کی سیاحت کرالاتے ہیں۔ اور ہر بار کامیاب مہم کی سرخروئی کا احساس نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں کوئی خلش باقی رہ جاتی ہے۔ پڑھنے والے کے احساسات میں ایک ارتعاش سا ہوتا رہتا ہے۔ ناول کے مطالعہ کے دوران جن مقامات سے سرسری سا گزر آئے تھے، وہ حافظے میں تازہ ہو کر ایک نئی معنویت آشکار کرنے لگتے ہیں۔ یہی وہ بازآفرینی ہے جو ابن صفی کے ناولوں کی تازگی برقرار رکھتی ہے اور ان کے ناول دریافت نو کے مرحلے سے بار بار گزرتے رہتے ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں میں ایک نکتہ تواتر کے ساتھ متوجہ کرتا رہتا ہے۔ انہوں نے بارہا جرم کی داستان کے ساتھ جرم کے محرکات کو نمایاں کیا ہے اور اس طرح اس مہذب معاشرے پر ضرب لگائی ہے جو جرم کے محرکات کا

سبب بنا ہے۔انہوں نے خطرناک مجرموں کی نفسیات کے تجزیے سے وہ گرہیں ڈھونڈھ نکالی ہیں جو ان کے مجرم بن جانے کی اصلی وجہ ہیں۔ابن صفی نے جرم سے ہمیشہ نفرت کی ہے لیکن مجرموں سے انہیں ہمدردی رہی ہے کہ مجرم پیدا نہیں ہوتے بلکہ معاشرے کے رویے کسی کو مجرم بناتے ہیں۔یہ ابن صفی کے فن کی خوبی ہے کہ ان کے ناولوں میں جہاں تفکر کو مہمیز کرنے کے مقام آتے ہیں وہاں وہ فلسفیانہ موشگافیوں کے بجائے محض اشاروں میں کسی اہم نکتے کی طرف توجہ دلا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔وہ ناول کے گودڑ میں لعل کی بس ایک جھلک دکھا دیتے ہیں اور پڑھنے والے کی توفیق پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس لعل کی قدر و قیمت آنکے اور اسے اپنی کوشش سے برآمد کر لے۔

ابن صفی کے ناولوں کے امتیازات میں صنفی مساوات کا تصور، خاص اہمیت کا حامل ہے۔ابن صفی جس وقت ناول لکھ رہے تھے،اس وقت اردو ادب کی تخلیقی پیداوار یا تنقید میں بحثیت ایک نظریہ صنفی مساوات کا دور دور تذکرہ نہیں ملتا۔اس عنوان یا پہلوئے زیست کو باضابطہ اظہار یا گفتگو کے قابل نہیں سمجھا گیا۔دو ایک مثالیں اگر مل بھی جاتی ہیں تو وہ ایک منضبط تصور کی نتیجے میں نہیں، بیان واقعی کے ذیل میں آتے ہیں۔جیسے کرشن چندر کے ناول ''ایک عورت ہزار دیوانے'' میں لاچی کا کردار جو دراصل خانہ بدوشوں کے طرز حیات کی ایک بدیہی حقیقت ہے لیکن کرشن چندر سے پہلے کسی نے اسے نمایاں نہیں کیا تھا۔ابن صفی نے اپنے ناولوں میں صنفی مساوات کے پہلو پر خاص توجہ صرف کی ہے۔انہیں اپنی اس کوشش میں کامیابی بھی غالباً اس لیے حاصل ہوئی کہ ان کے کرداروں کو عام اور روزمرہ زندگی کے کردار نہیں بلکہ ایک بیرونی دنیا کے کردار سمجھا گیا جو معاشرے کی مسلمہ روایات کے لیے خطرہ نہیں سمجھے گئے۔

ابنِ صفی کے نسوانی کردار مختلف اور بوقلموں رنگوں میں پیش ہوئے ہیں لیکن ہر رنگ میں بہار کا اثبات کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔جس دور میں ابنِ صفی نے عورت کے یہ مختلف روپ پیش کیے، اُس دور میں اور اُس کے بعد بھی اردو فکشن میں ایسی صفات کی حامل عورتیں دور دور تک دکھائی نہیں دیتیں۔جُرم ابنِ صفی کے ناولوں کا مرکزی سروکار ہے۔لیکن اُنہوں نے اپنے ناولوں کو صرف جُرم کی داستان تک محدود نہیں رکھا۔انہوں نے اِس لذیذ حکایت میں انسان کے سماجی اور فکری مسائل کو ملا کر اُسے لذیذ تر بنا دیا ہے۔اِسی لیے اُن کے ناولوں میں صرف جرائم پیشہ مرد و عورتیں نہیں ہیں۔جرائم

کی دنیا سے ہٹ کر بھی اُن کے ناولوں میں عورت کے متعدد روپ ملتے ہیں۔ اِن میں انتہائی بااثر امیر اور اونچے طبقے کی عورتیں بھی ہیں اور اوسط اور نچلے طبقے کی عورتیں بھی۔ جرائم پیشہ عورتیں بھی ہیں اور جُرم سے نفرت کرنے والی عورتیں بھی۔ متوسط طبقے کے گھرانوں کی لڑکیاں بار باراُن کے ناولوں میں نظرآتی ہیں۔ آزاد خیال عورتیں بھی ہیں اور دقیانوس عورتیں بھی۔ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے والی بھی ہیں اور مردوں پر حاکم عورتیں بھی۔ لیکن ہر عورت اپنی صفات و جہات میں منفرد ہے۔

ابنِ صفی کے ناولوں میں عالمی جرائم پیشہ عورتوں کے دو نام سب سے پہلے ذہن میں آتے ہیں۔ تھریسیا اور نانوتہ۔ یہ دونوں غیر معمولی عورتیں ہیں۔ تھریسیا ایک عالمی جرائم پیشہ گروہ کی سربراہ ہے اور اسی نسبت سے وہ ایک خفیہ ملک زیرولینڈ کی حاکم بھی ہے۔ زیرولینڈ اسی زمین کا ایک ایسا خطہ ہے جو دھند میں ڈوبا ہوا ہے اور مہذب دنیا کو اس کی کوئی خبر نہیں۔ اِس ملک کے تمام سربراہ جرائم پیشہ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کا ایک ہی مشن ہے کہ اپنی حیرت انگیز تکنیکی ترقیوں کے ذریعے پوری دنیا کو اپنا غلام بنالیں۔ اس کے لیے وہ دنیا کے امیروں کو بلیک میل کر کے روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے سائنسی اور فوجی راز چراتے ہیں۔ دنیا کے عظیم سائنس دانوں کا اغوا کر کے اپنی تجربہ گاہوں میں اُن سے تباہ کن حربے تیار کراتے ہیں۔ اس کے لیے انھیں بین الاقوامی سازشیں کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور وہ دنیا کے بہترین دماغوں کا اغوا کر کے اپنے نئے ملک کی تعمیر میں ان کے علم سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اِس مقصد کے حصول میں قتل وخون اور غارت گری کی انھیں کوئی پرواہ نہیں۔

تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا جو اپنے نام کے مخفف ٹی تھری بی کے نام سے معروف ہے، اس پورے نظامِ جرائم کی سربراہ اور انتہائی زیرک عورت ہے۔ تھریسیا ایک عالمی مجرم سہی، لیکن اس کی انتظامی صلاحیت، اس کی حاضر دماغی، اُس کے ذہن کی تیزی، بیک وقت کئی چیزوں پر عقابی نظر رکھنے کی صلاحیت، فوراً فیصلہ کرنے اور اُس پر عمل آوری کی غیر معمولی قابلیت یہ تاثر دیتی ہے کہ اگر عورت چاہے تو کیا نہیں کرسکتی۔ وہ کئی مرتبہ عمران جیسے سیکریٹ سروس کے چیف اور فریدی جیسے گرگِ باراں دیدہ کو جُل دے چکی ہے اور وہ اپنی ناکامی کے زخم چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ چشم زدن میں وہ ایسے اقدامات کر بیٹھتی ہے کہ مرد مبہوت رہ جاتے ہیں۔ عمران کئی بار اُس پر قابو حاصل کر لیتا

ہے لیکن تھریسیا اُس کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے۔اپنی تمام تر ذہنی برتری کے باوجود تھریسیا ایک جذباتی عورت ہے اور عمران کے سامنے اپنے جذبات پر قابو رکھ ہی نہیں سکتی۔عمران کی طرف سے دل شکنی کا رویّہ دیکھ کر اُسے اپنی خودنگری کرنا بھی آتا ہے۔مجموعی حیثیت سے تھریسیا، مرداساس دنیا میں نہ صرف مرد کی برابری کے رتبے پر فائز ہے بلکہ مرد سے بھی برتر نظر آتی ہے۔ابنِ صفی نے تھریسیا اور نانوتہ کے کرداروں کے ذریعے اِس عام تصور کو باطل کر دیا کہ عورت ناتواں، کم عقل اور مرد کی محتاج ہوتی ہے۔تھریسیا ذہنی برتری کی روشن علامت ہے اور عورتوں کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ صنفی مسابقت میں وہ اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لا کر قوی مردوں سے برابر کی ٹکّر لے سکتی ہے۔ عمران سنگ ہی جیسے بین الاقوامی مجرم کو جھانسہ دے کر پستول کی گولیوں سے بچنے کا سنگ آرٹ سیکھ جاتا ہے لیکن کراغال کی مہم میں تھریسیا کے اس ہنر کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے جب وہ چلتے ہوئے قافلے کے پیروں تلے پلّوں کے روندے جانے کی آوازیں نکال کر پورے قافلے میں بھگدڑ مچادیتی ہے اور موقع کا فائدہ اٹھا کر فرار ہو جاتی ہے۔

تھریسیا کے مقابلے میں جولیا ناوطن کو مجرموں، وطن فروشوں اور بین الاقوامی سازشوں کا سدِّ باب کرنے والی ایکس ٹو کی ٹیم کی سربراہ ہے۔وہ اپنے چیف ایکس ٹو کے احکامات دوسرے ممبروں تک پہنچانے اور اُن پر عمل آوری کی نگہداشت کرنے کی ذمّے دار ہے۔ایکس ٹو کو اپنی ٹیم کے دوسرے مرد اراکین سے کہیں زیادہ جولیا کی صلاحیتوں پر بھروسا ہے۔وہ دوسروں تک احکامات ہی نہیں پہنچاتی بلکہ شخصی طور پر انتہائی خطرناک صورتِ حال کا مقابلہ بھی کرتی ہے۔وہ ذہنی طور پر اس قدر قوی ہے کہ چاروں طرف سے مجرموں میں گھر جانے کے باوجود اپنے اوسان بجا رکھتی ہے اور دباؤ کی کامیاب مزاحمت کر سکتی ہے۔عمران کے تئیں اس کا بھی وہی رویّہ ہے جو تھریسیا کا ہے۔وہ بھی عمران پر فدا ہے لیکن اس کی طرف سے سرد مہری کا رویّہ دیکھ کر فرسٹریشن کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ابن صفی نے قوی عورتوں کے کردار میں بالعموم جذباتی کمزوری کو نمایاں کیا ہے۔وہ غالباً یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ عورت، مرد کے مقابلے میں معراج پر پہنچ کر بھی اپنی اصل فطرت پر باقی رہے، تبھی وہ کامل عورت رہے گی۔پورا مرد بن کر وہ لازماً نا آسودہ رہے گی۔وہ مساوات جو عورت کے فطری جوہر اور اس کے انفراد کو فنا کر دے، مساوات نہیں کج روی ہو جائے

گی اور بحیثیت ایک انسان اس کے وجود کی المنا کی کا پیش خیمہ بن جائے گی۔ گویا ابن صفی کے ہاں صنفی مساوات کا تصور بے مہار مساوات نہیں بلکہ ایسی مشروط مساوات ہے جس میں صنفِ نازک پانے کی قیمت کھونے سے ادا نہ کرے۔ ابنِ صفی کے نسوانی کرداروں میں ایک کردار روشی کا ہے جو ایک جرائم پیشہ گروہ کی کارپرداز تھی لیکن عمران کے زیرِ اثر باعزّت زندگی کو ترجیح دیتی ہے اور وقتاً فوقتاً جرائم کے استیصال میں عمران کی مدد کرتی رہتی ہے۔ یہ دونوں ہی عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتی ہیں۔ کسی کی یہ مجال نہیں کہ اُن کے ساتھ صنفی تفریق کا رویّہ اپنائے اور نہ وہ خود بھی اپنے رویّے سے کسی صنفی تفریق کا اظہار کرتی ہیں۔

ابنِ صفی کا ایک اور کردار رشیدہ کا ہے جو کرائم رپورٹر انور کی ہم پیشہ ہے۔ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہیں اور ایک ہی ساتھ رہتے ہیں۔ کئی بار دونوں میں سخت اختلاف اور جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے لیکن نہ انور رشیدہ کی خودمختار حیثیت کو نشانہ بناتا ہے اور نہ خود رشیدہ کبھی انور سے دبتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ انور اور رشیدہ آج کل کے live in couples کی مثال ہیں لیکن وہ کسی حالت میں اپنی اخلاقی حدوں کو پار نہیں کرتے۔ نہ انور رشیدہ کو راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نہ رشیدہ ہی انور کو مائل کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھاتی ہے۔ یہ دونوں ذہنی بلوغت کی ایک ایسی منزل میں ہیں جہاں وہ جنسی تقاضوں سے بلند ہو گئے ہیں اور صنفی پختگی کی اس رفعت پر پہنچ گئے ہیں جہاں ایک دوسرے کا احترام مساوات کی سطح پر محض بحیثیت انسان کیا جاتا ہے۔ ابن صفی جس وقت ناول لکھ رہے تھے، اس وقت برّصغیر کے معاشرے میں ایسے جوڑوں کا تصور محض تخیل کی اڑان ہی کہا جا سکتا تھا بلکہ روایت پرستوں کی طرف سے یہ آواز اٹھائی جا سکتی تھی کہ ابن صفی بد اخلاقی کی ترغیب دے رہے ہیں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ منٹو اور عصمت کے مقابلے میں ابن صفی پر اس معاملے میں گرفت شاید اس لیے بھی نہیں کی گئی کہ جاسوسی ادب کو ادب کے زمرے سے ہی خارج سمجھا گیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ جاسوسی ادب دوسرے درجے کا ادب تھا جسے حقیقی زندگی کا ترجمان کبھی نہیں سمجھا گیا۔ فرضی دنیا کی فرضی باتیں تھیں جنہیں درخورِ اعتنا سمجھنا ضروری نہ تھا۔ لیکن ابن صفی کے لاکھوں قارئین میں سے صنف نازک کی کتنی قارئین کو رشیدہ کے کردار نے خود اعتمادی، آبرومندی کے ساتھ خودنگری، مردوں کے پیشے صحافت میں ایک عورت کو کام کرنے کے مواقع اور

بدلتی ہوئی دنیا میں عورت کے رویّو ں کے بارے میں مہمیز کیا ہوگا۔ادب بہرحال ادب ہوتا ہے،وہ درجۂ اول کا ہو یا درجۂ دوم کا۔پڑھنے والا مطالعے سے اس کا اثر ضرور قبول کرتا ہے۔اور ابن صفی کی تحریروں میں وہ بے نظیر ادبی خوبیاں تھیں جو محض پراسرار ناول لکھنے والوں کے ہاں ناپید تھیں۔ ان کے حالات سے کئی نسلیں متاثر رہیں۔اچھا ہوا کہ اردو کے نام نہاد اخلاقی ٹھیکے داروں کا شعور اس زمانے میں آرام کررہا تھا ورنہ ابن صفی بھی اس کی زد میں آجاتے۔

رشیدہ اُن عورتوں کی مثال ہے جو کسی مرد کی محتاجی کے بغیر اپنے بل بوتے پر بسر کرنے میں یقین رکھتی ہیں۔وہ روزگار میں کامیاب ہیں اور سماج میں عدم تحفظ کے فکر سے آزاد ہیں۔ اخلاق کی تمام حدوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی شرطوں پر جینے کا نہ صرف حق مانگتی ہیں بلکہ اُس حق کا پورا پورا استعمال بھی کررہی ہیں۔

ابنِ صفی کے ناولوں میں اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی متعدد عورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔اُن کے پاس دولت کی فراوانی ہے۔ بڑے بڑوں سے علیک سلیک ہے۔قانون کا انہیں کوئی ڈرنہیں اور اپنی آزادی پر کسی قسم کی پابندی انہیں گوارا نہیں۔ناول سائے کی لاش کی لیڈی تنویر، ناول ڈاکٹر ڈرید کی بیگم ارشاد ایسی ہی عورتوں میں سے ہیں۔سماج میں اُن کی بہت اونچی پوزیشن ہے اور وہ اُس پوزیشن کے پردے میں یا تو جرائم پیشہ لوگوں کا شکار بن جاتی ہیں یا اُن کی آلۂ کار۔یہ بھی وہ عورتیں ہیں جن پر صنفی تفریق کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔لیکن اپنے جھوٹے بھرم میں قانون سے کھلواڑ کرنے کے نتیجے میں اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔ان کے طرز حیات کی وجہ سے ان کی ذاتی زندگی باطنی اضطراب سے دوچار رہتی ہے۔وہ نمائشی زندگی بسر کرتی ہیں اور اندرونی ناآسودگی کی وجہ سے اپنی شخصیت کی بھرپور نشو نما کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ابن صفی نے ایسی عورتوں کے کردار سے یہی واضح کیا ہے کہ صنفی مساوات اگر فطرت سے ہم آہنگ نہ ہو تو بڑی قیمت بھی وصول کرتی ہے اور ذاتی متاع کو چھین بھی لیتی ہے۔

ناول ریت کا دیوتا میں ایک محبِّ وطن شخص وطن فروشوں کے ایک گروہ کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے۔لیکن مصلحتاً کھلے عام کوئی اِقدام کرنہیں سکتا۔اُس کے زیرِ کفالت ایک نوجوان لڑکی کبھی شاہد فاروقی اور کبھی شاہدہ فاروقی کے روپ میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیتی ہے اور قانون کی مدد

کر کے مجرموں کو اُن کے انجام کو پہنچاتی ہے۔ اُسے بھی خطرات میں گھر جانے کے باوجود یہ کبھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے دشمن اُسے کبھی بھی فنا کر سکتے ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں میں خودنگر نسوانی کرداروں کا ایک پورا کاررواں نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسی روایات نہیں ہیں، لیکن اگر کبھی ابن صفی کے قارئین کا کوئی سائنٹفک سروے کیا گیا تو صحیح اندازہ ہوگا کہ ان کے ناولوں کے خودنگر خواتین کرداروں نے صنف نازک کے فکر و عمل پر کیسے نفسیاتی اثرات مرتب کیے ہوں گے۔

ناول قاتل کا ہاتھ میں ایک لیڈی انسپکٹر زیبا اپنی بے باکی اور جرأت کے ذریعے حمید جیسے آفیسر کا ناطقہ بند کر دیتی ہے۔ فریدی کی ایک معاون انسپکٹر ریکھا بھی ہے جو ہر قسم کے خطرات میں اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر قانون کی بالادستی کو قائم رکھتی ہے۔ کیپٹن حمید کے ساتھ اسے اس مہم میں شرکت کا موقع ملتا ہے۔ ایک نادار طبقے کی عورت کی حیثیت میں ریکھا کو ہوس ناک مردوں کے برے ارادوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے لیکن وہ خوف زدہ ہوکر اپنی سرکاری ذمے داری سے دست بردار نہیں ہوجاتی اور آخر میں سرخ رو نکلتی ہے۔ ابن صفی کے نسوانی کردار بالعموم حوصلہ مند رہتے ہیں۔ آزمائش کی گھڑی میں اپنے اوسان بجا رکھتے ہیں۔ ان کا ذہن جاگتا رہتا ہے۔ کڑی سے کڑی صورت حال میں لاچاری کا احساس یا خوف ان کے پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ ہمارے روایتی فکشن میں عورتوں کو جیسا مجبور، لاچار، مظلوم دکھایا گیا ہے، اس کے موازنے میں ابن صفی کے نسوانی کردار واقعی کسی حد تک ماورائی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت تا تخیل کی بحث سے قطع نظر پڑھنے والے کے شعور میں جو داخلی تبدیلی رونما ہوتی ہے، اس کے سامنے تمام اکاڈمک ڈسکورس فضول معلوم ہوتے ہیں۔

ناول بیباکوں کی تلاش میں متوسط طبقے کی ایک لڑکی ساجدہ ایک ایسے ادارے میں سرگرم کردار ادا کرتی ہے جس کے بارے میں اسے بتایا گیا ہے کہ وہ فلاح و بہبود کا نقیب ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب حقیقت اُس پر ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ادارہ فلاح کے پردے میں جرائم میں مشغول ہے تو وہ وطن کی سیکریٹ سروس کی مدد سے اُن کے خاتمے کی وجہ بن جاتی ہے۔

جرائم کی دنیا سے الگ ابن صفی کے ناولوں میں جگہ جگہ گھریلو زندگی کے مرقعے بھی ملتے

ہیں۔ان میں بھی نسوانی کرداروں کی ایک خاص آن بان نظر آتی ہے۔سیکریٹ سروس کے چیف علی عمران کی بہن ثریا،عمران کا ناطقہ بند کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔عمران سے چھوٹی ہے لیکن گھر میں عمران کی ایک نہیں چلنے دیتی۔عمران کے باورچی سلیمان کی بیوی نہ صرف سلیمان پر حکم چلاتی رہتی ہے بلکہ اپنے آقا عمران سے بھی برابری کی سطح پر بات کرتی ہے۔اس رشتے میں بے ادبی یا بدتمیزی کا کوئی دخل نہیں۔صرف یہ کہ نوکر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ایک جھوٹا فدویانہ یا غلامانہ رویہ اختیار کیا جائے۔آقا اور نوکر کا اپنا اپنا مقام ہے اور دونوں ایک دوسرے کی آزادی کے حق اور عزت نفس کا احترام رواں رکھتے ہیں۔کیپٹن حمید کے دوست قاسم کی بیوی بھی نہ صرف قاسم کے ساتھ بلکہ کیپٹن حمید اور دوسروں کے ساتھ مساوات کی سطح پر راہ ورسم رکھتی ہے۔ابن صفی کے ناولوں میں پیشے،منصب،ذات پات یا کسی اور زاویے سے بھی تفریق آدم کا سراغ نہیں ملتا۔ہر کردار اپنی عزت نفس کا پاس دار نظر آتا ہے۔

ابنِ صفی نے کوئی دوسو سے زیادہ ناول لکھے۔موضوع کی مناسبت سے اُن کے ناولوں میں عورت اس قدر الگ الگ روپ میں ظاہر ہوئی ہے کہ اِس مختصر مقالے میں اُن سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔لیکن اُن تمام عورتوں کے ساتھ جن میں جرائم پیشہ بھی ہیں، قانون کا احترام کرنے والی بھی، صنفی برابری کی ایک زیریں لہر شروع سے آخر تک موجود ہے۔ابنِ صفی نے اپنے نسوانی کرداروں میں ذہانت، خوداعتمادی، خودنگری اور عزم وحوصلے کی وہ صفات دریافت کی ہیں جو انہیں مرداساس معاشرے میں بھی اپنی انفرادیت اور اپنا تشخص برقرار رکھنے کے قابل بناتی ہیں۔اُن کے ناولوں میں کم زور، قابلِ رحم اور محتاج عورت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔اُن کے نسوانی کرداروں کو عمل کرتے ہوے دیکھ کر ایک معمولی ذہانت کی عورت بھی یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ کسی سے کمتر نہیں اور معاشرے کی ہر دھونس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہے۔غیر شعوری طور پر ابنِ صفی نے اپنے نسوانی کرداروں کے ذریعے عورتوں میں یہ احساس جگایا ہے کہ معاشرے میں وہ مساوی حقوق کی مالک ہیں اور اُن کے اُن حقوق کو جو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوے ہیں، کوئی سلب نہیں کرسکتا۔

ڈاکٹر اقبال النساء صدر شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی ہیں۔

شاہ رشاد عثمانی

مولانا گیلانی اور سیرت رسولؐ

سیرتِ رسول کا موضوع اپنے اندر بڑی دلکشی و دلبری رکھتا ہے۔اس حدیث دلبری میں عشق و محبت کی ایسی وارفتگی اور والہانہ پن کا اظہار ملتا ہے، جس کی نظیر علم وفن کے کسی شعبے اور نثر و نظم کی کسی دوسری صنف میں نہیں پائی جاتی ۔ دراصل حدیث دلبر ہر حال میں خوشتر و پر سحر ہوتی ہے۔ اس سے لذت ،مسرت اور بصیرت سبھی کچھ حاصل ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی دوسرے علمی وادبی اور تاریخی موضوع پر اتنی کتابیں تصنیف نہیں کی گئیں جتنی کہ سیرت رسول اور حیات طیبہ کے عنوان پر تخلیقات نثر ونظم ہر دور اور ہر زبان میں سامنے آئی ہیں۔اور میرے خیال میں ایسا تو ہونا ہی چاہئے تھا، کیوں کہ جس ذات گرامی کی تعریف خود اللہ تعالی فرمائے اس کی مدح وتوصیف میں اگر انسان منہ کھولے تو حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہیں ہوسکتا۔سورہ الم نشرح کی آیت ''**ورفعنا لک ذکرک**''(اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کے ذکر کا آوازہ بلند کیا)اس موضوع کی عظمت و وسعت اور حیثیت و اہمیت کے سلسلہ میں ایک کھلی اور واضح دلیل ہے اور جو قرآن مجید کے اعجاز لفظی و معنوی کا اعلی نمونہ ہے اور ایسی پیشین گوئی بھی جو آج چودہ سو برسوں سے حرف بہ حرف صادق آرہی ہے۔اس آیت کی تشریح میں مولانا سید ابولاعلی مودودیؒ فرماتے ہیں''یہ بات اس زمانہ میں فرمائی گئی جب کوئی شخص یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جس فرد فرید کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہیں اور وہ بھی صرف شہر مکہ تک محدود ہیں، اس کا آوازہ دنیا بھر میں کیسے بلند ہوگا اور کیسی ناموری اس کو حاصل ہوگی؟ لیکن اللہ تعالی نے ان حالات میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوش خبری سنائی اور پھر عجیب طریقہ سے اس کو پورا کیا،سب سے پہلے آپ کے رفع ذکر کا کام اس نے خود آپ کے

دشمنوں سے لیا............ دس سال کے اندر اندر حضور اکرمؐ کا رفع ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپ کو بدنام کرنے کے لئے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا اس کا گوشہ گوشہ **اشھد انّ محمد الرسول الله** کی صدا سے گونج اٹھا، پھر آپ کا نام مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا، یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے اور انشا اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔‘‘ (1)(تفہیم القرآن جلد ششم، 381، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی)

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ بیسویں صدی کے آغاز کی عظیم شخصیت تھے جو ایک جیّد عالم، مفکر، مفسّر، محدّث، محقق، مؤرخ، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے معروف و ممتاز رہے ہیں۔ مولانا گیلانی کی ذات والا صفات علمی تبحر کے ساتھ جذب و سوز کا بھی مظہر تھی، وہ ایک ایسے مرد قلندر تھے جن کے دل کے سوز و گداز اور جذبہ دروں نے ان کی تحریروں کو بہت زیادہ اثر انگیز بنا دیا ہے۔ اور ان کا یہ خون جگر سطر سطر میں ’’ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو‘‘ بن کر چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

مولانا گیلانی کی تصنیفات و تالیفات کی ایک لمبی فہرست ہے، جو اسلامی علوم، قرآن، حدیث، سیرت، فقہ، الٰہیات، فلسفہ و حکمت، منطق، کلام، تصوف، معاشیات، تاریخ، تعلیم وغیرہ وغیرہ جیسے کئی موضوعات سے تعلق رکھتی ہے۔ مولانا کی یہ تمام تصنیفات اردو زبان و ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ان میں سیرت ’’النبی الخاتم‘ صلی اللہ علیہ وسلم وہ ظہور نور کا میلاد نامہ ہے جو نہایت اچھوتے اور نرالے پیرائیہ بیان میں اور بقول مولانا علی میاں ندویؒ عجیب البیلے انداز میں تحریر کیا گیا ہے‘‘، جس کے متعلق مولانا ماہر القادری لکھتے ہیں کہ ’’مولانا گیلانی کی تحریروں میں خاص طور سے النبی الخاتم میں انجیل کا انداز جھلکتا ہے۔ اس طرز نگارش سے اردو دنیا زیادہ مانوس نہیں ہے، مگر اس میں ندرت اور دلکشی ضرور پائی جاتی ہے‘‘(2)

سیرتِ نبوی کے موضوع پر یہ تصنیف ’’النبی الخاتم‘‘ مولانا گیلانی نے 1936 میں تصنیف کی تھی اس زمانہ میں وہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر و صدر شعبہ دینیات تھے۔ یہ بات ڈاکٹر سید قدیر ناظم نے اپنے تحقیقی مقالہ بہ عنوان ’’بیسویں صدی میں ہندوستان کے اردو سیرت نگاران رسول‘‘ میں تحریر کی ہے (3) ان کے سامنے 192 صفحات پر مشتمل مکتبہ فیض دیوبند سے 1996 میں اشاعت پذیر نسخہ رہا ہے، جب کہ اس وقت مکتبہ اخوت اردو بازار لاہور سے مطبوعہ اس

کا چوتھا ایڈیشن جس پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے اور جو 108 صفحات پر محیط ہے ہمارے پیش نظر ہے۔

یہ کتاب مصنف کے دیباچہ کے علاوہ مکی زندگی کے پہلے باب کے تحت 30 اور دوسرے باب مدنی زندگی کے تحت 15 ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کی ایک خاص بات اس کا اختصار ہے، دریا بکوزہ کی مثال مشہور ہے جو اس تصنیف پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ دراصل مصنف کا مقصد تصنیف صرف ''سوانح نبویہ' کی تدوین نہیں ہے اور اس لئے واقعات میں تاریخی ترتیب کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کا مطمع نظر اسوۂ حسنہ کی تبلیغ اور دعوت الی الحق ہے' جیسا کہ خود مصنف کتاب نے اپنے ایک صفحہ کے دیباچہ میں لکھا ہے:

''ارادتاً اس میں سیرت کے واقعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے' بلکہ بجائے واقعات کے صرف نتائج سے بحث ایک خاص نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے.....اس سلسلہ میں صاحب ایمان قرشی صاحب کی کوششوں کو بھی ایک امتیاز حاصل ہے اور یہ مقالہ بھی ان ہی کی فرمائش سے لکھا گیا۔ان ہی بزرگوں کی محنتوں کا نتیجہ ہے کہ آج اردو زبان میں سب سے زیادہ سیرۃ نبویہ' کی تدوین ہورہی ہے۔''(4)

آغاز میں مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ کی ایک قیمتی تحریر ''تعارف'' کے عنوان سے شامل کتاب ہے' جس میں وہ مقصد تصنیف کی مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''وہ اختصار کے باوجود سیرت نبویہ کے تمام قابل غور پہلوؤں پر حاوی ہے بلکہ جن پہلوؤں کو سطح بیں دنیا نے قابل غور نہیں سمجھا اور اس لئے ہمیشہ ان پر سرسری طور سے گزرا گیا ان کو بھی اس کتاب میں قابل غور بنا کر پیش کیا گیا ہے ....جدید تحقیق سیرت کے بانی جناب عبدالمجید قریشی اڈیٹر اخبار ''ایمان'' (جنہوں نے مصروشام و ہند کے مشاہیر سے درجنوں مقالے اور مضامین اس موضوع پر لکھوائے ہیں اور خود یہ کتاب النبی الخاتم بھی ابتداً انہی کی تحریک پر ایک مقالہ کی صورت میں لکھی گئی تھی') انہوں نے اس کے متعلق یہ بالکل صحیح لکھا تھا کہ سیرت کی لائبریری میں اس قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔''.............انھوں نے حیات نبوی کے ہر حادثہ اور سانحہ کو صاحب سوانح صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا برہان اور آپ کے پیغام کا مصداق

بنا کر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔‘‘(5)

واقعہ یہ ہے کہ ہر دور کی طرح آج بھی انسان کو نعمت اسلام ملنے کے صرف دو ذرائع ہیں‘ ایک خدا کا کلام جو صرف قرآن مجید کی صورت میں ہی مل سکتا ہے‘ دوسرے اسوۂ رسول جواب صرف سیرت محمد عربی ﷺ کی صورت میں۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا اس نے حقیقتاً اسلام کو سمجھا۔ اسی لئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی تحریروں کے ذریعہ نئی نسلوں کو بعثت رسول کے مقصد و مدعا اور پیغام کو پہنچانے کی سعیٔ احسن کی ہے اور جو یقیناً سعی مشکور ہے۔ مولانا نے بارگاہ رسالت میں اپنی بساط کے مطابق نذر عقیدت پیش کر کے دین و دنیا کی وہ سعادت حاصل کی ہے جو مطلوب و مقصود مومن ہے۔ اس کتاب میں مولانا گیلانی کے قلم کی مہارت‘ فکر کی پاکیزگی‘ دل کا سوز اور دینی شغف پوری طاقت سے ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سطر سطر میں محبت رسول کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور ورق ورق پر عقیدت کے لعل و گہر جگمگا رہے ہیں۔

مولانا مناظر گیلانی نے کتاب کی ابتدا ایمانی اور ادبی پیرائے میں کی ہے۔ پہلا پیراگراف ملاحظہ فرمائیں:

’’یوں آنے کو تو سب ہی آئے، سب میں آئے، سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) کہ بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے، لیکن کیا کیجیے ان میں جو بھی آیا جانے کے لئے آیا۔

پر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے ہی کے لئے آیا، وہی جو آنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جا رہا ہے۔ بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ سب جانتے ہیں اور سبھوں کو جاننا چاہئے کہ جنہیں کتاب دی گئی اور جو نبوت کے ساتھ کھڑے کئے گئے، برگزیدوں کے اس پاک گروہ میں اس کا استحقاق صرف اسی کو ہے اور اس کے سوا کسی کو نہیں مل سکتا ہے جو پچھلوں میں بھی اس طرح ہے جس طرح پہلوں میں تھا۔ دور والے بھی اس کو ٹھیک اسی طرح پا رہے ہیں اور ہمیشہ پاتے رہیں گے، جس طرح نزدیک والوں نے پایا تھا، جو آج بھی اسی طرح پہچانا جائے گا، جس طرح کل پہچانا گیا تھا کہ اسی کے اور صرف اسی کے دن کے لئے رات نہیں، ایک اسی کا چراغ ہے جس کی روشنی بے داغ ہے۔‘‘(6)

یہ اقتباس مصنف کے انداز تحریر کا وہ بے مثال نمونہ ہے جس میں شروع سے آخر تک یہ

پوری کتاب لکھی گئی ہے۔آغاز کتاب کے ابتدائی دو جملے اس بات کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ مصنف اگلے انبیاء کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان ادیان کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو انبیاء اپنے ساتھ لائے تھے، پھر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان انبیاء کی نبوت ایک قوم اور ایک خطے اور ایک وقت کے لئے تھی اور یہ سلسلہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک چلتا رہا اور جب یہ پیغمبر دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے ماننے والوں نے ان کی تعلیمات کو فراموش کر دیا، اپنی مقدس کتابوں میں ترمیم کی۔اسی لیئے مولانا مرحوم کہتے ہیں کہ جس طرح سب جانے کے لئے آئے اسی طرح ان کی کتابیں اور صحیفے بھی دنیا سے اٹھا لئے گئے، اس لئے کہ وہ نبی برحق اب دنیا میں مبعوث ہونے والا ہے، جس کے آنے کی گواہی یہ جانے والے دے گئے ہیں۔مصنف نے رسول اکرم کی آمد سے متعلق اگلی کتابوں اور اگلے بانیانِ مذاہب نے جو پیشین گوئیاں کی تھیں، ان کو پیش کر کے ہی کہا ہے کہ یہ جانے والے جانتے تھے کہ کوئی ایسا آئے گا جس کا دین جس کی حکومت کبھی نہ ختم ہوگی۔اس سلسلے میں مولانا موصوف نے مہاتما بدھ، حضرت داؤدؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے آپ ﷺ کی آمد سے متعلق جو کلمات ادا کئے تھے ان کو بھی نقل کیا ہے۔تقریباً پندرہ صفحات کے اس طویل بحث کے بعد بعثت رسول کا ذکر کرتے ہوئے مصنف کتاب لکھتے ہیں۔

''بلا شبہ آدم کی ساری اولاد کے درمیان شاید یہی ایک نسل تھی، جس نے اپنے ہاتھ کو سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ کو اپنے خلاف رکھ کر ہمیشہ ایسی زندگی بسر کی جو دنیا کے کسی خطہ کے باشندوں کو میسر نہ ہوئی، وہ انہی آزادوں میں اٹھا اور محسوس قوتوں میں، جن چیزوں کا نام قوت رکھا گیا ہے۔ایک ایک کے پنجے سے انسانیت کو آزادی دلانے کے دعوے کے ساتھ اٹھا۔''(7)

اس کے بعد مصنف نے رسول کریم کے والدین کی وفات کا ذکر کیا ہے، پھر عبدالمطلب کی کفالت اور ان کی وفات کا تذکرہ کر کے حضرت ابو طالب کی کفالت کا ذکر ہے۔اسکے بعد دائی حلیمہ سے دودھ ملا۔یا حلیمہ، حلیمہ کی اونٹنی، حلیمہ کی بکریوں، حلیمہ کے شوہر، حلیمہ کے بچوں بلکہ آخر میں قبیلہ والوں تک سب کو دودھ آپ کے ذریعہ ہی ملا تھا۔بعد ازاں ملک عرب کی خصوصیات، قریش اور قریش کی حالت، آپ کی طفولیت و شغل گلہ بانی، حجر اسود کا جھگڑا، حضرت خدیجہ سے نکاح اور غار حرا اور کی خلوت نشینی وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے، نیز ابتدائے وحی اور منصب

نبوت کے فرائض، قریش کی دھمکیاں سازشیں اور آپ کو لالچ دیکر ان کے مشن سے باز رکھنے کی کوشش وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے۔

بعد ازاں ہجرت حبشہ، نجاشی کے دربار میں جعفر طیار کی تقریر، آپ کے ساتھ ایذا رسانیوں کا آغاز، شعب ابی طالب کا محاصرہ اور اس کے ختم ہونے کا جائزہ لیتے ہوئے واقعہ معراج کا تذکرہ، پھر حضرت ابو طالب اور حضرے خدیجہؓ کی وفات، طائف کی زندگی، پھر طائف سے واپسی، جبرئیل امین کا ظہور طائف کی راہ میں، جنوں سے ملاقات اور بیعت، مدینہ والوں سے پہلی ملاقات، دارالندوہ کا آخری فیصلہ اور ہجرت، اس طرح سفر ہجرت کے واقعات پر اس باب کا اختتام ہوتا ہے۔

اب دوسرے باب کا آغاز اس مدنی زندگی سے ہوتا ہے، جسے مصنف کتاب نے دماغ کی زندگی سے تعبیر کیا ہے، وہ مکی دور کی زندگی کو دل کی زندگی قرار دیتے ہیں، یہ ایک بالکل نئی مگر نہایت صحیح تقسیم ہے، کیوں کہ نبوت کے بعد مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں جن کمالات کا ظہور ہوا ان کا زیادہ تر تعلق مکافات قلبیہ سے ہی تھا اور مدنی زندگی میں جو امور مہمات انجام پائے ان کے لئے دماغی صلاحیت وقابلیت اور فکر وتدبر ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

مدنی زندگی کے تحت سب سے پہلے مسجد نبوی کی بنیاد اور صفہ کا بیان آیا ہے، پھر تحویل قبلہ کا راز، اذان کی ابتدا، تبلیغ عام کا آغاز، مشکلات راہ، غزوۂ بدر، عہد نبوت کے جہاد میں شہداء اور مقتولوں کی اٹھارہ سو تعداد، بیرونِ عرب میں تبلیغ کا کام، اسلامی جہاد کی ترتیب جیسے ذیلی عنوانات قائم کر کے دس سالہ واقعات کی پوری تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس کے بعد ازواج مطہرات اور مدینہ کے دیگر مذاہب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ازواج مطہرات کے ضمن میں مصنف نے جو محنت اٹھائی ہے وہ بہت اہم ہے، اس میں مولانا موصوف نے ان شکوک وشبہات کا مسکت جواب دیا ہے جو دشمنانِ اسلام خصوصاً مستشرقین مسلسل لگاتے رہے ہیں، ساتھ ہی حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ کی اخلاقی' دینی و علمی صلاحیتوں کا مفصل ذکر کیا گیا ہے، خاص طور سے حضرت عائشہ کی منفرد حیثیت اور ان کی علمی و دینی صلاحیتوں کو بیان کیا گیا ہے، جو ان میں رسول اکرم کی رفاقت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔

سیرت نبوی پر اس منفرد و ممتاز تصنیف کا اختتام ختم نبوت کے عنوان پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کیا گیا ہے، اللہ کا دین جو حضرت آدم سے شروع ہوا تھا رسول اکرم ﷺ پر مکمل ہو گیا،

اب اس زمین پر آسمانی پیغام لے کر کوئی نبی نہیں آئے گا، اب قیامت تک رسول اکرمؐ کی نبوت و رسالت ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ایک اقتباس دیکھئے:

''جس طرح وہ بھیجا گیا، جن صفات وکمالات کے ساتھ بھیجا گیا، اسی شان اسی آن کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب اور دمکتے ہوئے سورج کے مانند ہم میں وہ اسی طرح موجود ہے، ہر جگہ موجود ہے، ہر خطہ میں موجود ہے، اس کا وجود مغرب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح وہ مشرق میں آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے وہ سب کے لیے برابر ہے، سب کے لئے یکساں ہے، وہ فضاء میں بھری ہوئی ہوا ہے، جس میں سب سانس لیتے ہیں۔''(8)

ختم نبوت کے اس اعلان واقرار کے بعد مصنف نے اپنے دعائیہ اشعار پر اس طرح ذکر سیرت رسول کا اختتام کیا ہے

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے
وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتما م ابھی باقی ہے

مختصر یہ کہ مولانا گیلانی نے مختصر صفحات میں سیرت رسول کی حیات مبارکہ کے مختلف گوشوں کو پیش کر کے اس سے اہم نتائج اخذ کئے ہیں۔اب آخر میں اس کتاب پر چند علماء کی آرا پیش خدمت ہیں:-

''النبی الخاتم'' ایک گلدستۂ عقیدت ہے جسے مولانا مناظر احسن کے عقیدت مند قلم نے سجایا ہے، اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرت پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز اور ترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج اخذ کئے گئے ہیں، اس حیثیت سے یہ اپنے طرز میں منفرد ہے کہ تاریخی واقعات کو وارفتگی بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا ہے کہ نامور مورخین اور ارباب وجد و حال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا سکتے ہیں۔ زبان صاف وسادہ لیکن صنائع لفظی سے مالا مال ہے'' (مولانا سید سلیمان ندوی)(9)

''مولانا کی تصنیفات میں سے غالبًا سب سے پہلے النبی الخاتم پڑھی ۔کتاب عجیب

البیلے انداز میں لکھی گئی ہے۔صحف سماوی کا انداز بیان، خطیبوں کا جوش و برجستگی، عشاق کی مستی و وارفتگی، عقل و جذب کی لطیف آمیزش حسب معمول، معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عظیم نتیجے نکالے جاتے ہیں..........میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں رحمتہ للعالمین اور النبی الخاتم سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی، یقیناً یہ کتاب مواد کے ساتھ علم انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ہندو پاک کے متعدد مدارس کے نصاب میں شامل ہے"

(مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی) (10)

"یہ کتاب سیرتِ نبوی پر نہایت اچھوتی اور نرالی کتاب ہے، جہاں یہ سیرت نبوی کے واقعات اور اس سے حاصل ہونے والے عبرتوں اور موعظتوں کا ذکر کرتی ہے، وہیں اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب نبوت محمدی کے بتدریج ارتقاء اور إن مع العسر یسرا کی مصداق ہے کہ مصائب و متاعب کی بھٹیوں میں جل کر انسان صاف وشفاف ہو جاتا ہے، زبان اور الفاظ کی بندش اور پیرایہ بیان اس قدر گہرا و گیرا اور اردو زبان کی لذت و چاشنی کو لئے ہوئے قاری کتاب کو پڑھتا جائے اور سر دھنتا جائے۔" (مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی) (11)

دنیائے علم ادب کے بہت سے محققین ونثر نگار ایسے ہیں جو اچھے شاعر بھی ہیں لیکن ان کی شاعرانہ حیثیت انکی نثری علمی و تحقیقی کتابوں کے انبار میں دب کر ماند پڑ گئی جیسے شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی اور بھی بہت ساری شخصیات ہیں ایسے ہی افراد میں مولانا مناظر احسن گیلانی کا نام بھی آتا ہے ۔ابھی آپ کی سیرت پاک پر ایک کتاب کا تفصیلی تذکرہ ہوا ہے، یہ کتاب اپنے دلچسپ اسلوب و انداز اور پر کیف زبان و بیان کے باعث نثری نعت کے زمرے میں بھی رکھی جاسکتی ہے۔لہٰذا اس مضمون کے موضوع کی مناسبت سے یہاں مولانا مناظر احسن کی نعتیہ شاعری کا ذکر یقیناً برمحل اور مناسب ہوگا۔ان کی شاعری کا ایک مختصر مجموعہ "مناظر احسن" کے عنوان سے ابھی حال میں شائع ہوا ہے، جس کے مرتب و ناشر فاروق اعظم عاجز قاسمی ہیں۔جس کے مقدمہ میں پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے ایک بہت عمدہ بات لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں۔"انسان ہمیشہ عقل کل اور علم مجسم نہیں ہوتا ہے۔ اسکے پہلو میں دل بھی ہوتا ہے اور یہ دل محبتوں کا گنجینہ اور لطیف جذبات کا خزینہ ہوتا ہے اور کبھی یہ محبت ہزار ضبط اور بندش کے باوجود چھلک جاتی ہے اور آنسوؤں کے سیل تمکنت اور صبر کو بہا لے

جاتی ہے اور جذبہ کا ارتعاش عروض وقافیہ کے قالب میں ڈھل جاتا ہے"۔(12)

جیسا کہ میں نے عرض کیا مولانا مناظر احسن کی عشق نبوی کی حرارت کا اندازہ سیرت نبوی پر ان کی منفرد و ممتاز کتاب "النبی الخاتم" پڑھ کر بھی ہوتا ہے، جس میں صرف ادب و انشا کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ اس میں جو تاثیر و تسخیر کی قوت ہے اسکا سر چشمہ عشق رسول کی دولت ہے۔ جب حسن بے نظیر ہو تو عشق بے نظیر ہو سکتا ہے اور پھر وہ ہر اندیشہ سود و زیاں سے بے نیاز اور ہر پیچ و خم سے آزاد ہو کر اپنے محبوب کی بارگاہ میں پہنچ کر حرف تمنا کی آرزو کرتا ہے۔ مولانا مناظر کا اپنی مگدھی زبان میں دل بے تاب کا یہ اظہار ملاحظہ فرمایے:۔

پیارے محمد جگ کے سجن
تم پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا منموہن
کبھیو کرا ہو تو درشن
جیا کنھڑے دلوا ترسے
کرپا کے بدرا کہیا برسے
تمری دوریا کیسے چھوڑوں
تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں
تمرے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
آٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

اس نعت کے بارے میں حضرت گیلانی کے مشہور سوانح نگار ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں: یہ نعت 1927ء کی یادگار ہے، ہوا یہ تھا کہ مولانا موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے وطن گیلانی تشریف لے گئے، خون پیپ بن کر بہنے لگا، کئی آپریشن ہوئے، صحت نہ ملی، پھر ایک نئے آپریشن کی تیاری تھی، مولانا نے "بارگاہِ رسالت میں التجا والتماس" کی، التجا قبول ہوئی، حضور

ﷺ نے اپنے دیدار سے مشرف فرمایا، مرض جاتا رہا، آپریشن کی ضرورت ہی باقی نہ رہی……راز یہ تھا کہ اس رات میں غالباً سرورکونین ﷺ کی زیارت حصے میں آئی، مولانا حیدرآباد روانہ ہوگئے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نعت میں ان کی التجا والتماس میں کتنا سوز دروں اور غم پنہاں اور جذب وشوق کا کیا عالم ہوگا جو قبولیت کا یہ مقام پایا۔(13)

''عرضِ احسن'' کے عنوان سے مولانا مناظر حسن کی ایک دوسری نعت ایسی ملتی ہے جس میں شاعر جب ہجر کی آگ میں جلتا ہے تو بے قرار ہوکر اپنے محبوب کی آغوش میں پہنچنا چاہتا ہے، پھر اسے جتنی زبانیں آتی ہیں، عربی، فارسی، اُردو ہر زبان میں اپنا دکھڑا اپنے محبوب کو سناتا ہے، غم و اندوہ سے چھلنی اپنا سینہ یوں سامنے رکھ دیتا ہے:۔

ہر ایک سے ٹکرا کر ہر شغل سے گھبرا کر
ہر فعل سے شرما کر ہر کام سے پچھتا کر

آمد بدرت بنگر
اے خاتم پیغمبر

یا قاسم الکوثر اے سرور ہر سرور
اے رہبر ہر رہبر اے آں کہ توئی افسر

ہر کہتر و ہر مہتر فی المبدا والمحشر
اے ہستی تو محور للاکبر والاصغر

اے طلعت تو مظہر الاول والاخر
اے رحم جہاں پرور آقائے کرم گستر

آمد بدرت بنگر

امروز چہ مہمانے ناکارہ ونادانے

آلودۂ عصیانے آغشۂ دامانے
بازیچۂ شیطانے ازکردہ پشیمانے

آمد بدرت بنگر

نے مونس و نے یاور

نعت کے ان اشعار کو جو طویل نظم کا ایک مختصر ٹکڑا ہے پڑھ کر یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ نعت میں شاعر کا سوز دروں اور خون جگر شامل ہے۔اس میں عشق کی مستی وطر بنا کی اور وارفتگی ہے جو ظاہر ہے کہ نعت گو کے دل کی حرارت اور محبت کا نتیجہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مناظر احسن جیسے عاشق رسول نعت گوشاعر اور سیرت نگار مصنف کو بروز قیامت اپنے عشاق کے زمرہ میں اُٹھائے گا۔

حواشی:

(1) تفہیم القرآن: جلد ششم، مولانا مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ص:381

(2) ماہر القادری کے تبصرے، ماہر القادری، مکتبہ اسلامی دہلی، ص:88

(3) بیسویں صدی میں سیرت نگاران رسول، ڈاکٹر قدیر ناظم (قلمی) ص:735

(4) النبی الخاتم، مولانا مناظر احسن گیلانی، مکتبہ اخوت، لاہور، ص:10

(5) ایضاً، ص:6

(6) ایضاً، ص:10

(7) ایضاً، ص:24

(8) ایضاً، ص:98

(9) معارف اعظم گڑھ، مارچ 1957ء، ص:172

(10) پرانے چراغ، جلد اول، مولانا سید ابوالحسن ندوی، مکتبہ اسلام، ص:67

(11) النبی الخاتم ایک مطالعہ، مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی، مضامین ڈاٹ کام، 18.10.2017

(12) مناظر گیلانی، قاری اعظم عاجز قاسمی، مدرسہ اشرف العلوم، راجستھان، ص:12

(13) مولانا مناظر گیلانی، شخصیت اور خدمات۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ص:39

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، انجمن ڈگری کالج، بھٹکل کے صدر شعبۂ اُردو اور ایڈیٹر، ماہنامہ ''پیش رفت'' دہلی ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:211-227
Mr. Farooque Azam Qasmi, Allama Syed Manazir Ahsan Geelani ke Muhaqqiqin, Naqidin aur Mubassirin...

فاروق اعظم قاسمی

علامہ سید مناظر احسن گیلانی کے محققین، ناقدین اور مبصرین: ایک تجزیاتی مطالعہ

علامہ سید مناظر احسن گیلانی بیسویں صدی کے ایک صاحب نظر عالم دین اور عظیم محقق و مصنف تھے۔ انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں اپنی عملی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ اسی دوران انھوں نے درجنوں وقیع کتابیں تصنیف کیں اور سینکڑوں علمی و تحقیقی مقالے تحریر کیے۔ کچھ کتابیں تو ان کی حیات ہی میں شائع ہوکر مقبول ہوگئیں اور کچھ ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آئیں۔ علامہ کی کئی کتابوں کی ایک کتاب ان کے انتہائی بیش قیمت، علمی و تحقیقی خطوط بھی ہیں، خطوط کے بھی اب تک دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ کی اکثر کتابیں ان کے قسط وار مضامین کا مجموعہ ہیں تاہم اب بھی بہت سے مقالات ومضامین ہنوز کتاب بننے کے منتظر ہیں۔ تقریر وخطابت میں بھی علامہ گیلانی طاق اور اپنی مثال آپ تھے۔ اگر ان کے علم کا یہ صوتی ذخیرہ بھی محفوظ ہو پاتا تو فکرِ گیلانی کے مزید جزیروں کا انکشاف ہو پاتا۔ مولانا کی زود نویسی اور زیادہ نویسی کا یہ عالم تھا کہ صرف بیس دنوں میں دو جلدوں پر مشتمل ساڑھے سات سو صفحات کی کتاب 'ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت' تحریر کر ڈالی، لیکن صاحبانِ علم و مطالعہ جانتے ہیں کہ علامہ کی زودنویسی میں معانی کا فقدان ہے نہ زیادہ نویسی میں فکر کا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق علامہ گیلانی کے قلم سے تصنیف شدہ صفحات کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے۔

حضرت گیلانی کی حیات میں ان کی ذات وصفات اور علمی کمالات پر ان کے ممتاز شاگرد ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی نے بارہ صفحات پر مشتمل ایک مقالہ لکھا جن میں سات صفحات

علامہ کی سوانح سے متعلق ہیں۔ اسے سوانح گیلانی کا نقشِ اول کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں ''علما کی بے نیازی اور کسرِ نفسی شہرۂ آفاق ہے۔ اسی لیے باوجود ملک کے مؤلفین کی صفِ اول میں ہونے کے استاذِ محترم کی سوانحِ عمری کہیں چھپی ہوئی نہیں ملتی۔ اپنی معلومات درج کرتا ہوں تاکہ بعد والے کے لیے کچھ کام دیں۔'' (مقدمہ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، ص: 15) یہی مقالہ اس کتاب کا مقدمہ بھی ہے۔ وفات کے بعد ان کے علم و فضل کے بہت سے قدر شناسوں اور معاصر صاحبِ علم و قلم نے درجنوں مقالات و مضامین تحریر کیے، کتابیں لکھیں اور بعض جامعات نے ان کی حیات و خدمات اور مختلف علمی جہات پر تحقیقی اسناد بھی تفویض کیں۔

گیلانیات پر مطبوعہ تحریروں میں اکثر کا تعلق تحقیق سے ہے اور کچھ کا تنقید سے۔ ان کے مبصرین کو بھی ایک حد تک ناقدین کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن چوں کہ عموماً تبصرہ نگاروں کے پیشِ نظر کتاب کا تعارف اصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی بہت سے تحقیقی و تنقیدی عناصر بھی شاملِ تبصرہ ہو جاتے ہیں لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے، اس لیے 'مبصرین' کی سرخی علیحدہ لگانی پڑی۔

مذکورہ تینوں جہات پر گفتگو سے قبل اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہاں تحقیق سے مراد کتب و مقالات (سندی و غیر سندی) پر مشتمل وہ تمام تحریریں ہیں جن میں علامہ گیلانی کی شخصیت و سوانح سے متعلق اور قلمی کاوشوں کی کھوج سے بحث کی گئی ہو، اور تنقید سے مراد وہ تمام تحریریں ہیں جو علامہ کے فکر و فن دونوں سے بحث کرتی ہیں۔ علامہ سید مناظر احسن گیلانی قرآن و حدیث اور تاریخ و ادب کے ساتھ ساتھ علمِ فقہ سے بھی گہرا شغف اور اور اپنی نظر رکھتے تھے۔ اس لیے تعلیمی، سماجی اور اصلاحی امور میں علامہ اپنی الگ رائے رکھنے کے ساتھ بہت سے فقہی مسائل میں بھی ان کے کچھ تحفظات و تفردات تھے اور ان کے پیچھے ٹھوس دلائل بھی۔ ایسے ہی علامہ گیلانی ایک اچھے شاعر اور ادیب بھی تھے اس لیے ان کے شعر و ادب پر بھی کئی نقادوں نے قلم اٹھایا ہے۔

اسی طرح مختلف علوم و فنون پر علامہ کی تحریر کردہ کتابوں پر اصحاب علم و نظر کے تحریر کردہ تبصروں کا جائزہ پیشِ نظر ہے۔ علامہ گیلانی پر لکھے مقالات میں کسی خاص پہلو کا احاطہ کرنے کے بجائے ان کے جملہ اوصاف و کمالات اور خدمات پر مجموعی گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں بھی بہت کم ہی

ایسی تحریریں ملیں گی جن میں خالص شخصیت پر بات کی گئی ہو یا بطور خاص ان کے کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہو؛ البتہ ایک تحقیقی مقالہ اور ایک کتاب میں علامہ گیلانی کی ایک مخصوص جہت کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے۔ یہاں تقریبِ تفہیم کے لیے محققین، ناقدین اور مبصرین کی جو تقسیم کی جا رہی ہے وہ اکثری تقسیم ہے۔ ورنہ ان کے بیچ واضح خطِ امتیاز کھینچنا بہت دشوار ہے۔ گیلانیات کے باب میں تحقیق کو بھی تین زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک مقالاتی تحقیق۔ دوسرے کتابی تحقیق اور تیسرے جامعاتی تحقیق۔

محققین:

(مقالات) علامہ گیلانی کی حیات وکارناموں پر دو درجن سے زائد علما وفضلا اور ادبا نے خامہ فرسائی کی ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام انتہائی نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی (مقدمہ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی 1950)، مفتی ظفیر الدین مفتاحی (ماہنامہ 'دارالعلوم' دیوبند، ستمبر 1956)، سید صباح الدین عبد الرحمٰن (ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ، اپریل 1957)، ڈاکٹر غلام محمد (تذکرۂ احسن، مقالات احسانی 1957)، مولانا علی میاں ندوی (ماہنامہ 'الفرقان' لکھنؤ، جولائی 1957)، مولانا عبد الباری ندوی (بڑا نادر سنگم: دل و دماغ دونوں کا)، مکاتیبِ گیلانی 1961)، پرفیسر مظفر گیلانی (مولانا مناظر احسن گیلانی: حیات اور شخصیت (ماہنامہ 'الفرقان' لکھنؤ، نومبر ودسمبر 1986)۔

1950 میں ڈاکٹر حمید اللہ نے سات صفحات کی اس مختصر سوانحی تحریر میں مولانا کے نام، جائے پیدائش، خاندان، تعلیم، مسلک، قوت حافظہ، ذوقِ مطالعہ، خطابت، انشا پردازی، شاعری، قیام حیدر آباد کی سرگرمیوں کو بیان کیا اور اپنے شاگردانہ تعلقات کا بھی اظہار کیا ہے۔ اس مقالے میں دو چیزیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک تو علامہ گیلانی کی شعبۂ دینیات سے وابستگی اور اس کی نوعیت کا حال دوسرے جدید اذہان پر ان کی دینی اور تعمیری تربیت کا گہرا اثر۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا: ''ہمالیہ تلے کے برّ اعظم کی ڈیڑھ دو درجن جامعات میں سب سے کم دہریت اگر کسی جگہ پھیل سکی تو وہ جامعہ عثمانیہ رہی ہے، اور اس کا سہرا بہت بڑی حد تک صرف مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ کے سر رہا۔'' (مقدمہ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، ص:19)

علامہ گیلانی کے انتقال کے بعدان پرشائع ہونے والے اولین مضامین میں ایک اہم مضمون مفتی ظفیر الدین مفتاحی کا ہے جو گیارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں غیر مربوط تاثرات اور فاضل مضمون نگار کا علامہ گیلانی سے گہرے ربط کے ساتھ ساتھ بہت سے حقائق کا بھی علم ہوتا ہے جنھیں بعد کے دیگر حضرات نے بھی ذکر کیا ہے۔ اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ علامہ گیلانی کی مردم سازی اور خردنوازی کی جہت کھل کر سامنے آتی ہے۔ بعد میں مفتی صاحب نے علامہ گیلانی کی ایک مفصل سوانح بھی تصنیف فرمائی۔

وفات کے بعد لکھی جانے والی تحریروں میں سب سے قابل ذکر سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا مضمون ہے۔ 'معارف' کے لیے اپریل 1957 میں مرحوم نے انتہائی دقتِ نظری سے کام لیتے ہوئے پچپن صفحات پر مشتمل ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں علامہ گیلانی کی جائے پیدائش، اس کا محل وقوع، ان کے گھر اور باغات کا ذکر، خاندانی احوال، ان کے دادا کی علمی عظمت، اولاد کا ذکر، قیام مونگیر، مولانا محمد علی جوہر سے ان کے والہانہ تعلقات، دارالمصنفین اور سید سلیمان ندوی سے بے پناہ محبت وعقیدت اور دوستانہ رشتے، سید صاحب کی وفات کے بعد علامہ گیلانی کے صدمے اور خود فاضل مضمون نگار سے ان کی شفقت ومروت کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح صباح الدین صاحب نے علامہ کے عشقِ رسول، تصوف، خطابت، کسر نفسی اور ظرافت وغیرہ کو بھی بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ موصوف چوں کہ خود علامہ گیلانی کے ہم وطن تھے اس لیے انھیں وقتاً فوقتاً ان سے بات وملاقات اور استفادے کا موقع ہاتھ آجاتا یہی وجہ ہے کہ سید صباح الدین مرحوم کو بہت قریب سے حضرت گیلانی کو دیکھنے اور ان کے مزاج ومذاق کو سمجھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے حضرت گیلانی کے دارالمطالعہ کی تصویر یوں کھینچی ہے:

''ان کی کل کائنات ایک چارپائی تھی، اسی پر قلم اور دوات رکھ لیتے اور علم وفن کا خزانہ لٹاتے رہتے، چارپائی کے بغل میں دو تخت تھے، ان پر معمولی سا فرش اور اس کے اوپر ایک قالین تھا، قالین اور فرش کے درمیان ان کا دفتر تھا، ان کے سارے کاغذات اور خطوط قالین کے نیچے پڑے رہتے تھے، کمرے میں چار بڑی بڑی الماریوں میں منتخب کتابیں تھیں، یہی ان کا آفس اور کتب خانہ سب کچھ تھا، لکھتے لکھتے جب تکان محسوس کرتے تو چارپائی کے نیچے ہاتھ بڑھا کر ٹین کا

ایک معمولی ساڈبہ گھسیٹتے، اس میں مٹی کے تین کلھڑوں میں کتھا، چونا اور ڈلی تھی اور کپڑے کے ایک ٹکڑے میں کچھ پان لپٹے ہوتے، یہ پاندان ان کی ساری زمینداری، کھیتی، باغ اور گراں قدر تنخواہ کا ماحصل تھا۔'' (بزمِ رفتگاں، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2007، ص:212-213)

اس مقالے میں علامہ مناظر احسن گیلانی کے قیام دیوبند، وہاں سے کلکتہ کا سفر، واپسی میں حیدرآباد میں پڑاؤ، پھر وہاں مستقل قیام کا نظم اور ان کے سفرِ آخرت وغیرہ کا تفصیلی ذکر بھی ہے۔ اس مقالے کا ایک حاوی پہلو علامہ گیلانی کی فروتنی، کسرِ نفسی اور علمی جاہ وجلال ہے۔ حضرت گیلانی کے مستقبل کے محققین کے لیے خاصے کی چیز یہ بھی ہے کہ صباح الدین صاحب نے تادمِ تحریر ان کی تمام کتابوں کے طبع اول کے سنہ بھی درج کر دیے ہیں۔ مثلاً: 1937 میں 'کائناتِ روحانی'، 'سیرتِ ابوذر غفاریؓ'، 'النبی الخاتم ﷺ'، 1938 میں 'تذکرہ مجدد الفِ ثانی' اور 'تذکرہ شاہ ولی اللہؒ'، 1941 میں 'تدوینِ حدیث' اور 'تدوینِ فقہ'، 1944 میں 'الدین القیم' اور 'ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت'، 1947 میں 'اسلامی معاشیات' اور 'امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'۔

اسی طرح گیلانیات کے باب میں ایک اہم انکشاف یہ ہے کہ اس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے علامہ گیلانی کے مورخانہ مقام ومرتبے کو واضح کیا ہے اور خود ان کی تحریروں سے استفادے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ''مجدد الفِ ثانی'' کا مطالعہ کرنے کے بعد انھیں محسوس ہوا:

''پڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مغلیہ عہد کی تاریخ کی تمام گرہیں کھل گئیں، راقم کا خاص موضوع 'ہندوستان میں اسلامی عہد کی تاریخ' رہا ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد تیموری دور کی تاریخ سمجھنے میں ایک خاص زاویہ نظر ملا۔ دینِ الٰہی پر مضامین پڑھتا رہتا تھا، ملا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ جلد سوم میں تو اس کی تفصیل ملتی ہے جو چار سو صفحوں میں انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ منتشر ہے۔ مولانا نے پہلی دفعہ ترتیب وتنظیم کے ساتھ اکبر کی اس بدعتِ سیئہ کا احاطہ کیا، اس لیے مجھ پر ان کی عالمانہ تحقیق وتنقیح کا بڑا گہرا اثر پڑا۔'' (ایضاً، ص:195)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''اگر ان کی تعلیم خاص انگریزی طرز کی ہوتی اور وہ اپنا موضوع صرف تاریخِ ہند بنا لیتے تو شاید ان کے پایہ کا کوئی مورخ ہندوستان میں نہ ہوتا۔ مولانا کی

نظر ہندوستان کے سیاسی واقعات کے ساتھ مذہبی رجحانات، تحریکات اور انقلابات پر بھی تھی، اس لیے ان کے نقد و تبصرے میں بڑی جامعیت ہوتی تھی جو تاریخ ہند پر دوسرے لکھنے والوں کو میسر نہیں۔'' (ایضاً، ص: 197) ایک مورخ کے قلم سے نکلے یہ سطور ہمیں اس بات کی دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ علامہ گیلانی کا مطالعہ اس پہلو سے بھی کیا جائے۔

چوتھا مضمون علامہ کے شاگرد اور ان کے علوم کے حقیقی وارث ڈاکٹر غلام محمد کا مضمون ''تذکرۂ احسن'' ہے جو 'مقالات احسانی' میں مقدمہ کے بطور درج ہے۔ یہ تحریر حضرت گیلانی کی مختصر سوانح حیات ہے۔ ڈاکٹر غلام محمد نے یہاں وطن، ابتدائی ماحول، تعلیم، قیام دیو بند، قیام حیدر آباد اور جامعہ عثمانیہ سے تعلق، واپسیٔ وطن، سفرِ آخرت، کرامتِ مرگ، حلیہ، لباس، ذہنی بناوٹ، تصنیف و تحریر، تقریر، شاعری، خُلق، عالمانہ امتیاز، عارفانہ منزلت وسعت و پاکیٔ مشرب اور منصبِ ارشاد سے گریز جیسے عناوین کے ذریعے ایک جامع سوانح مرتب کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ حیدر آباد سے علامہ کے لگاؤ اور سلوک و طریقت کی تفصیل اس مضمون میں بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن یہاں سب سے قابل ذکر وہ سات امتیازات کی نشاندہی ہے جو حضرت گیلانی کو اپنے معاصر علما سے ممتاز کرتے ہیں۔

پانچویں تحریر مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی ہے جو ایک طویل مقالے کی شکل میں ہے۔ مذکورہ بالا مقالات کی طرح یہ سوانحی تحریر نہیں ہے؛ تاہم علی میاں نے اپنی چیدہ چیدہ یاداشتوں کو یکجا کر کے علامہ گیلانی کا ایک خوب صورت خاکہ کھینچا ہے۔ موصوف نے سرسری ہی سہی تاہم علامہ گیلانی کے ان جہات کی طرف ضرور اشارہ کر دیا ہے جنھیں پیش نظر رکھ کر محققین کام کر سکتے ہیں۔ علی میاں لکھتے ہیں: ''مولانا عالموں میں عالم تھے، ادیبوں میں ادیب، مؤرخوں میں مؤرخ، فقیہوں میں فقیہ، محدثوں میں محدث، مفسروں میں مفسر، فارسی، اردو کا ان کا یکساں مذاق تھا، شعر و شاعری کا ذوق اور سخن شناسی و سخن سنجی دونوں سے حصۂ وافر ملا تھا۔'' (پرانے چراغ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ الشباب العلمیہ، لکھنؤ 2010، چھٹا ایڈیشن، ص: 59)

گیلانیات کے باب میں قرآنیات، سیرت اور تاریخ پر مولانا نے بطور خاص روشنی ڈالی ہے۔ علامہ گیلانی اور حیدر آباد کا ذکر بھی قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ علی میاں نے

حضرت گیلانی سے اپنے گہرے علمی تعلقات اور عالم اسلام سے ان کے بے پناہ لگاؤ اور حمیتِ اسلامی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اٹھائیس صفحات کے اس طویل مقالے میں علامہ گیلانی کے ''اسلامی اقامت خانہ'' کے تصور کو بھر پورا جاگر کیا گیا ہے اور مولانا عبدالباری ندوی کے ہاتھوں اس تصور کے عملی تجربے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

چھٹا مضمون مولانا کے پچیس سالہ ہم نشیں مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کا ہے اور یہ مضمون بھی تقریباً پچاس صفحات پر محیط ہے۔ بقول مولانا ندوی یہ تحریر علامہ گیلانی کی سوانح ہے نہ ان کی علمی و تصنیفی کارناموں کی تفصیل و تحقیق اور نہ ہی مکتوبات پر تنقید بلکہ ربع صدی کی کھٹی مٹھی یادوں کی ایک روداد اور دیرینہ رفاقت کی ایک داستان ہے۔ تاہم اس مضمون میں علامہ گیلانی کے عادات واطوار، مزاج و مذاق، خوش طبعی، زہد، فنائیت، تقویٰ وطہارت اور تواضع و کسر نفسی وغیرہ کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالباری ندوی نے علامہ گیلانی کے قیام حیدر آباد کے دوخصوصی ڈپارٹمنٹ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک سفارش کا، دوسرے تقریر کا۔ کسی کی بھی سفارش کو وہ ٹالتے تھے نہ ہی کسی پروگرام کی تقریری فرمائش کو، بلکہ پے در پے تقریر کی کثرت نے انھیں مریض بنا دیا تھا۔ نتیجۃً مولانا باری اور مولانا حبیب الرحمٰن کو ان پر پانچ چھ ماہ کی بندش لگانی پڑی تب جا کر ان کی طبیعت ذرا سنبھلی۔ گیلانیات کے باب میں دو چیزیں یہاں بہت اہم ہیں۔ مکتوبات کی روشنی میں علامہ گیلانی کی تفسیری نظر اور جدید طبقے کے اندر ایمان وایقان کی اسپرٹ پیدا کرنا۔ بقول مولانا ندوی: ''یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا گیلانی نے اپنی تحریری، تقریری زندگی کا سب سے بڑا مشن اپنے نئے بھکے ہوئے بھائیوں کی دستگیری کو بنا رکھا تھا'' (مقدمہ مکاتیبِ گیلانی، مدون: مولانا منت اللہ رحمانی، دارالاشاعت رحمانی، مونگیر (1972) ص:60-59) علامہ گیلانی نے اس کے لیے اسلامی اقامت خانے کا ایک قابل عمل تصور پیش کیا تھا۔ اس تصور کو مذکورہ مضمون میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اس سلسلے کا ایک اہم مضمون علامہ گیلانی کے ایک عزیز پروفیسر مظفر گیلانی کا ہے۔ انھوں نے علامہ گیلانی کے ساتھ گزرے حسین لمحات قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ مظفر گیلانی نے اس مضمون کو ''مولانا مناظر احسن گیلانی: حیات اور شخصیت'' کا عنوان دیا ہے۔ اس کے ذیل

میں ذاتی حالات فقیرانہ زندگی، مولانا گیلانی اور شاعری، ظرافت، تصنیفات، تاریخ وفات، حلیہ اور لباس اور سلسلۂ ادارت جیسی سرخیوں کے ذریعے ایک حد تک سوانحِ گیلانی کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ مضمون بظاہر بارہ صفحات ہی کا ہے تاہم اس میں بہت سے ایسے انکشافات ملتے ہیں جو دوسری طویل تحریروں میں بھی نہیں ملتے۔ مثلاً: علامہ اقبال سے حضرت گیلانی کا شغف، مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا محمد منظور نعمانی سے تعلق خاطر وغیرہ۔ اسی طرح علامہ گیلانی کے کئی واقعات کے ذریعے بھی ان کے سوانحی عناصر کو ابھارا گیا ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں بھی بہت سے حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ اس مقالے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ مظفر گیلانی نے اس میں علامہ گیلانی کے ایک ڈائری کا ذکر کیا ہے جو ان کی تحویل میں تھا۔ اس ڈائری کے حوالے سے بہت سے غیر مطبوعہ مسودات کا بھی علم ہوتا ہے۔ بعد میں انھوں نے اس ڈائری کو خدا بخش لائبریری کے حوالے کر دیا تھا جس کی عکسی کاپی علامہ گیلانی کے ایک پاکستانی محقق ڈاکٹر امان راٹھور لاہور لے گئے اور لاہور کے پنجاب یونیورسٹی کے ایک اسکالر عثمان احمد نے اپنی تحقیق و تعلیق کے ساتھ اسے ''بیاضِ مناظر'' کے نام سے 2013ء میں شائع کیا۔

(کتب) میرے علم میں اب تک علامہ سید مناظر احسن گیلانی کی ذات وصفات پر تین باضابطہ کتابیں آپائی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

حیاتِ مولانا گیلانی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، مولانا یوسف اکیڈمی، بنارس، 1989ء

مولانا مناظر احسن گیلانی: سوانح و شخصیت، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 2002ء

مولانا مناظر احسن گیلانی بحیثیت سوانح نگار، ڈاکٹر انور جہاں خاتون، شعبہ اردو، ایل۔ایس۔کالج، مظفر پور 2005ء

علامہ سید مناظر احسن گیلانی کی سوانح پر باضابطہ سب سے پہلی کتاب مفتی ظفیر الدین مفتاحی کی ''حیاتِ مولانا گیلانی'' ہے۔ مفتی مرحوم علامہ گیلانی کے خوشہ چینوں میں تھے اور بڑی کد وکاوش سے اس کتاب کو مرتب کیا۔ پہلی بار یہ کتاب مولانا یوسف اکیڈمی بنارس سے 1989 میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد پاکستان میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس وقت مجلس نشریاتِ اسلام،

کراچی (1994) کا مطبوعہ نسخہ میرے پیشِ نظر ہے۔ پہلے اور اس ایڈیشن میں سوائے سرورق اور ناشر کے کوئی نئی تبدیلی نہیں ہے۔ کتاب بشمول چوبیس ابواب 336 صفحات پر محیط ہے۔ کتاب پر پیش لفظ مولانا ابوالحسن علی میاں کے قلم سے ہے۔ یہ کتاب چاہے جدید سوانحی اصول پر کھری نہ اترتی ہو تاہم گیلانیات کے باب اسے اولیت کا شرف ضرور حاصل ہے۔ بعد کے محققین اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ اس کتاب میں علامہ گیلانی کی حیات، کمالات و امتیازات اور خدمات کا تفصیلی ذکر آ گیا ہے جو گیلانی شناسی کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسری کتاب ''مولانا مناظر احسن گیلانی: سوانح و شخصیت'' عصر موجود کے معروف محقق ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کی تصنیف کردہ ہے۔ سات ابواب کے ساتھ بیاسی صفحات پر مشتمل یہ ایک مختصر کتاب کیا، کتابچہ ہے، لیکن گیلانی شناسی میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اسے علامہ گیلانی کے کتب و مقالات کا ایک وضاحتی اشاریہ یا Reference Book بھی کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان اس بات کا شکوہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ علامہ گیلانی کے شایانِ شان علمی کام ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ مفتاحی مرحوم کے کام کو مفید تو قرار دیتے ہیں لیکن اسے کام کا آغاز ہی بتاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی اعتراف کرتے ہیں ''اس میدان میں ابھی تک مفتاحی صاحب کا کوئی حریف پیدا نہیں ہوا'' (مولانا مناظر احسن گیلانی: سوانح و شخصیت، ص: 2) سچی بات یہ ہے کہ یہ ایک مختصر رسالہ ضرور ہے تاہم اسے حیاتِ مولانا گیلانی پر اضافہ کہا جائے گا۔ اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں علامہ سید مناظر احسن گیلانی کے قلمی سرمایے کو موضوعاتی شکل دینے کی قابلِ ذکر کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے مقالات و مضامین کو، تاریخ و سیاسیات، تراجم و ادبیات، سوانح و شخصیات، مذہب و اخلاقیات اور متفرقات جیسے عنوانات دیے ہیں۔

تیسری کتاب ''مولانا مناظر احسن گیلانی بحیثیت سوانح نگار'' دراصل ڈاکٹر انور جہاں خاتون کی پی ایچ. ڈی. کا مقالہ ہے جس کے چھ ابواب اور 142 صفحات ہیں۔ اس کتاب میں صرف چھ کتابوں یعنی النبی الخاتم، تذکرۂ شاہ ولی اللہ، حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، سوانح قاسمی، سوانح ابوذر غفاریؓ اور سوانح اویس قرنیؒ کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ جب کہ اس ضمن میں

علامہ گیلانی کی تذکرہ مجدد الف ثانی، سیرتِ بانئ دار العلوم، بابا رتن ہندی جیسی کتابیں اور کتابچے اور ایک درجن سے زائد سوانحی مقالات بھی ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع سے انصاف کرتی نظر نہیں آتی اور بہت ناقص ہے۔اس سب کے باوجود مصنفہ نے گیلانیات کے باب میں ایک راہ ضروری ہے۔ایک چوتھی کتاب ''مولانا مناظر احسن گیلانی: عالم بے بدل'' ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی کی بھی ہے۔ یہ کتاب چوں کہ اب تک میرے دسترس سے باہر ہے اس لیے اس کی تفصیلی نوعیت بیان کرنے سے میرا قلم قاصر ہے تاہم سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے بریکٹ میں یہ سطر درج ہے ''سید مناظر احسن گیلانی کے سوانح اور مقالات متعلقہ قرآن، حدیث اور فقہ'' اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کے مختلف مقالات کا ایک وقیع مجموعہ ہے۔

(جامعاتی تحقیق) علامہ گیلانی پر باضابطہ کتابوں کے ذکر کرنے کے بعد اب ان تحقیقی مقالات پر گفتگو کی جائے گی جن پر مختلف یونیورسٹیوں میں اسناد تفویض کی گئی ہیں۔میرے محدود علم کے مطابق ہندو پاک سمیت سب سے پہلا مقالہ ہندوستان کی مگدھ یونیورسٹی گیا میں لکھا گیا۔اس کے بعد کی جملہ تفصیلات درج ذیل ہیں:

1-مولانا مناظر احسن گیلانی: حیات اور ادبی خدمات، اسکالر: سید محمد نور الہدیٰ، نگراں: پروفیسر محمد قاسم احسن وارثی، کالج آف کامرس مگدھ یونیورسٹی، گیا (1983)

2-مولانا سید مناظر احسن گیلانی: شخصیت اور علمی خدمات، اسکالر: عبدالسلام صدیقی، نگراں: ڈاکٹر زین الساجدین صدیقی، شعبہ دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (2002)

3-مولانا مناظر احسن گیلانی: جہات اور علمی کارنامے (ایم.اے)، اسکالر: شازیہ رانا، نگراں: پروفیسر ڈاکٹر شبیر احمد منصوری، شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور (1983)

4-علوم اسلامیہ کی تشکیل جدید میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا کردار (تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ) اسکالر: امان اللہ راٹھور، نگراں: ڈاکٹر محمد عبداللہ، شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور (2012)

5-علامہ سید مناظر احسن گیلانی: حیات و خدمات (عربی) اسکالر: جنید احمد، نگراں: مولانا محمد عارف جمیل مبارکپوری، شعبہ تخصص عربی زبان وادب، دار العلوم، دیوبند (2013)

6-مولانا مناظر احسن گیلانی: اسلام کا نظریہ معاش، اسکالر: عبدالسلام نادر، نگراں: ڈاکٹر ضیاء

الدین فلاحی، شعبۂ دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (زیر تحقیق)۔

ان مذکورہ بالا چھ مقالات میں پانچ کی زبان اردو ہے اور ایک مقالہ عربی زبان میں ہے جسے دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تخصص عربی زبان و ادب نے تفویض کیا۔ اب یہ مقالہ مزید اضافوں کے ساتھ زیر اشاعت ہے۔ ان مقالات میں آخر الذکر زیر تحقیق ہے۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان تمام مقالات میں راقم کی رسائی صرف ایک ہی مقالے تک ہو پائی ہے۔ یعنی ''مولانا سید مناظر احسن گیلانی: شخصیت اور علمی خدمات'' کے عنوان سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (2002) کے شعبہ دینیات (سنی) نے عبدالسلام صدیقی کو پی ایچ. ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔ یہ مقالہ تین ابواب سمیت 172 صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا باب: شخصیت، دوسرا باب: علمی خدمات اور تیسرا باب افکار و نظریات، کے عنوان سے معنون ہے۔ چوں کہ دیگر مقالے میرے سامنے نہیں ہیں اس لیے ان میں تقابل کا عمل ممکن نہیں تاہم دستیاب مقالے میں اسکالر نے بڑی محنت سے علامہ کے جملہ کارناموں کے احاطہ کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کا آخری باب خاصے کی چیز ہے اس لیے کہ یہاں علامہ گیلانی کے دینی، تعلیمی اور سیاسی افکار کو مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے کی خوبی یہ ہے کہ اس کی ترتیب میں علامہ کے متن سے براہِ راست کام لیا ہے اور اس سلسلے میں فاضل محقق نے کتب و مقالات اور مکتوبات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

ناقدین:

علامہ سید مناظر احسن گیلانی کے فکر و فن پر کئی حضرات نے گفتگو کی ہے۔ ان میں چند قابل ذکر نام درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی (تدوینِ قرآن، مکتبۃ البخاری، کراچی 2005)، مولانا سید ابو الاعلی مودودی (سود، اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور 1968)، ڈاکٹر رشید احمد جالندھری (تدوینِ فقہ، اتحاد بک ڈپو، دیوبند (س ن)، ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی (امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، مکتبہ الحق، دیوبند 2004) چوتھا ایڈیشن، مولانا عبدالباری ندوی (مکاتیبِ گیلانی 1972)، ڈاکٹر امان اللہ راٹھور ('مولانا مناظر احسن گیلانی: مکتوب نگاری اور دوسری صلاحیات، مجلّہ 'تحقیقاتِ اسلامی' علی گڑھ، جنوری 2008)، حقانی القاسمی (دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت

نامہ، آل انڈیا تنظیم علمائے حق، نئی دہلی (2006)، ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی (مولانا مناظر احسن گیلانی کا نثری اسلوب، سہ ماہی 'فکر و تحقیق' نئی دہلی (جولائی تا ستمبر 2017)، پروفیسر وہاب قیصر (ادب، خدا بخش جرنل، پٹنہ۔ مولانا تنویر خالد قاسمی (ادب، روز نامہ 'انقلاب' پٹنہ ایڈیشن (23 نومبر 2014)، پروفیسر محسن عثمانی ندوی (شاعری، مقدمہ مناظر گیلانی، مدرسہ اشرف العلوم جھنجھنو راجستھان 2007)، ڈاکٹر ابو منور گیلانی (شاعری، ماہنامہ 'زبان و ادب' پٹنہ (جون 2015)، فاروق اعظم قاسمی ('علامہ سید مناظر احسن گیلانی کا شعری جہان'، تخلیق کی دہلیز پر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2013)، مولانا طلحہ نعمت ندوی (شاعری، عربی، سہ ماہی 'النصیحہ' مظفر پور، جولائی 2017)۔

علامہ کے ناقدین کے ضمن میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ تنقید سے مراد علامہ گیلانی کے فکر اور فن دونوں کی تنقید کا جائزہ لینا مطلوب ہے۔ علامہ سید مناظر احسن گیلانی اپنے وسیع مطالعے، گہرے علم اور طویل تجربات کی روشنی میں ایک سے زائد مسائل میں اپنی الگ رائے رکھتے تھے۔ مثلاً: مومن و مسلم کو عذابِ جہنم نہیں ہوگا۔ عربی زبان پر قدرت رکھنے کے باوجود جمعے کا خطبہ مادری زبان میں دینا جائز ہے، قرآن کے ساتھ تورات کی تلاوت کرنا تا کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہو اور دارالحرب میں غیر مسلموں سے مسلمانوں کا سود لینا جائز ہے۔ وغیرہ۔ آج دارالحرب والے مسئلہ کی معنویت چاہے نہ ہو لیکن پچھتر سال قبل اس کی اہمیت و معنویت ضرور تھی۔ علامہ گیلانی کی اسی رائے پر مولانا مودودی نے تنقید کی ہے اور بڑے جچے تلے انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ علامہ گیلانی کا مضمون ''مسئلہ سود اور دارالحرب'' مولانا مودودی کی کتاب ''سود'' میں درج ہے۔

تدوینِ قرآن میں علامہ گیلانی کے نظریۂ 'تلاوتِ تورات' پر ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی نے گہری اور مفصل تنقید کی ہے۔ گیلانی نے علامہ ذہبی کے تذکرۃ الحفاظ کے حوالے سے ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ صحابیٔ رسول عبداللہ ابن سلامؓ نے جب قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ تورات کی تلاوت کی بھی رسول اللہ سے اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اقرأ هذا الليلة وهذا الليلة'' یعنی ایک رات قرآن کی تلاوت کرو اور ایک رات تورات کی۔ علامہ گیلانی نے اس کا مقصد بھی بتایا کہ اس عمل سے قرآن کی تفہیم مزید آسان ہوگی۔ اس ضمن میں انھوں نے کئی دلائل بھی پیش

کیے۔ چشتی صاحب کا خیال ہے کہ یہ روایت کمزور ہے اور خود تورات منسوخ ہے اور ناسخ کے سامنے منسوخ کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، اس لیے تورات کی تلاوت جائز نہیں۔ انھوں نے دارمی کے حوالے سے حضرت جابرؓ کی ایک روایت نقل کی جس میں حضرت عمرؓ کے تورات کے پڑھنے پر رسول اللہ نے ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور اجازت والی روایت کے بارے میں کہا کہ یہ یا تو موضوع روایت ہے یا پھر اس سے زیادہ سے زیادہ تقابلی مطالعے کا جواز مہیا ہوتا ہے۔ یہ پوری بحث بطورِ مقدمہ 'تدوینِ قرآن' میں شامل ہے۔ ان دونوں حضرات کی تنقید کا تعلق خالص فکری تھا۔ ذیل میں اب علامہ گیلانی کی تحقیق وتخلیق اور اسلوبیات پر کی گئی تنقید کا جائزہ لیا جائے گا۔

فاضل دیوبند ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کے وقیع مقدمے کے ساتھ پہلی بار 1976 میں ''تدوینِ فقہ'' شائع ہوئی۔ اس کتاب کی حیثیت تدوینِ فقہ کے مقدمے کی ہے اور اس کے دوسرے حصے کو بھی آنا تھا جو نہ آسکا۔ اس میں علامہ نے اس عام رجحان کو غلط ثابت کیا ہے کہ فقہ اور قانون بے مزہ اور خشک موضوع ہے اور سوسائٹی کے پڑھے لکھے لوگوں کو اسلاف کی روایتوں سے آگاہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جالندھری صاحب کا کہنا ہے کہ سوسائٹی اور قانون کا رشتہ کیسے مضبوط ہو؟ اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو ہوئیں؛ اجتماعی نہیں۔ ان ہی انفرادی کوششوں کی ایک اہم کڑی مقدمہ 'تدوینِ فقہ ہے۔ اس کتاب کے مسودے میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں انھیں بھی ڈاکٹر صاحب نے درست کیا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی بہت اوجھل ہی سہی اپنی تحریر میں علامہ گیلانی کی کچھ باتوں کی صحت پر سوال اٹھایا ہے اور اس کی درست نشاندہی کی ہے۔ علاوہ ازیں تدوینِ حدیث میں بھی ڈاکٹر صاحب نے علامہ گیلانی کے بعض تسامحات سے ڈاکٹر غلام محمد کو آگاہ کیا تھا۔ (مولانا مناظر احسن گیلانی: سوانح وشخصیت، ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ص:59)

گیلانیات کے باب میں قرآنیات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں مولانا عبد الباری ندوی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بطورِ خاص مکتوبات گیلانی کی روشنی میں مولانا ندوی نے بہت قیمتی تحقیق وتنقید پیش کی ہے جو مستقبل کے گیلانی شناسوں کے لیے خاصے کی چیز ہے۔

گیلانی شناسی کے باب میں ایک اہم نام ڈاکٹر امان اللہ راٹھور کا بھی ہے۔ موصوف

گورنمنٹ کالج سمبڑیال، سیال کوٹ (پاکستان) کے لکچرار ہیں۔ ان کی پی ایچ. ڈی. کا موضوع ''علومِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا کردار'' تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'مولانا مناظر احسن گیلانی: ایک عہد ساز شخصیت'، 'مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی' اور 'مولانا مناظر احسن گیلانی: مکتوب نگاری اور دوسری صلاحیات' جیسے تحقیقی و تنقیدی مقالات بھی تحریر کیے۔ سرِ دست میرا موضوعِ گفتگو آخرالذکر مضمون ہے۔ یہاں موصوف نے ادبی حوالے سے مکتوبات کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑی صحت مند تنقید کی ہے۔ سیرت وسوانح، کتابوں پر تبصرہ، تاریخ عالم پر محکم گرفت، نکتہ آفرینی، زبان وادب، اسلوبِ بیان، معارفِ قرآنی کا خزانہ، تعلیمی نظریات، شاعری اور سخن شناسی اور مکاتیب پر ایک اجمالی نظر، اس مقالے کے نمایاں ذیلی عنوانات ہیں۔

ڈاکٹر غلام محمد، ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور ماہر القادری وغیرہ نے علامہ گیلانی کی اسلوبیاتِ نثر پر سرسری ہی سہی کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے لیکن ان کے نثری اسلوب پر باضابطہ لکھنے اور تعینِ قدر کرنے والوں میں جنابِ حقانی القاسمی کو اولیت حاصل ہے۔ 'دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ' میں انھوں نے مختصر ہی سہی، بہت جامع تنقید کی ہے۔ یہ تنقید آئندہ لکھنے والوں کے لیے خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کا مضمون 'مولانا مناظر احسن گیلانی کا نثری اسلوب' سہ ماہی 'فکر و تحقیق'، نئی دہلی (جولائی تا ستمبر 2017) میں شائع ہوا۔ یہ سولہ صفحے کا ایک طویل مضمون ہے۔ ڈاکٹر اجراوی نے اپنے اس مضمون میں علامہ گیلانی کی مختلف کتابوں سے اقتباسات اور مثالوں کے ذریعہ اسلوبیاتِ گیلانی اور اس کے امتیازات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ حقانی القاسمی کی تحریر کے بعد اس مضمون کو اس سلسلے کی دوسری کڑی کہا جا سکتا ہے۔ پروفیسر وہاب قیصر کے مضمون کو تنقید کے بجائے ادبی تجزیہ کا نام دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولانا تنویر خالد قاسمی کا مضمون 'مخصوص طرزِ انشاء کا موجد مولانا مناظر احسن گیلانی' کو بھی علامہ گیلانی کی نظم ونثر کے تجزیے پر مشتمل ایک ادبی تحریر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی کا مضمون جو دراصل مناظر گیلانی (شعری مجموعہ) کا مقدمہ ہے، علامہ گیلانی کی دونوں مشہور نعتوں کا انتہائی خوب

صورت تجزیہ اوران کی شاعری کی ایک بھرپور تنقید ہے۔ڈاکٹر ابومنور گیلانی کا ایک مضمون علامہ گیلانی کی مثنوی ''خوابِ وطن'' پر ماہنامہ 'زبان وادب' پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔اس مضمون میں علامہ گیلانی کو بحیثیت مثنوی نگار پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

راقم نے ''علامہ سید مناظر احسن گیلانی کا شعری جہان'' کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو اس کی کتاب 'تخلیق کی دہلیز پر' (2013) میں شامل ہے۔اس میں علامہ کی الگ الگ نظموں پر تجزیہ کر کے ان کے شعری امتیازات کو واضح کیا گیا ہے۔مولانا طلحہ نعمت ندوی کا ایک عربی مضمون بعنوان ''علامہ گیلانی اپنی نعتوں کی روشنی میں'' سہ ماہی 'النصیحہ' مظفر پور (جولائی 2017) میں شائع ہوا۔اس مضمون میں علامہ کی عشقِ رسول میں ڈوبی نعتوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور بطورِ خاص اس نعت پر عربی زبان کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے جس کا آغاز تو اردو زبان سے ہوتا ہے اور اختتام عربی کے کئی مصرعوں پر ہوتا ہے۔عربی زبان وادب سے علامہ گیلانی کو کس قدر شغف تھا؟ یہ تحریر اس کی شہادت دیتی ہے۔

مبصرین:

علامہ سید گیلانی کے مضامین ومقالات یوں تو درجنوں رسائل وجرائد میں شائع ہوئے لیکن 'معارف'، 'برہان'، 'الفرقان' اور 'صدق' سے ان کا گہرا قلمی ربط تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان چاروں میں شائع شدہ مضامین بعد میں کئی کتابوں کی شکل میں منظرِ عام پر آئے۔ان کے مدیران: علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا منظور نعمانی اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی سے علامہ گیلانی کے گہرے مراسم تھے۔اوران کی بیشتر کتابوں پر ان ہی حضرات کے تبصرے بھی شائع ہوئے۔ذیل میں ایک اشاریہ دیا جا رہا ہے نہ کہ مکمل فہرست۔

مولانا عبد الماجد دریا آبادی: سوانح قاسمی، تدوینِ حدیث، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت۔مولانا سعید احمد اکبرآبادی: تدوینِ حدیث، مقالاتِ احسانی، النبی الخاتم، اسلام اور قربانی، محرم کی تجلیاں۔شاہ معین الدین ندوی: ہزار سال پہلے۔مولانا ماہر القادری: امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی۔سید سلیمان ندوی: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت۔مولانا فیصل ندوی: مجموعہ خطوط گیلانی۔راشد شیخ: بیاضِ مناظر۔الیاس برنی: ہندوستان میں مسلمانوں کا

نظامِ تعلیم وتربیت۔

مدونین:

تحقیق وتنقید اور تبصرے کے بعد اب ایک سرسری ذکر ان حضرات کا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو علامہ گیلانی کے علوم کے مدون وشارح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں یہ اسما خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید (النبی الخاتم، الدین القیم) ڈاکٹر غلام محمد (تذکیر بسورۃ الکہف، تدوینِ حدیث، مقالاتِ احسانی) مولانا منت اللہ رحمانی (مکاتیبِ رحمانی) مفتی ظفیر الدین مفتاحی (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت) ڈاکٹر رشید احمد جالندھری (تدوینِ فقہ) مولانا اعجاز احمد اعظمی (احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن)

شارحین:

ڈاکٹر غلام محمد (مقالاتِ احسانی) غلام ربانی (تدوین قرآن) مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی ومفتی نسیم احمد فریدی (افاداتِ گیلانی) مفتی نیر اسلام قاسمی (افاداتِ گیلانی) اسی طرح علامہ گیلانی کے تنہا مبیضہ نویس مخدوم محی الدین کا ذکر بھی ضروری ہے۔

ان ناموں کے علاوہ بھی بہت سے ایسے اہلِ علم وادب ہیں جنھوں نے علامہ گیلانی کی شخصیت وفن پر مشتمل اپنے تأثرات قلم بند کیے ہیں ان میں یہ نام اہمیت کے حامل ہیں:

مولانا ماہر القادری، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ازہر شاہ قیصر، مولانا انظر شاہ کشمیری، مفتی محمد شفیع دیوبندی، قاری محمد طیب قاسمی، خواجہ عبدالغنی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور شاہ معین الدین ندوی وغیرہ۔ ان کے علاوہ ذیل میں وہ کتابیں درج کی جارہی ہیں جن میں تذکرے کے طور پر باضابطہ علامہ گیلانی کا ذکر ہے۔

تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد دوم، سید محبوب رضوی (ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند 1993)

بیسویں صدی کے اردو مصنفین، ڈاکٹر سنجیدہ خاتون (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2008)

مشاہیر دارالعلوم دیوبند، مفتی ظفیر الدین مفتاحی (کتب خانہ نعیمیہ دیوبند 2003)

مشاہیر اکابرین ومعاصرین، مفتی ظفیر الدین مفتاحی (زیرِ طبع)
تذکرۂ مشائخِ دیوبند، مفتی عزیز الرحمٰن، ادارۂ مدنی دار التالیف بجنور 1967)
تذکرہ مسلم شعرائے بہار، حکیم مولانا سید احمد اللہ ندوی (پیر الٰہی بخش کالونی کراچی)
تذکرۂ مشاہیر ادب مشرقی مگدھ (1960_1740)، ابوالکلام رحمانی 2014)
تذکرۂ علمائے بہار جلدِ اول، مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، جامعہ اسلامیہ قاسمیہ بالا ساتھ، سیتامڑھی
اکابر علمائے دیوبند، اکبر شاہ بخاری (ادارہ اسلامیات، لاہور 1999)
سو بڑے علما، اکبر شاہ بخاری (دار الاشاعت دیوبند 2004)
شیخ الہند: حیات اور کارنامے، مولانا اسیر ادروی (شیخ الہند اکیڈمی، دار العلوم دیوبند 1998)
کاروانِ رفتہ، مولانا اسیر ادروی (دار المؤلفین، دیوبند 1994)
دار العلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، حقانی القاسمی (آل انڈیا تنظیم علمائے حق، نئی دہلی 2006)
مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں، مولانا عمران خان ندوی (ادارۂ احیائے علم ودعوت، لکھنؤ 2013)
انار کے درخت تلے، مولانا محمد منصور احمد (مکتبہ الشہداء، کراچی 2009)
بہار کی بہار جلد دوم، اعجاز علی ارشد، (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2016)

یہ مقالہ ہرگز حرفِ آخر نہیں ہے تاہم اس مقالے کے پس پردہ میرا جذبہ یہ ہے کہ علامہ سید مناظر احسن گیلانی کے احوال وآثارِ علمیہ پر کام کرنے والے نئے اسکالروں کو ایک جہت مل جائے اور وقت کے ضیاع کے بغیر مطلوبہ مواد تک ان کی رسائی آسان ہو جائے۔ امید کہ اس راہ میں راقم کی یہ حقیر کوشش مفید ثابت ہوگی۔

فاروق اعظم قاسمی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں پی ایچ ڈی اسکالر ہیں۔

نشاط احمد

قطب شاہی عہد کا تاریخی ،تہذیبی وادبی پس منظر

قطب شاہی سلطنت کی سیاسی و ثقافتی علمی وادبی اور تہذیبی ولسانی تاریخ کی جڑیں سرزمین گولکنڈہ سے جڑی ہوئی ہیں۔ گولکنڈہ تلنگانہ کا ایک قدیم ترین قلعہ ہے جسے عہد ماضی میں قلعہ مانگل کہا جاتا تھا۔[1] عصر عتیق میں گولکنڈے پر مختلف ہندو راجاؤں نے حکومت کی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ چالوکیہ خاندان کا ایک صوبہ تھا۔ اس سلطنت کے سقوط کے بعد یہ ورنگل کی کاکتیہ ریاست میں شامل ہوگیا۔ بہمنی خاندان کے عروج واستحکام کے عہد میں حدود سلطنت وسیع ہوتے ہوئے ورنگل تک پھیل گئے تھے۔ سلطان محمد شاہ اول بہمنی کے دور (760ھ تا770ھ) مطابق 1358ء تا1375ء) میں ورنگل کے کاکتیہ راجہ نے اپنے پرکھوں کا تعمیر کردہ گولکنڈہ قلعہ بہمنی سلطنت کے حوالے کردیا۔[2] اس دور میں اسے سلطنت بہمنی کے ایک اہم قلعہ کی حیثیت حاصل تھی۔ 901ھ/1496ء میں سلطان محمود ثانی بہمنی نے اپنے ایک سردار سلطان قلی کو علاقہ تلنگانہ کا صوبیدار بنایا تو ورنگل کے ساتھ گولکنڈہ بھی اس کی جاگیر میں آگیا۔ سلطان قلی ایک ترکی الاصل ہمدانی شہزادہ تھا۔[3] جونا مساعد حالات میں ہجرت وطن کرکے اپنے چچا اللہ قلی کے ہمراہ عازم ہند ہوا۔ دونوں چچا بھتیجے محمود شاہ ثانی بہمنی کے دور میں بیدر پہنچے، محمود شاہ نے نو وارد شاہزادہ کو اپنے ملازمین میں شامل کیا۔ اس کے بعد سلطان قلی اپنی طبعی لیاقت اور صلاحیت کے بل بوتے پر ترقی اور کامرانی کے مدارج طے کرنے لگا۔ یہاں تک کہ 899ھ/1493ء میں بادشاہ نے اسے قطب الملک کے خطاب سے نوازا، 901ھ/1496ء میں تلنگانہ کی صوبیداری سے سرفراز کیا۔

محمود شاہ ثانی کی عیش پرستی اور نااہلی سے فائدہ اٹھا کر 895ھ/1490ء میں بیجاپور، احمد

نگر اور برار کے صوبیداروں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔[4] 924ھ/1518ء میں سلطان محمود شاہی ثانی بہمنی کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد سلطان قلی نے بھی اپنے معاصر صوبیداروں کی طرح گولکنڈہ میں اپنی خودمختاری کا نقارہ بجایا اور قطب شاہی سلطنت کی بنا ڈالی۔ اس خاندان کے آٹھ جانشینوں نے 1098ھ/1687ء تک یعنی تقریباً ایک سو سال اسی مملکت گولکنڈہ پر فرماں روائی کی۔

سلطان قلی (924ھ تا 950ھ مطابق 1518ء تا 1543ء) نے گولکنڈہ سے موسوم کر کے پایہ تخت قرار دیا اور اسے آباد اور مستحکم کرنے کی سعی کی۔ اس نے قلعہ کے اطراف ایک پختہ و مضبوط فصیل تعمیر کر کے شہر گولکنڈہ کی بنیاد رکھی۔ حصار شہر کے اندر ضروری عمارات، شاہی محلات، جامع مسجد، حمام خانے اور مسافر خانے وغیرہ تعمیر کروائے۔ ان تعمیرات سے گولکنڈہ کی رونق اس قدر بڑھ گئی کہ تاریخ قطب شاہی کے مولف کے بقول چند ہی دنوں میں یہ شہر رشک ہر دیار و غیرت افزائے سایہ بلاد و امصار ہو گیا۔[5] سلطان قلی نے چوبیس سال تک تلنگانہ کے صوبیداری کی حیثیت سے اور پھر تقریباً چھبیس برس تک ایک مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے گولکنڈہ پر حکومت کی۔ اس کی حکمرانی کا یہ طویل عہد حکومت گولکنڈہ کی حفاظت اور سلطنت کی توسیع، ترقی و استحکام میں صرف ہوا۔

سلطان قلی میں علمی و انتظامی دونوں صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ صاحب سیف و فرماں روا تھا۔[6] علم ریاضی اور خوشنویسی میں ید طولی رکھتا تھا۔[7] عوام کی خیرخواہی اور رعایا پروری کی بنا پر وہ تلنگانہ میں نہایت مقبول اور ہر دلعزیز تھا۔ لوگ اسے ''بڑے ملک'' کے نام سے پکارتے تھے۔[8] ایک نئی سلطنت کے قیام و استحکام اور نظم و انصرام کی مہمات نے اسے علمی و تمدنی میدانوں میں کچھ کر دکھانے کا موقع نہیں دیا لیکن قرین قیاس ہے کہ اس کے دور میں پایہ تخت گولکنڈہ اہل علم، ارباب قلم اور اصحاب رقم سے عاری نہیں رہا ہوگا لیکن اس کے دور کے شعرا و ادبا کے نام اور ان کے تصنیفی کارنامے گوشۂ ذہول اور پردۂ خفا کی نذر ہو گئے ہیں۔ سلطان نے ''آتش خانہ'' کے نام سے ایک محل تعمیر کروایا تھا۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اس محل میں علمی مذاکرے ہوا کرتے تھے اور یہاں علما و فضلا جمع رہتے تھے۔[9]

سلطان قلی کا تیسرا بیٹا جمشید قطب شاہ (950ھ تا 957ھ مطابق 1543ء تا 1550ء)

میں باپ کو تہہ تیغ کر کے تخت گولکنڈہ پر قابض ہوا۔اس نے سات سال حکمرانی کی لیکن رعایا اس سے ناخوش تھی وہ اپنی مملکت میں کبھی ہر دلعزیز نہ ہو سکا۔اس کا ابتدائی زمانہ سلطنت کے داخلی نظم وانضباط کی برقراری اور بیرونی دشمنوں سے جنگوں میں گزرا۔ باپ اور بھائیوں کے ساتھ اس کے جارحانہ رویے سے قطع نظر اس میں بعض اچھے اوصاف بھی تھے۔وہ صاحب علم اور صاحب کمال تھا اور شعر وسخن سے دلچسپی رکھتا تھا۔شاعروں اور ادیبوں کی قدر کرتا تھا اور خود بھی شاعر تھا۔اس نے بعض موقعوں پر فارسی میں فی البدیہ اشعار کہے ہیں۔اختر حسن مولف ''قطب شاہی دور کا فارسی ادب'' نے مختلف تواریخ سے جمشید کا فارسی کلام اکٹھا کیا ہے۔[10] جمشید کے دور کے بعض فارسی گو شعرا وادبا کا پتہ چلتا ہے جن میں ملک الشعرا محمد شریف وقوعی اور قاسم طبی کے اسم قابل ذکر ہیں۔ جمشید کی قبر پر جو گنبد تیار کیا گیا ہے وہ فن تعمیر کا ایک نمونہ ہے۔

جمشید کے انتقال کے بعد اس کی ملکہ بلقیس زماں نے اپنے بیٹے سبحان قلی (957ھ/ 1550ء) کو بیرونی عمائدین سلطنت کے تعاون سے تخت حکومت پر متمکن کیا۔[11] اس نے چھ ماہ حکومت کی لیکن اس کی کمسنی خوردسالی اور بعض دیگر عوارض کی بنا پر سلطنت کے اعیان واساطین کا بڑا طبقہ اس سے منحرف ہو گیا۔ان کی دعوت وترغیب پر سلطان قلی کے سب سے چھوٹے بیٹے ابراہیم قلی نے جو وجیانگر میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا گولکنڈہ کا رخ کیا۔(957ھ تا 988ھ مطابق 1550ء تا 1580ء) میں قطب شاہی تخت وتاج کا مالک بنا۔اس نے اکتیس سال تک نہایت کامیابی وکامرانی کے ساتھ حکومت کی۔ بقول ہارون خان شیروانی ''تلنگ آندھرا'' کا پہلا حکمران ہے جو بادشاہ کہلایا۔[12] اس کا عہد سلطنت گولکنڈہ کی حقیقی ترقی اور شان وشوکت کا سنہرا دور ہے۔ابراہیم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دکن کا سیاسی توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ جنگ تالی کوٹہ دکن کی ایک فیصلہ کن لڑائی ثابت ہوئی۔اس کے عہد میں گولکنڈے کی سلطنت کو وسعت اور پائندگی حاصل ہوئی۔اور سلطنت میں امن وامان اور خوشحالی وآسودگی کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔وجیانگر کے زمانۂ قیام میں اسے دکھنی کلچر وروایات سے گہری وابستگی پیدا ہو گئی تھی۔اپنے دور اقتدار میں اس نے مملکت گولکنڈہ میں مقامی روایات سے دکن میں مخصوص تہذیب پیدا کرنے کی پوری سعی کی۔ سچ تو یہ ہے کہ جس تہذیب وتمدن اور ثقافت کو قطب شاہی

سے موسوم کرتے ہیں اس کا آغاز ابراہیم کے زمانے سے ہوتا ہے۔ ابراہیم نے سلطنت کے مختلف طبقات کے مابین اتحاد و یکجہتی کو پروان چڑھانے کی تدابیر اختیار کیں اس میں رواداری، اخوت و بھائی چارگی اور وسیع النظری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ تلگو زبان و ادب میں مہارت رکھتا تھا اس نے عربی، فارسی اور دکھنی کے ساتھ تلگو کی بھی سرپرستی کی۔ تلگو شعرا اسے ''ملک بھرام'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ابراہیم علم دوست حکمران تھا اور اس نے شہر میں کئی مدارس قائم کیے تھے۔ ''تاریخ قطب شاہی'' کے مورخ نے ابراہیم کی علمیت اور اس کی علم دوستی کو بہت سراہا ہے۔ [13]

ابراہیم کے دور میں جو تعمیرات ہوئیں ان میں قلعہ کی فصیل کے علاوہ پرانا قلعہ، بالا حصار، گلشن باغ، ابراہیم باغ، کٹورہ حوض، تالاب ابراہیم پٹن اور حسین ساگر کے علاوہ متعدد مساجد شامل ہیں۔ [14] اس نے کئی مدرسے قائم کیے اور لنگر خانوں کے تعاون میں اضافہ کیا۔ [15] ابراہیم قطب شاہ کے عہد حکومت میں صنعت و حرفت کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا اور تمدنی ترقی کی راہیں کھل گئیں۔ ابراہیم اگرچہ خود شاعر نہ تھا لیکن شاعروں اور عالموں کی بے حد عزت و توقیر کرتا تھا۔ اسی کے دور میں سرزمین گولکنڈہ پر دکنی شعر و ادب کا پہلا چراغ روشن ہوا تھا۔ گولکنڈہ کے اولین دکنی شعرا ملا خیالی، فیروز اور محمود ہیں جن کی شاعرانہ عظمت اور استادانہ مقام و مرتبہ کا اعتراف بعد کے دور کے بہت سے شعرا نے کیا ہے، ابراہیم کے عہد سے تعلق رکھتے تھے۔

ابراہیم قطب شاہ کے بعد اس کا تیسرا بیٹا [16] محمد قلی قطب شاہ (988ھ تا 1020ھ مطابق 1580ء تا 1612ء) میں تخت نشین ہوا۔ یہ قطب شاہی خاندان کا سب سے عظیم المرتبت حکمران تھا۔ اسے جہاں بانی اور کشور آرائی کے لیے ایک وسیع، خوشحال پر امن اور مستحکم سلطنت ترکہ میں ملی تھی۔ محمد قلی طبعاً نرم دل، صلح جو اور امن پسند واقع ہوا تھا۔ بعض معمولی جنگوں سے قطع نظر اس کا دور حکومت نہایت پر امن رہا جس کی وجہ سے سلطنت کی خوشحالی اور فارغ البالی میں بے حد اضافہ ہوا۔ مال و دولت کی کثرت، علم و فن کی قدردانی اور امن و امان کا بول بالا، ان سب نے عوامل نے مل کر مملکت میں علمی و ادبی اور تہذیبی تمدنی ترقیوں کے لیے ایک سازگار ماحول کی تشکیل کی۔ چنانچہ عہد قلی میں شعر و ادب، مصوری و نقاشی، رقص و موسیقی، تعمیرات اور تہذیب و ثقافت کے دوسرے شعبوں میں ایسے کارہائے نمایاں سر انجام پائے جو نہ صرف ہندوستان کی تاریخ بلکہ خود

فنون لطیفہ کی تاریخ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔محمد قلی نے قطب شاہی سلطنت کے حدود اتنے وسیع کر دیے تھے کہ وہ ایک چھوٹی شہنشاہیت معلوم ہوتی تھی۔ 17ؔ

عہد محمد قلی قطب شاہ کا ایک اہم تاریخی واقعہ یہ ہے کہ 1611ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلی بار مسولی پٹنم میں اپنی ایجنسی قائم کی تھی اور اس کے دور کا سب سے بڑا اور یادگار کارنامہ قطب شاہیہ کے نئے دارالسلطنت شہر حیدر آباد فرخندہ بنیاد کی تاسیس وتعمیر اور تہذیب وتزئین قطب شاہی خانوادے کے پانچویں فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ سیاست مدنی اور ذوق تعمیر کی رہین ہے۔جس نے 1590ء میں اس کی بنیاد رکھی محمد قلی کے زمانے میں گولکنڈہ میں مزید آبادی کی گنجائش نہ رہی تھی اور یہ شہر اس عہد کے سیاسی،تہذیبی،مدنی اور بلدی ضروریات کی تکمیل سے عاجز تھا۔چنانچہ اس نے اپنی تخت نشینی کے تقریباً بارہ سال بعد 999ء میں 18ؔ میں رود موسیٰ کے کنارے ایک وسیع اور عالیشان شہر کی بنیاد ڈالی،خودرو شہر کی طرح بے ترتیب اور بے ڈھنگ انداز میں اگنے اور پھیلنے نہیں دیا بلکہ ماہرم ہندسوں کے مشورہ سے شہر کا مکمل منصوبہ اور جامع خاکہ بنوایا۔محمد قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا اس کے دورِ حکومت کے فن تعمیر کے نایاب نمونے اس کے اعلیٰ اور شائستہ ذوق کے ترجمان ہیں۔اسے خوشنویسی کا بھی بڑا شوق تھا۔اس نے سب سے پہلے شہر کے وسط میں چار مینار کا سنگ بنیاد رکھا۔ 19ؔ جس کے چاروں طرف کشادہ شاہراہیں نکالیں۔چار مینار کے شمال میں جلوخانہ بنایا گیا۔جس میں چاروں سمتوں میں چار بلند وبالا کمانیں اور درمیان میں حوض تعمیر کیا گیا۔جلوخانے کے جانب مغرب دولت خانہ عالی کے پر جمال و پر جلال قصر ومحلات کا سلسلہ تھا جن میں چندن محل،گگن محل،سجن محل،آٹھ منزلہ خدا داد محل(تاریخ ظفرہ میں اس کے ساتھ طبقات کے نام اس طرح آئے ہیں۔الٰہی محل،محمدی محل،حیدر محل،حسینی محل،جعفری محل اور موسوی 20ؔ زیریں محل کا نام نہیں دیا گیا ہے)چار منزلہ داد محل،حنا محل،اعلیٰ محل،ندی محل،محل کوہ طور اور قطب مندر کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔شہر میں خوشنما نہریں جاری کی گئیں اور جابجا چمن آرائی کی گئی محلات وباغات مسجدیں،عاشور خانے،مدرسے،حمام،لنگر خانے،مہمان خانے،خیرات خانے،خانقاہیں،کاروان سرائیں اور شفا خانے بنوائے گئے۔کوچہ وبازار اور مکانوں دکانوں کے دروبست سے نظم وترتیب،سلیقہ مندی اور خوش مذاقی جھلکتی تھی۔شہر کی زیب

وزینت اور تزئین و آرائش میں بادشاہ کے ساتھ امرا نے بھی اپنا رول ادا کیا ہے۔ اور ہر جگہ پرشکوہ کاخ وایوان بنوائے اور خیاباں بندی کی۔ اس طرح کچھ ہی عرصے میں حیدرآباد قرون وسطی کا ایک خوبصورت اور تمام بلدی سہولتوں سے آراستہ شہر بن گیا۔ اس کی رونق چہل پہل آبادی اور خوشحالی کو دیکھ کر میر مومن نے ''نیا اصفہاں'' کہا تھا [21]۔ محمد قلی کے اجداد تورانی الاصل تھے لیکن خود وہ دکنی نہاد تھا۔ اسے سرزمین دکن اور اہل دکن سے عشق تھا۔ مذہبی رواداری اور عدم تعصب محض اس کی سیاسی پالیسی کا ایک جز نہیں بلکہ اس کا منبع و مشرب تھا۔ عمرانیاتی نقطۂ نظر سے بھی محمد قلی کا زمانہ تاریخی اور عہد آفریں اوصاف واثرات سے متصف ہے اس نے دکن میں ایک مشترکہ قومی تہذیب کا ڈول ڈالا جس کی ترکیب وتشکیل ایرانی اور دکنی تہذیبوں، فارسی اور دکنی زبانوں اور عجمی مقامی روایات کے متوازن اختلاط اور حسین امتزاج سے ہوئی۔ اس نے پوری دلجمعی کے ساتھ اس گنگا جمنی تہذیب کی آبیاری کی اور اسے پروان چڑھایا اس نے مختلف مذہبی فرقوں اور موسمی تہواروں کو رائج کیا اور انہیں خاص سلیقے اور اہتمام کے ساتھ بنانے کی بنیاد ڈالی۔ مقامی ثقافت اور دیسی طرز معاشرت میں وہ اس حد تک رنگ گیا تھا کہ نہ صرف اسلاف کی وضع قطع اور ایرانی ملبوسات سے دست کش ہو گیا بلکہ ریش بھی ترشوائی اور تلنگانہ کی خاص پوشاک اختیار کی۔ [22]

محمد قلی علما شعرا اور اہل کمال کا نہایت قدرداں تھا۔ اس کے دربار سے فارسی۔ دکنی اور تلگو زبانوں کے متعدد شعرا منسلک ومتوصل تھے۔ خود وہ بھی ان تینوں زبانوں میں داد سخن دیا کرتا تھا۔ لیکن اس کا تلگو کلام ہنوز معدوم اور غیر محقق ہے۔ اس کی بذل وعطا اور داد ودہش کا شہرہ سن کر ایران سے کئی ارباب ہنر وفضل حیدرآباد آئے تھے جن میں میر محمد مومن استرآبادی (پیشوائے سلطنت) اور مرزا محمد امین شہرستانی (میر جملہ) قابل ذکر ہیں۔ جو فارس سے آئے اور قطب شاہیہ میں اعلی مقام ومراتب حاصل کیے۔ عہد قلی کے فارسی گو شعرا میں فرسی، قوی، کامی شیرازی، شریف کاشانی، معین سبزاوری اور محسن ہمدانی اہم ہیں۔ جہاں تک دکنی کا تعلق ہے محمد قلی خود اس زبان کا ایک خوش فکر خوش بیاں پر گو اور قادر الکلام شاعر تھا۔ دکنی میں اس کا ایک ضخیم کلیات یادگار ہے جو اسے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کا اعزاز عطا کرتا ہے۔ محمد قلی نے مقامی ماحول اور دیسی عناصر سے اپنی شاعری کا آب ورنگ تیار کیا۔ اس کی شاعری میں دکن کی مٹی کی خوشبو رچی بسی

ہوئی ہے۔اس کے دور میں دکنی شعر وادب کو نہایت فروغ حاصل ہوا۔احمد گجراتی (مصنف لیلی مجنوں1600ء اور یوسف زلیخا)اس کا درباری شاعر تھا اور ملا وجہی (مصنف قطب مشتری، 1609ء)اس کا ملک الشعرا تھا۔

محمد قلی نے تیس سال چھ مہینے حکومت کرنے کے بعد 1020ھ میں اس دارِفانی سے کوچ کیا۔اس کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد محمد قطب شاہ تخت گولکنڈہ پر جلوہ افروز ہوا۔یہ محمد قلی قطب شاہ کے بھائی محمد امین کا بیٹا تھا۔اس سے محمد قلی کی دختر حیات بخشی بیگم بیاہی گئی تھی۔محمد قلی قطب شاہ نے اس کے لیے ایک ایسی وسیع وعریض سلطنت چھوڑی تھی جس میں ہر طرف خوشحالی و فارغ البالی تھی۔عبدالمجید صدیقی 'تاریخ گولکنڈہ' میں لکھتے ہیں کہ ''سچ تو یہ ہے کہ ایسا خوشگوار زمانہ اس سے پہلے گزرا تھا نہ اس کے بعد کیوں کہ اس عہد کے سوا ہر زمانے میں سلطنت کچھ نہ کچھ جنگ وجدل کے لپیٹ میں آئی''[23] محمد قطب شاہ (1020ھ تا1035ھ مطابق1612ء تا1626ء) کا عہد حکومت بھی نہایت امن وامان اور راحت وآرام میں گزرا جس کی وجہ سے عوام کی فلاح و بہبود اور علم وفن،تہذیب وتمدن کے میدانوں میں زبردست کارنامے انجام دیے گئے۔محمد قطب شاہ کے عہد میں ڈچ تاجروں نے مسولی پٹنم پر1615ء میں اپنے قدم جمائے اور 1623ء میں انگریزوں نے اپنا اثر ورسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔قطب شاہی خانوادے میں محمد قطب شاہ سب سے بڑھ کر ذی علم متقی اور خدا ترس حکمران تھا۔سیرت و کردار اور روشن زندگی کے لحاظ سے وہ اپنے پیشرو محمد قلی قطب شاہ سے بالکل جداگانہ تھا۔سلطان محمد قطب شاہ نے خداداد محل کے نذر آتش ہونے کے بعد " ''امان محل'' نام سے ایک عالی الشان محل تعمیر کروایا جو چار منزلہ خوبصورت عمارت تھی اور فن تعمیر کے اعتبار سے انتہائی وقیع اور دیدہ زیب تھی۔[24] اس کے ساتھ قطب شاہی روایت کے مطابق ایک پرفضا باغ بھی لگایا تھا جو " نبی باغ" سے موسوم کیا گیا تھا۔سلطان محمد قطب شاہ کا چودہ سالہ دور قطب شاہی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔فنون لطیفہ سے زیادہ اسے مذہبی علوم فلسفہ وتاریخ سے اور شاعری سے زیادہ علم وحکمت سے لگاؤ تھا۔اسے مطالعہ کتب کا بے حد شوق تھا۔اس کے کتب خانے میں مختلف علوم وفنون جیسے مذاہب،تاریخ اور فلسفہ کی نہایت اعلی اور بیش قیمت کتب مخزونہ تھیں۔وہ جس کتاب کا مطالعہ کرتا آخر میں اس کے مصنف یا مولف کے

حالات دیگر کتب سے تحقیق کر کے قلم بند کرتا۔ 25ے اور اس پر اپنی رائے قائم کر کے اپنے دستخط کرتا تھا۔اس نے کلیات محمد قلی مرتب کروا کے اسے اپنے منظوم مقدمہ سے آراستہ کیا۔ وہ فارسی زبانوں میں شعر کہتا تھا۔اس کا اردو دیوان ہنوز پردۂ خفا میں ہے۔البتہ فارسی کلام کا ایک نایاب نسخہ ''دیوان ظل اللہ'' کے نام سے کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔اس نے جلوس کے پانچویں سال 1025ھ میں اپنے خاندان کی ایک مفصل تاریخ لکھوائی تھی۔ جو''تاریخ سلطان محمد قطب شاہی'' کے نام سے مشہور ہے۔اپنی علمیت اور مذہبیت کی بنیاد پر وہ دکنی کے مقابلے میں عربی و فارسی زبانوں اور شاعری کے مقابلے میں نثر نگاری سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔اس کے دور میں مذہبی علما اور فارسی انشا پردازوں کی زیادہ آؤ بھگت ہوئی۔اس کے عہد میں ایران کے بلند پایہ علما وسخنور حیدرآباد میں اکٹھا ہو گئے تھے۔جن میں علامہ ابن خاتون ،مولانا حسین آملی، شیخ جعفر علی عشرتی یزدی، علی گل استرآبادی، میر مومن، ادائی فروی، حسین الحسینی الطبسی اور صالی اردستانی وغیرہ مشہور ہیں۔26ے فارسی کے برعکس دکنی کے نامور شعرا گوشۂ خمول میں چلے گئے جن میں وجہی اور غواصی جیسے سخنور بھی شامل تھے۔غواصی نے''سیف الملوک و بدیع الجمال'' اسی بادشاہ کے زمانے میں مکمل کی تھی۔حسن شوقی بھی اسی عہد میں بیجاپور سے حیدرآباد آیا تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ کی وفات 1035ھ=1626ء کے بعد عنان حکومت اس کے بیٹے عبداللہ قطب شاہ (1035ھ تا 1083ھ مطابق 1626ء تا 1672ء) کے ہاتھ میں آئی۔اس نے اڑتالیس (48) برس حکومت کی۔اس کے دور میں گولکنڈے کی عظمت و رفعت کا آفتاب جو محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کے عہد میں نصف النہار پر تھا آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوتا گیا۔ مغلوں کا دباؤ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ بادشاہ عیش پرست اور رند شاہد باز واقع ہوا تھا۔زعمائے مملکت میں کوئی ایسا نہ تھا جو سیاسی اور عسکری سطح پر مغلوں کے اٹھتے ہوئے طوفان پر روک لگاتا۔ 1046ھ 1636ء میں عبداللہ قطب شاہ کو یک طرفہ شرائط پر شاہجہاں سے صلح کا معاہدہ کرنا پڑا۔ اس صلح نامے کے بعد عبداللہ قطب شاہ نے ختم بالخیر والسعاۃ کی مہر بنوالی جو ایک طرح سے سلطنت کے خاتمے کا اعلان تھا۔ 28ے

عبدالمجید صدیقی ''تاریخ گولکنڈہ'' میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ قطب شاہ میں سیاسی تدبر

اور بیدار مغزی نہیں تھی اور اس نے سیاسی امور میں سنجیدگی سے کبھی غور نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر مغل سلطنت گولکنڈے میں قدم جمانے لگی۔[29] 1656ء کے مغل حملے نے قطب شاہی سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں اور قطب شاہی بادشاہ کو زر و جواہر کے علاوہ رقم کی صورت میں بھی مغل بادشاہ کو نذرانہ دینا پڑا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے عملی طور پر حکومت کے انتظامات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور آخری زمانے میں مذہب کی طرف بہت زیادہ راغب ہو گیا تھا۔[30] یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک طرف گولکنڈہ کے مطلع سیاست پر زوال و ادبار کے بادل چھا رہے تھے لیکن دوسری طرف تہذیبی افق پر شعر و ادب اور علم و حکمت کی روشنی ماہ نیم کی طرح سارے ماحول کو تابان و درخشاں کر رہی تھی۔

عبداللہ قطب شاہ کا عہد سیاسی اعتبار سے قطب شاہی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کا زمانہ تھا۔ لیکن ثقافتی نقطۂ نظر سے عہد عبداللہ قطب شاہ علوم و فنون کے احیا کا دور ہے۔ عبداللہ قطب شاہ مزاج و کردار کے اعتبار سے محمد قلی کا پرتو تھا۔ اس نے محمد قلی کی قائم کردہ ادبی و گنگا جمنی تہذیبی روایات کا نشاۃ ثانیہ کیا۔ وہ خود شاعر تھا اور تہذیبی امور سے اسے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس لیے اس کے عہد حکومت میں وہ شاعر اور فنکار جو محمد قطب شاہ کی مذہب پسندی کی وجہ سے گوشہ نشیں ہو گئے تھے اس کے دور میں نئی شان سے منظر عام پر آئے۔ اور حیدر آباد ایک بار پھر شعر و سخن کے پرچوں سے گونجنے لگا۔ عبداللہ قطب شاہ نے محمد قلی کے ملک الشعرا ملا وجہی کو جو خانہ نشین ہو گیا تھا شرف قبولیت بخشا اور اس سے فرمائش کر کے ''سب رس'' جیسی شہرۂ آفاق تصنیف کروائی۔ اسی طرح دبستان گولکنڈے کے عظیم المرتبت سخنور ملا غواصی کو ملک الشعرا کا لقب عطا کیا۔ بقول پروفیسر سیدہ جعفر حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کا عہد ''شمشیر و سنان کا نہیں، طاؤس و رباب'' کا دور تھا۔[31] عبداللہ قطب شاہ کی فنون لطیفہ سے وابستگی کی وجہ سے پھر گولکنڈہ شعر و نغمہ کی جانفزا صداؤں سے گونج اٹھا تھا۔ وہ فنکاروں اور شعرا جو عہد محمد قطب شاہ میں ادبی سرگرمیوں کنارہ کش ہو گئے تھے، دوبارہ قطب شاہی دربار میں جمع ہونے لگے اور جوہر شناس بادشاہ عبداللہ قطب کے گرد اکٹھا ہو گئے۔

جہاں بینی و دور اندیشی میں عبداللہ قطب شاہ کی ناتجربہ کاری اور نااہلی کے باوجود اس

کے ذی علم اور علم دوست ہونے میں کلام نہیں۔اس کے دربار میں ہر فن کے باکمال لوگ اکٹھا تھے۔خود وہ دکنی اور فارسی کا نغز گو شاعر تھا۔اس کے دکنی دیوان کا ایک نامکمل نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں مخزونہ ہے۔ جسے سید محمد ایم۔اے نے مرتب و شائع کیا ہے۔ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ ’’ عبداللہ قطب شاہ نے ابراہیم عادل شاہ کی نورس کے جواب میں اس موضوع پر ایک طویل کتاب بھی اردو میں لکھی تھی جو نواب نصیرالدین خان ناظم دفتر دیوانی و مال حیدرآباد کے یہاں موجود ہے‘‘۔[32]
نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ عبداللہ قطب شاہ کو شعر و سخن سے ایسی دلچسپی تھی کہ رات بھر محفل مشاعرہ میں موجود رہتا اور شعرا کے کلام سے لطف اندوز ہوتا تھا۔سہ شنبہ عام تعطیل کا دن تھا۔اس روز عبداللہ قطب شاہ ادبی محفلوں میں شرکت کرتا اور ’’قدما کے کلام‘‘ پر نقد و تبصرہ کیا جاتا تھا۔[33]

عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں ادب، مذہبیات، تاریخ، ریاضی، نجوم۔اور دیگر علوم کی متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں۔علامہ ابن خاتون پیشوائے سلطنت نے شرح الارشاد والاذہان شرح جامع عباسی، شرح اربعین اور متعدد کتابیں لکھیں۔ملا حسین آملی نے شرح نہج البلاغہ ہدایت الابرار، کتاب الامعاف اور القبہ العمل تصنیف کی۔ملا حسین برہان الدین احمد شیرازی نے حدیقۃ السلاطین لکھی جو ’’تاریخ قطب شاہی‘‘ کا تکملہ ہے۔عبداللہ شاہ کے فاضل داماد سید نظام الدین احمد نے شجرۂ دانش کے نام سے ایک سو آٹھ (108) رسائل لکھے، ابن عماد روز بھاں اصفہانی نے بہاؤالدین آملی کی کشکول کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام ’’خرقئہ علما‘‘ رکھا جو سات جلدوں میں ہے۔

ثقافتی اعتبار سے دکنی زبان و ادب کی سرپرستی بھی قطب شاہی سلاطین کا بڑا اہم تہذیبی کارنامہ ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں فارسی کے ساتھ دکنی ادب کی بھی پشت پناہی کی گئی وجہی اور غواصی کے علاوہ احمد جنیدی (ماہ پیکر 1064ھ) اور ملک خوشنود (ہشت بہشت 1056ھ) اس کے درباری شعرا تھے۔اس دور کے دیگر شعرا میں ابن نشاطی (پھولبن 1066ھ) سید بلاقی (معراج نامہ 1056ھ)، شاہ راجو (سہاگن نامہ)، میراں جی خدا نما (شرح تمہیدات عین القضاۃ 1066ھ)، میراں جی یعقوب (شمائل الاتقیا 1078ھ)، عابد شاہ (گلزار السالکین)،

قطب زاری (تحفۃ النصائح 1045ھ)، عبداللطیف (وفات نامہ 1074ھ) طبعی (بہرام وگل اندام 1081ھ) کے نام قبل ذکر ہیں۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ اولادِ نرینہ سے محروم تھا اس لیے (1083ھ/1672ء) اس کے انتقال کے بعد اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن تانا شاہ حیدرآباد کے تاج شاہی کا وارث بنا۔ وہ ایک صوفی منش اور خدا ترس انسان تھا۔ اسے اس عہد کے مشہور صوفی سید شاہ راجو حسینی (1093ھ/ 1683ء) سے بیعت وارادت حاصل تھی۔ تانا شاہ گولکنڈہ کا آخری تاجدار تھا۔ اسے تخت وتاج ایسے وقت نصیب ہوا جب سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ مغلوں کے حملہ کے خوف کی وجہ سارا ماحول بے چینی ویاس کی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ تہذیبی روایتیں اور اقدار شکست وریخت سے دوچار تھیں۔ معاشرہ کے کرب اور ہیجان کی بدولت شاعروں اور فنکاروں کی تخلیقی قوتیں جامد اور فکر وفن کی صلاحیتیں مفقود ہوگئی تھیں چنانچہ خلفشار وانتشار کے اس دور میں دکن کے چمنستان سے پھر کوئی وجہی یا غواصی نہیں اٹھا۔

ابوالحسن تانا شاہ اردو اور فارسی میں شعر کہتا تھا لیکن سلطنت کی افراتفری کی وجہ سے اس کا دیوان محفوظ نہ رہا۔ اس کے دور میں دکنی تہذیب کی ساکھ نہایت تیزی سے روبہ زوال تھی۔ آشوب روزگار کی وجہ سے تخلیقی سرچشمے خشک ہوگئے تھے۔ اس لیے اس دور میں قدیم روایات اور موضوعات کی تکرار ہوتی رہی۔ خارجی خوف وہراس کی وجہ سے داخلی سکون واطمینان عنقا ہوگیا تھا۔ لوگ مذہب کی طرف راغب ہورہے تھے۔ لیکن کتاب وسنت کی روح بےخبری روایتی مذہب کی آڑ میں سکون وعافیت کے متلاشی تھے۔ اس لیے اس دور میں بکثرت مذہبی نظمیں لکھی گئیں جن کی اجمالی فہرست درج ذیل ہے۔

شاہ راجو (سہاگن نامہ)، محبّ (معجزۂ فاطمہ 1087ھ/ 1677ء)، مختار (مولود نامہ 1083ھ/1672ء، معراج نامہ 1094ھ/1682ء، فتاحی (مولودنامہ 1084ھ/1673ء)، ضعیفی (ہدایت الہندی)، خواص (قصۂ حسینی 1090ھ/ 1679ء)، سیوک (جنگ نامہ محمد حنیف 1092ھ/ 1681ء)، قدرتی (قصص الانبیا)، اولیا (قصہ ابوشحمہ 1090ھ/1679ء)، غلام علی خان لطیف (ظفرنامہ محمد حنیف 1095ھ/1684ء)، غلام علی (پدماوت 1091ھ)، دکنی ادب

کی تاریخ میں گولکنڈہ کے دورِ آخر کے سب سے اہم ادبی کارنامے تاناشاہ کے پیر بھائی طبعی کی مثنوی ''بہرام وگل اندام'' مصنفہ (1081ھ پیش کردہ 1083ھ) اور فائز کی مثنوی ''رضوان شاہ روح افزا'' (1094ھ/1682ء) ہیں۔

تاناشاہ نے داخلی وخارجی امور پر قابو پانے اور مملکت کے منتشر ڈھانچے کو سنبھالنے کی حتی الامکان سعی کی لیکن درباری سازشوں اور سلطنت کے زعما و ارباب بست وکشاد کی غداریوں کے سبب مغل فوجوں نے گولکنڈہ پر حملہ کر دیا اور طویل محاصرہ کے بعد 1098ھ میں بعض قطب شاہی سرداروں کی ریشہ دوانیوں وسازباز کی وجہ سے قلعہ کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ اورنگ زیب نے تاناشاہ کو معزول کر کے قلعہ دولت آباد میں قید کر دیا گیا۔ جہاں 1112ھ/ 1700ء میں وہ قیدِ حیات اور بندِ غم دونوں سے آزاد ہو گیا۔

آخری قطب شاہی تاجدار سلطان ابوالحسن تاناشاہ ایک شریف النفس، عالی المرتبت، صاحبِ علم حکمران تھا۔ اس کا پندرہ سالہ دورِ حکومت بدنظمی اور خلفشار میں بسر ہوا لیکن اس نے ایسے پرآشوب دور میں بھی علم وفن اور شعر وسخن کی بڑی خدمت کی۔ اس کی فرمائش پر علی بن طیفور بسطامی نے ''صدائق السلاطین فی الکلام الخواتین'' کے نام سے ایران وہندوستان کے لیے ایسا فارسی شعرا کا تذکرہ لکھا جو صاحبِ تاج وسریر تھے یا کسی مملکت کے وزیر تھے۔[34] اس دور کے دیگر فارسی شعرا اور ادبا میں اختر یزدی، آقا مہدی اصفہانی اور وحشی کاشانی اہم ہیں۔

ابوالحسن تاناشاہ کی شکست اور اسیری کی وجہ سے قطب شاہی تہذیب وتمدن کو بہت نقصان پہنچا۔ اس سلطنت میں روشن علم وحکمت کا چراغ گل ہو گیا۔ اور شعر وسخن کی شمعِ فروزاں بجھ گئی۔ خرابی وادباری نے ہر طرف ڈیرے ڈال لیے۔ اس پرآشوب انقلاب کے سبب بہت سے ایسے شاعر وادیب یہاں سے ہجرت کر گئے جو عزت وناموس کی خاطر یہاں مقیم تھے لیکن بہت سے ایسے سخنور بھی تھے جو وطن کے سایہ عاطفت سے جدا نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے اس خرابے ہی میں اپنی دنیا آباد کی اور زندگی بھر اس سرسبز وشاداب سلطنت کی تباہی وبربادی پر ماتم گسار اور نوحہ خواں رہے۔ تاہم حکمران اور اس کے عمال کے خوف سے وہ اپنے جذبات وخیالات کا کھل کر اظہار نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مرثیہ گوئی اور شہدائے کربلا کے ماتم میں اس سلطنت کا

ماتم بھی سمولیا۔ رعایا ابوالحسن کی محصوری اور معرکہ آرائی کو بلا تشبیہ جنگ کربلا سمجھتے تھے۔

سقوط قطب شاہی سلطنت کے بعد اس سلطنت کے اکثر شعرا جن میں بیشتر سنی المذاہب تھے مرثیہ نگاری میں مشغول رہے اور طویل نظمیں یا مثنویاں نہیں لکھ پائے کیونکہ اس کے لیے نہ تو اطمینان قلب اور فارغ البالی میسر تھی اور نہ شاہی سر پرستی اور درباری قدردانی متوقع تھی۔ اس دور کے اہم مرثیہ گوشعرا میں روحی، مرزا اور قادر اہم ہیں۔ ان شاعروں نے مراثی کو اپنے عہد کے سوز گداز اور سیاسی جذبات کی ترسیل کا وسیلہ بنایا اسی دور خلفشار میں چند شاعر اور ادیب ایسے بھی ملتے ہیں جنہوں نے رفتہ رفتہ اس روح پرور انقلاب کے تلخ اثرات سے گلوخلاصی کر لی اور خود کو اقتضائے وقت کے دھارے میں ڈھال لیا ان میں شیخ داؤد صفی اہم ہیں جس نے 1101ھ میں ایک ضخیم فقہی مثنوی ''ہدایات ہندی'' کے نام سے تصنیف کی اور اس میں اورنگ زیب کی مدح سرائی کی۔ یہ پہلی مدح ہے جو کسی درباری شاعر نے فاتح دکن کے لیے لکھی۔ قطب شاہی دور کے آخری شعرا میں بے چارہ، آزاد اور طالب قبل ذکر ہیں۔ یہ عالمگیر کے عہد میں حیدر آباد میں موجود تھے۔ ان میں سے بے چارہ اور آزاد نے سقوط سلطنت گولکنڈہ کے بعد دلی کا رخ کیا۔

خاندان قطب شاہی کے سبھی حکمران علم سے بہرور، رعایا پرور، دادگر اور عدل گستہ تھے۔ انہوں نے علوم وفنون کی حوصلہ افزائی اور اہل ہنر کی بڑی سر پرستی کی۔ انہوں نے کئی شہر بسائے اور متعدد قلعے، شہر پناہیں اور پرشکوہ محلات وعمارات تعمیر کروائے۔ ان کے عہد حکومت میں دکنی زبان، شعروادب، موسیقی، مصوری، خطاطی، فن تعمیر اور دکن کی گنگا جمنی تہذیب وشائستگی کو نہایت فروغ اور ارتقا نصیب ہوا۔ قطب شاہی عہد کے اہم شعرا اور ان کے تصانیف کی اجمالی فہرست درج ذیل ہے۔

فیروز (پرت نامہ) محمود (غزلیات)، ملا خیالی (غزلیات)، وجہی (قطب مشتری اور سب رس)، سلطان محمد قلی (کلیات)، سلطان عبداللہ (کلیات)، غواصی (مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، مینا ستونتی، کلیات)، احمد (یوسف زلیخا، لیلی مجنون)، قطب زاری (تحفۃ النصائح)، جنیدی (ماہ پیکر) بلاقی (معراج نامہ)، ابن نشاطی (پھولبن)، طبعی (بہرام وگل اندام)، شاہ راجو (معجزۂ فاطمہ)، اولیا (قصہ ابوشحمہ)، خواص (قصہ حسینی)، غلام علی (پدماوت)،

سیوک (جنگ نامہ محمد حنیف)، فائز (قصہ رضوان شاہ وروح افزا)، اور فتاحی (مولود نامہ)۔

سترھویں صدی کا اختتام دکن کے عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا بھی اختتام ثابت ہوا۔ 1685ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے سکندر عادل شاہ کو شکست دے کر بیجاپور پر اور 1686ء میں ابوالحسن تانا شاہ کو شکست دے کر گولکنڈہ پر قبضہ کر کے تسخیر دکن کی اپنی دیرینہ مراد پوری کی۔

حوالے وحوشی

1: عبدالمجید صدیقی، پروفیسر۔ تاریخ ادب گولکنڈہ، حیدرآباد۔ 1939ء۔ ص: 27

2: تاریخ دکن، حیدرآباد۔ ص: 47

3: تاریخ قطب شاہی (قلمی) مخطوطہ نمبر 331 مخزونہ کتب خانہ سالا جنگ۔ ص: 13

4: اختر حسن۔ قطب شاہی دور کا فارسی ادب، حیدرآباد۔ 1973ء۔ ص چ

5: تاریخ قطب شاہی۔ مخطوطہ نمبر 331۔ ص: 55

6: عبدالمجید صدیقی، تاریخ گولکنڈہ، ص: 29

7: ایضا۔ ص: 55

8: تاریخ گولکنڈہ۔ ص: 337

9: سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر۔ اردو شہ پارے۔ ص: 80

10: قطب شاہی دور کا فارسی ادب

11: اردو ادب کی تاریخ۔ ص: 99

12: ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی قطب شاہ (انگریزی)۔ ص: 8

13: تاریخ قطب شاہی۔ مخطوطہ نمبر 331۔ ص: 225

14: اردو ادب کی تاریخ۔ ص: 100

15: سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر۔ داستان حیدرآباد 1982ء۔ ص: 25

16: تاریخ گولکنڈہ۔ ص: 91

17:ایضاً۔ص:125

18:سید محی الدین قادری زور،ڈاکٹر۔فرخندہ بنیاد،حیدرآباد۔1952ء۔ص:11

19:سید محی الدین قادری زور،ڈاکٹر۔سلطان محمد قلی قطب شاہ۔1940ء۔ص:111

20:فرخندہ بنیاد،حیدرآباد۔ص:27

21:ایضاً۔ص:29

22:سید محی الدین قادری زور،ڈاکٹر۔معانی سخن،حیدرآباد۔ص:25

23:تاریخ گولکنڈہ۔ص:163

24:ایضاً۔ص:165

25:حکیم نظام الدین احمد گیلانی۔حدیقۃ السلاطین،ترجمہ خواجہ محمد سرور،حیدرآباد۔1986،ص:38

26؛داستان ادب حیدرآباد۔ص:36

27:ایضاً۔ص:38

28 جمیل جالبی،ڈاکٹر۔تاریخ ادب اردو۔جلد اول۔ص:466

29 تاریخ گولکنڈہ۔ص: 177

30:سید محمد۔مقدمہ کلیات عبداللہ قطب شاہ۔ص:14

31: پروفیسر سیدہ جعفر بہ اشتراک پروفیسر گیان چند جین۔تاریخ ادب اردو۔جلد اول۔ص:319

32:داستان ادب حیدرآباد۔ص:45

33:نصیر الدین ہاشمی۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کی شاعری (مضمون) مشمولہ دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین۔ص:106

34:منتخب اللباب۔جلد دوم۔ص:36،بحوالہ تاریخ گولکنڈہ۔ص:235

ڈاکٹر نشاط احمد،شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:243-256
Dr. Saeeda Patel, Surat ki Kahani, Shairon ki Zabani

سعیدہ پٹیل

سورت کی کہانی۔شاعروں کی زبانی

ہندوستان کا تمام مغربی علاقہ ساحل سمندر پر واقع ہے۔اوراسی ساحل کے درمیانی علاقہ پر چھوٹی بڑی بندرگاہیں موجود ہیں۔ زمانہ قدیم سے یہی بندرگاہیں ہندوستان کی بحری تجارت کا ایک بڑا مرکز رہی ہیں۔صوبہ گجرات عرب ممالک کے بالمقابل واقع ہے۔سورت، سنجان، جے مور، سوپارہ، تھانہ۔چیمبوراور کلیان گجرات کی قدیم اور اہم بندرگاہیں تھیں۔ان بندرگاہوں پر ایران، عراق، شام، مصراورافریقہ کے ساحل سے تاجر اپنا مال تجارت لے کر یہاں آتے اور یہاں کی تجارتی اشیاء اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ گجرات کے قدیم حکمرانوں میں خاندان موریہ، چالوکیہ، وَلبھی اور راشٹرکوٹ خاندانوں کے نام ملتے ہیں۔1ے ان سبھی حکمرانوں نے بحری تجارت کوفروغ دیا تھا۔اس لیے ان بندرگاہوں پر غیر ملکی تاجروں کی کوٹھیاں قائم تھیں۔علاء الدین خلجی کے دکن پر حملے کے بعد 1398ء تک یہاں دہلی سے ناظم آتے رہے۔2ے جو گجرات میں امن اور امان قائم کرنے کی کوشش کرتے اور تجارتی ومعاشرتی ترقی میں بھی حصہ لیتے رہے۔ محمد شاہ تغلق نے ظفر خان بن وجیہہ الملک کو گجرات کا ناظم بنایا تھا۔خاندان تغلق کے خاتمہ کے بعد اسی ظفر خان نے یہاں اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی اور سلاطین گجرات کا مورثِ اعلیٰ بنا۔3ے یہ سلاطین گجرات علمی وادبی حیثیت سے کوئی امتیازی خصوصیت نہیں رکھتے تھے لیکن انھوں نے ہمیشہ علوم وفنون کی قدردانی اور سرپرستی کی۔ان سلاطین کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے، مولانا عبدالحق اپنی تصنیف ''یادایام'' میں لکھتے ہیں:

''یہ صرف ان (سلاطین گجرات) کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ شیراز ویمن

ودیگر ممالک اسلامیہ کے چیدہ وبرگزیدہ علمانے گجرات میں آکر بودوباش اختیار فرمائی۔جن کے فیوض سے چند دنوں میں گجرات مالا مال ہوگیا۔اور خود گجرات میں اس پائے کے علماء پیدا ہوئے جن کے فیوض کی علمی آبیاری سے اب تک ہندوستان کی درسگاہیں سیراب ہورہی ہیں۔''4

1572ء میں شہنشاہ جلال الدین اکبر نے صوبہ گجرات پر قبضہ کرکے مغلیہ حکومت قائم کردی۔مغلیہ سلطنت کے عہد میں گجرات کوایسی ترقی نہیں ملی جیسی خودمختار سلاطینِ گجرات کے دور میں تھی۔لیکن مغل حکمرانوں نے گجرات کوزوال پذیر بھی ہونے نہیں دیا۔ یہاں کی علمی وادبی، تجارت اور صنعتی ترقی میں اضافے کیےاورعوام کی حوصلہ افزائی بھی کی۔1753ء کے بعد مرہٹوں کی لوٹ مار سے گجرات میں سخت بدنظمی پیدا ہوگئی تھی۔کھمبایت، بھروچ اور سورت وغیرہ بندرگاہوں پر جولوگ قابض تھے۔وہ ان کے مالک بن بیٹھے۔انگریزوں کے قبضۂ گجرات تک تقریباً یہی عالم رہا۔انگریزوں نے رفتہ رفتہ ممبئ کوترقی دے کراسے بھی ایک بحری مرکز بنادیا تھا۔ سیاست، تجارت، امارت، ثقافت اورصنعت وحرفت کی ترقی نے ممبئ شہرکو ہندوستان کی عروس البلاد بنادیا۔اس کے بعد بھی انگریز سورت اوربھروچ کی بندرگاہوں پر قابض رہے۔6

سولہویں، سترہویں صدی اوراٹھارہویں صدی عیسوی میں شہرسورت جنوبی ہندوستان میں تجارت کا سب سے بڑا مرکز اورتمدن کا اہم مرجع تھا۔شہرسورت دریائے تاپتی کے کنارے پر آباد ہے۔ تاپتی کے دوسرے کنارے پر راندھیر نامی بندرگاہ موجودتھی۔ سلطان محمد ثالث (943ھ/1573ء) کے عہد میں سورت شہراوراس کے قلعے کی تعمیر ہوئی۔7اس سے قبل سورت مچھلی والوں کا گاؤں کہلاتا تھا۔مغلوں کے عہد میں اس کی آبادی کافی بڑھی اور یہ ہندوستان کی سب سے بڑی بندرگاہ بن گیا۔ایک قلمی یادداشت کی بیاض میں اس بندرگاہ کے آباد ہونے کی تاریخ(947ھ/1532ء)نظر آتی ہے۔8 اورتاریخی مصرعہ یہ ہے:

''بادآباد بندرسورت''

سولہویں اورسترہویں صدیاں گجرات کی سدابہارصدیاں شمار کی جاتی ہیں۔اس صدی میں ہندوستان کے علاوہ غیرممالک کے اولیاوصوفیا بھی یہاں بودوباش اختیار چکے تھے۔اوراپنے فیوض وبرکات سے اس صوبہ کوسیراب کررہے تھے۔یہی وجہ ہےاس سرزمین سے کئی عالم وفاضل

دانشور اٹھے جنھوں نے اپنے کلام میں گجرات اور اس کے کئی شہروں کے علاوہ سورت شہر کی خوبصورتی کو نظم کیا ہے۔ اس مضمون میں انھیں چند نظموں کا سرسری طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

شیخ احمد گجراتی (1580ء) کا ایک شعر ہے۔9 جس میں شیخ احمد نے اپنے وطن گجرات کی خوبیوں کو یاد کیا ہے۔

احمد دکھن کی خوباں ہوتیاں ہیں پر ملاحت
تو تو دکھن کو اپنا گجرات کر کے سمجھیا

عادل منصوری نے بھی شیخ احمد کی پیروی کرتے ہوئے پورے گجرات کو ایک مصرعے میں سمو دیا ہے:

شبدوں کی شمعیں پگھلیں　　　لو خاموش ہوا گجرات 10

جمال قریشی اردو زبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم نے گجرات کے بازار میں اردو تیرا　　　سکہ اس طرح چلایا ہے کہ جی جانے ہے 11

کلیات اختر شیرانی میں ''اے سرزمین گجرات'' بڑی پیاری نظم ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

آنکھ میں بسی رہی ہیں وہ پر بہار راتیں　　　وہ مشک بو ہوائیں۔ وہ مشکبار راتیں
وہ نشہ گو فضائیں، وہ نشہ زور راتیں　　　وہ یادگار راتیں، اے سرزمین گجرات

اختر شیرانی نے ایک اور پوری نظم ''گجرات کی رات'' اپنی سلمیٰ کو یاد کرتے ہوئے لکھی۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آج قسمت سے نظر آئی ہے برسات کی رات　　　کیا بگڑ جائے گا رہ جاؤ یہیں رات کی رات
ان کی پابوسی کو صبا جائے تو کہہ دینا　　　آج تک یاد ہے آپ کے گجرات کی رات
جس میں سلمیٰ کے تصور کے ہیں تارے روشن　　　میری آنکھوں ہے وہ عالم جذبات کی رات
ہائے وہ مست گھٹا، ہائے وہ سلمیٰ کی ادا　　　آہ! وہ رودِ چناب، آہ! وہ گجرات کی رات 12

اردو کے معروف شاعر، ولی جب پہلی بار دہلی پہنچے تو گجرات اور دوستوں کی یاد نے انھیں بے چین کر دیا۔ نتیجتاً ان کے کلیات میں ایک خوبصورت قطعہ موجود ہے:

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل　　　بے تاب ہے سینے سے آتش بہار دل

مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں مبین　　شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل 13ے

سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں سورت شہر کو بڑی ترقی ہوئی۔ وہ ایک مرکزی بندرگاہ کے علاوہ ہندوستانی صنعت وتجارت کا ایک اہم مرکز بن گیا۔اسی صدی میں پرتگیزوں اور انگریزوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں یہاں قائم کی تھیں۔مسٹر سر گریسن اپنی پیائش کی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی اولین انگریزی لغت 1630ء میں سورت میں تیار کی گئی۔14 اس شہر کے لوگ دولتمند تھے۔موسم سرما میں سیاح یہاں آتے جس کی وجہ سے یہاں رہنے کے لیے کوئی مکان ملنا دشوار ہوجاتا تھا۔ یہاں سے ریشم اور روئی کا بافتہ غیر ممالک بھیجا جاتا تھا اور کچی روئی چین تک جاتی تھی۔مسلمان حج کرنے کے لیے یہیں سے روانہ ہوتے تھے۔اس لیے سورت کو ''باب المکہ'' اور ''بندرمبارک'' کہا جاتا تھا۔15ے ملانصرتی نے اپنی شاہکار مثنوی ''علی نامہ'' کے چند اشعار میں بندرگاہ سورت کی خوبصورتی کا ذکر کیا ہے۔وہ کہتا ہے:

کہ سورت کہہ کر ملک گجرات میں　　بندر اک تھا خوب سب بات میں

دھویں بحر و خشکی کے تجار وہاں　　ملے بست جے نئ سو عالم میں وہاں

یک یک کونچہ یک شہر معمور اچھے　　ہر ایک گھر میں کئی گنج بھرپور اچھے

لیوے ہند فت فیض اس سے نول　　کہ جوں ابرکوں آپ دریاتے بل

اوپچ جگ ہوئی جب تے دو بوستاں　　نہ دیکھی تھی چک تب تے بادِخزاں (16)

ان ابیات میں شاعر کہتا ہے کہ سورت نامی جو گجرات میں ایک بندرگاہ ہے۔وہ ہر بات میں خوب ہے۔بحری اور بری ہر قسم کے تاجر وہاں رہتے ہیں اور جو چیز دنیا میں کہیں نہیں ملتی وہ وہاں مل جاتی ہے۔ ہندوستان اس سے ہمیشہ نیا فیض حاصل کرتا ہے۔جیسے ابر کو آبِ دریا سے قوت پہنچتی رہتی ہے۔جب سے یہ بوستاں دنیا میں پھولا پھلا ہے اس نے کبھی بادِخزاں کا جھونکا نہ دیکھا تھا۔17ے

علی عادل شاہ ثانی نے 1656ء میں جب عنانِ حکومت سنبھالی۔ امرا میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک اٹھی اور سرحدی صوبوں پر بغاوتیں ہونے لگیں۔علی عادل شاہ نے بڑی ہمت اور سمجھداری سے اپنی حکومت کو سنبھالا۔شیواجی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکا۔کرنول کے حبشی سرداروں کو شکست دی۔راجہ بدنور کی سرکوبی کی۔اور مغلوں کے فوجی حملوں کو جے سنگھ کی سرکردگی

میں ہو رہے تھے انھیں پیچھے ہٹا دیا۔ ملا نصرتی نے اپنی مثنوی ''علی نامہ'' میں علی عادل شاہ کی انہی مہمات کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے، اور تاریخی واقعات کو بڑی احتیاط اور صحیح ترتیب کے ساتھ نظم کیا ہے۔ 1658ء میں شیواجی نے بندرگاہ سورت پر حملہ کر کے اسے لوٹ کر ویران کر دیا۔ 18؎ نصرتی اپنی مثنوی میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

کیا لوٹ یوں پل میں بندرکوں پاک ۔۔۔ کہ جوں آگ لگتیں نہ رہے باج راک
پھیری خوبصورت کی خوبصورت نے یوں ۔۔۔ جوانی تھے محبوب پیری میں جیوں 19؎

شاعر کہہ رہا ہے کہ بندرگاہ کو لوٹ کر پل بھر میں اس طرح صفایا کر دیا جیسے آگ لگنے پر سوائے راکھ کے کچھ نہ بچتا ہے۔ سورت کی پیاری صورت ایسی بدل گئی جیسے جوانی کے محبوب کی صورت بڑھاپے میں بگڑ جاتی ہے۔

1669ء میں مرہٹوں نے سورت پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ پرتگیزوں اور انگریزوں نے تجارتی منافع کے پیش نظر ان سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ غرض یہ ہے کہ سورت شہر پھر دوبارہ اسی شان و شوکت سے آباد ہوا۔ اور 1695ء تک ایک ایسا خوبصورت شہر اور بندرگاہ بن گیا کہ کوئی غیر ملکی جہاز یہاں رکے بغیر واپس نہیں جاتا تھا۔ 20؎ چنانچہ ولی نے اس کی دلکشی سے متاثر ہو کر ایک چھوٹی سی مثنوی ''در تعریف شہر سورت'' نظم کی جو اس کے کلیات میں موجود ہے۔ ولی کی شاعری میں حسن کا جو تصور ملتا ہے وہ مجرد یا خیالی نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق اسی عالم آب و گل سے ہوتا ہے۔ یہی ولی کی شاعری کی ایک بڑی خوبی بھی سمجھی جاتی رہی ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے خوبصورت ماحول کے ساتھ نسوانی حسن سے بھی متاثر نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عجب شہراں میں ہے پرنور یک شہر ۔۔۔ بلاشک وہ ہے جگ میں مقصد دہر
اہے مشہور اس کا نام سورت ۔۔۔ کہ جاوے جس کے دیکھے سوں کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور ۔۔۔ اچھو اس نور سوں ہر چشم بددور
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب ۔۔۔ ملاحت کی وہ گویا کھان ہے سی
کنارے اس کے اک دریائے تپتی ۔۔۔ کہ دنیا دیکھنے کوں اس کو ٹپت
کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر ۔۔۔ ہوا دیتی ہے اس کی یادِ کشمیر

وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم ؎ صبح و شام تپ کرتا ہے عالم
اہے سورت حقیقت کی نشانی ؎ کہ ہیں معمور وہاں اہل معانی
شرافت میں یہ ہے جیوں یاں مکہ ؎ تو ہے سب ملک پر اس کا جو سکہ
اگر دیکھے ہیں لوگاں شام و تبریز ؎ نہ دیکھا کوئی ایسا ملک زرخیز
اس بھیتر کیتے ایسے ہیں تجار ؎ کہ قارون کو نہیں ان کے نزک بار
بھری ہے سیرت وصورت سوں سورت ؎ ہراک صورت ہے وہاں آن مول مورت
ختم ہے امرداں اوپر صفائی ؎ ولے ہے بیشتر حسنِ نسائی [21]

ولی نے سورت شہر کی خوبصورتی کی عکاسی دوسرے سبھی شعرا سے بہتر طریقے سے کی ہے۔انھوں نے اس مثنوی میں قوس وقزح کے سارے رنگ بھر دیے ہیں۔ان کی تشبیہات اور استعارات میں لطافت وشائستگی پائی جاتی ہے۔

صوبہ گجرات کے تمام شہروں سے کہیں زیادہ مصنف وشاعر سورت میں نظر آتے ہیں۔ کچھ تو اسی شہر کی خاک سے پیدا ہوئے اور کچھ نے اسے اپنا وطن ثانی بنالیا۔انیسویں صدی کے آخر تک شعروشاعری وادبیات کا یہ سلسلہ یہاں نظر آتا ہے۔سورت شہر کی دلکشی اور خوبیوں کو نہ صرف نصرتی اور ولی نے نظم کیا بلکہ ان کے بعد آنے والے شعرا بھی اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔انیسویں صدی کے ایک شاعر منظور سورتی بھی شہر سورت کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔وہ سورت کے رہنے والے ایک عالم وفاضل تھے۔شعروسخن کا بھی ذوق رکھتے تھے۔سورت کے ہی مشہور شاعر سمجھو سورتی ان کے استاد تھے۔منظور سورتی نے نثر ونظم میں کل سات تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ان کے کلام میں ایک مسلسل نظم سورت کی تعریف میں ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے ایک مثنوی شہر سورت کی تباہی پر لکھی ہے۔شہر سورت کو طوفان اور سیلاب کے سبب زبردست نقصان پہنچا تھا۔اس مثنوی کا نام ''دریائے موج'' ہے۔منظور سورتی شہر سورت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔[22]

ایک گلشن دل کشا ہے سورت ؎ بلبل ہوں وطن میرا ہے سورت
گلزار ہے۔ خلد ہے، ارم ہے ؎ مت پوچھیے مجھ سے کیا ہے سورت

ساکن ہے وہ رشک حور اس میں | جنت سے بھی کچھ سوا ہے سورت
اپن وضع پر بنے سب طرحدار | تصویر کا آئینہ ہے سورت
سنیاں ہے جو اشک عاشق اس جا | ہاں درّ بے بہا ہے سورت
کیوں کرنہ میں اس طرف کھینچا جاؤں | ہوں کاہ میں کہربا ہے سورت
ہے اس کی درد دم مسیحا | اعجاز نما بجا ہے سورت
تپتی کا ہے آب آب حیراں | اے ہمدمو! جاں فزاں ہے سورت
منظور میں گو اس سے جدا ہوں | پر آنکھوں سے کب جدا ہے سورت 23؎

منظور سورتی نے شہر سورت کی مدح سرائی کے ساتھ ساتھ اس وقت سوسائٹی میں رائج ان مقبول عام چیزوں کی طرح بھی اشارہ کیا ہے۔ جن کی وجہ سے سورت ''نگار خانہ'' بنا ہوا تھا۔ تاریخ گجرات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مغلوں کے عہد حکومت میں سورت ایک ترقی یافتہ بندرگاہ تھا۔ اس کا زوال مرہٹوں کے حملوں کے بعد سے شروع ہوا۔ پھر انیسویں صدی عیسوی میں آئے قحط، آگ اور سیلاب نے اس کی بربادی میں اضافہ کر دیا۔ اپریل 1837ء میں اس شہر میں اچانک آگ لگ گئی۔ تقریباً تین دن تک سارا شہر اور آس پاس کا علاقہ جلتا رہا۔ میلوں تک آگ پھیلتی رہی۔ تقریباً دس ہزار مکانات جل گئے۔ اور پینتالیس لاکھ کے نقصان کا اندازہ لگایا گیا۔ پھر اسی سال تاپتی ندی میں زبردست طوفان اور سیلاب آیا جس نے اہل سورت کی بربادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور تقریباً پچیس لاکھ کا نقصان ہوا۔ اور اس شہر کی خوبصورتی کا چوتھائی حصہ بھی باقی نہیں رہا۔ 1883ء میں دوبارہ طوفان وسیلاب آیا اور اس بار بیس لاکھ کے نقصان کا اندازہ لگایا گیا۔ 1889ء میں سورت میں آگ زنی کا واقعہ پیش آیا اور وہاں کا مشہور اور خوبصورت چرچ ''ارمینی چرچ'' گر گیا۔ ان تمام حالات و واقعات کے پیش نظر انگریز گورنمنٹ نے ممبئی کو اہم بندرگاہ بنا دیا۔ اور شہر سورت کی اہمیت بحیثیت بندرگاہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ 24؎

منظور سورتی کی مثنوی ''دریائے موج'' کا موضوع تاپتی ندی کا سیلاب ہے۔ 2/جولائی 1883ء بروز یکشنبہ یہ ہولناک سیلاب آیا تھا۔ اور شہر کے بیشتر حصوں میں دریا کا پانی پھیل گیا تھا۔ سورت کے نواب میر غلام بابا اور بخشی میر عظیم الدین اپنے اپنے ہاتھیوں پر سوار ہوکر

شہر کے سیلاب زدہ علاقوں میں تین دن تک اشیائے خوردنی تقسیم کرتے رہے۔ شہر کے دیگر افسران اعلیٰ نے پانی کی روک تھام کی بڑی جدوجہد کیں۔ اور انسانی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ اس زمانے کے میونسپل سیکریٹری نتھو میاں کی خدمات بھی قابل داد تھیں۔ مثنوی کے ابتدائی حصے میں ملکہ وکٹوریہ، لارڈ رپن، سر فرگوسن گورنر آف ممبئی، کلکٹر مسٹر وائٹ، گلاب داس، میر پرشوتم داس۔ ڈوسا بھائی منوچہر جی اور جمشید جی امیٹھی وغیرہ کی تعریف وتوصیف اور خدمات پر منظور سورتی نے چھیاسی (86) اشعار کہے ہیں۔ مثنوی کے دوسرے حصے میں سیلاب کی تفصیلات نظم کی ہیں۔ سیلاب سے متاثر ہونے والوں کی اہل ممبئی نے جو امداد کی اس کا بھی ذکر ہے۔ یہ مثنوی کل تین سو تیرہ (313) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:[25]

1883ء عیسوی کا سنو تم بیاں — اٹھارہ سو اور تھے تراسی عیاں
جولای کی تاریخ تھی دوسری — بجے سات شب کے تاپتی چڑھی
اسی وقت سے آمد آب تھی — رواں زور سے موج سیلاب تھی
تھی شدت بہت ریل و برسات کی — خراب اوس گھڑی سب کی اوقات تھی
اساس المکاں خوب تھا جن کے پاس — وہ ذی آبرو ہوگئے بے اساس
ہوا گھر کا سب اسباب سیل برد — رہا کچھ جوں غم مٹی میں رد
ہوا حال غربا کا یاں تک تباہ — تھے آنکھوں میں آنسو تو ہونٹوں پہ آہ
علاوہ الم بے لباسی کا تھا — تھی آب رواں کی بدن پر قبا
جو تھے اہل قدرت اور اہل اساس — ملا موجِ دریاں کا ان کو لباس
جو سیلاب کا زور تھمتا نہ تھا — قدم اسپ تازی کا جمتا نہ تھا
ہر اک کو بہ کو بحر ذخار تھا — دم سرد کا گرم بازار تھا
غریبوں کا نالہ لب بام تھا — تھا ماتم سرا شہر کہرام تھا [26]

منظور سورتی نے اپنی نثری تصنیف ''گلدستہ نشاط وسرور'' میں بھی سورت کا ذکر کیا ہے۔ اور اس شہر کی تعریف وتوصیف میں کئی پیراگراف اور اشعار بھی تحریر کیے ہیں۔ اور اہل گجرات سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار بھی کیا ہے یہ تصنیف فارسی زبان میں ہے۔[27]

ادارہ انجمن اسلام ممبئی کی سرپرستی میں دو مشہور وقدیم لائبریریاں (1) کریمی لائبریری (2) اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ہیں۔ان دونوں لائبریریوں میں ہزاروں قدیم وجدید کتابیں فارسی، عربی، اردو، اسلامیات اور تاریخ کے علاوہ مختلف موضوعات پر موجود ہیں۔ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تقریباً پونے دوسو قلمی مخطوطات کے نسخے بھی ہیں۔ان میں ایک قلمی بیاض میں مختلف شعرا کا کلام ہے۔ مثلاً 1۔ قصہ شاہ یمن 2۔ تنبیہ النساء 3۔ بارہ ماسہ 4۔ مسدس سوختی شہر سورت 5۔ قصہ سوختی شہر سورت

شہر سورت پر تحریر کردہ منظوم کلام دو الگ الگ شاعر 1۔ قاضی ہاشم راندیری 2۔ نجم الدین کا ہے۔ تاریخ گجرات کا مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورت شہر میں زلزلہ طوفان اور سیلاب اور آگ لگنے کے واقعات انیسویں صدی میں ہی پیش آئے۔ان قلمی مثنویوں کا مختصر تعارف یہ ہے کہ قاضی ہاشم راندیری نے 1253ھ کی آگ زنی کو موضوع سخن بنایا ہے۔ یہ نظم مسدس کی شکل میں ہے۔ کل ایک سو تیراسی (183) بندوں پر مشتمل ہے۔ شاعر اور مثنوی کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ملا۔ ظاہر ہے کہ شاعر راندھیر نامی بندرگاہ کا رہنے والا تھا۔ زمانہ قدیم میں راندھیر تاپتی ندی کے دوسرے کنارے پر اور سورت شہر پہلے کنارے پر واقع تھا۔اس مسدس کی ابتداء بسم اللہ سے ہوتی ہے۔ پہلے ہی بند میں شاعر نے آگ لگنے والے دن، ماہ وسنہ اور وقت کو نظم کر دیا ہے۔

بارہ سو تیپن میں آیا غضب رب کا چلا
ہجدھم ماہ محرم پیر کا دن تھا بھلا
سورت بندر اوپر وقت عصر آئی بلا
ڈالا بندوں پر غضب کر دیتے سب کو تلملا
تیرہویں صدی ہے آخر دور کا یہ زلزلہ
اے عزیزو شہر سورت آن میں دیتا جلا 28ے

آگ لگنے کی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ مگر شاعر کا کہنا ہے کہ بندوں کے گناہوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے آسمان سے یہ آفت نازل ہوئی ہے۔جس نے بلا تحقیق ہندو، مسلمان اور پارسی، رافضی، میمن، بنیے اور ملا سبھی کے گھر پھونک ڈالے۔اس آگ نے دین شاہ کی حویلی اور نسروان کے گھر کو بھی نہ

چھوڑا۔ اس شہر کے ہمدرد اور نیک دل لوگ جیسے دادا بھائی بندر والے اور ان کے فرزند آگ بجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ ہرمز جی نے متاثرہ افراد کے کھانے پینے کا انتظام کیا تھا۔ زکریا صاحب نے کئی عدد اناج کی بوریاں بھجوائی تھیں۔ آگ میں گھر، املاک، اور جانور اور کئی ہزار آدمی بھی جل گئے تھے۔ غریبوں کے ساتھ ساتھ دولت مندوں کے گھر بھی جل رہے تھے۔ ساہوکاروں کا مال وزر یہاں تک کہ میٹھا رام کا خوبصورت قصر بھی جل کر خاک ہو گیا۔ سورت کے قلعہ کے پاس ممبئی سے کئی لوگ امداد کی غرض سے آکر جمع ہو چکے تھے۔ سورت کے نواب صاحب میر فضل الدین خان اور شہر کوتوال اردیسر صاحب متاثرین کی مدد کرنے آئے تھے۔ دھیرے دھیرے یہ آگ برہان کی پھاٹک صراف پیٹ کی دوکان اور گوپی پورہ سبھی محلوں تک پھیل چکی تھی۔ ہوا کی شدت سے آگ کی لٹیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

معلوم نہیں تھا اے عزیزو   آگ کا کس کو مرم
نوح کے طوفان مثل   تھا یوج یہ طوفان گرم
دیکھ کے طوفان، دعا   منگنے لگے طرفِ حرم
جد کی برکت سے عزیزو   رکھ لیا ان کی شرم 29ے

تین دن تک یہ آگ سورت شہر کو جلاتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے بجھنے لگی۔ ممبئی کے گورنر کے حکم سے سرکاری آدمی تحقیق کرنے آئے تھے۔ تحقیقی کمیٹی کی رپورٹ دیکھ کر گورنر نے اس شہر کا محصول معاف کر دیا تھا۔ ممبئی کے دولت مند مشہور سخی مثلاً جمشید جی، ہرمز جی، دادا بھائی، ایڈل جی اور ناخدا محمد علی نے کئی کشتیاں، غلہ، کپڑے ضروری سامان اور نقد روپے بھی بھجوائے تھے

ناخدا محمد علی کی   کیا کہوں اب خوبیاں
جمشید جی کے ساتھ ہو   خیرات میں کوشش کیا
سورت کے غربا کی مصیبت   پوچھیاں سب سختیاں
اب تلک جاری ہے وہاں سے   مال کی سب کشتیاں 30ے

شاعر ایک کم پڑھا لکھا اور غیر معروف شخص معلوم ہوتا ہے۔ مسدس میں دو جگہ اپنا نام لکھا ہے اور کہا ہے کہ میں یہ ہندی زبان میں نظم کر رہا ہوں تا کہ ہندو و مسلمان سبھی اس کو پڑھ سکیں۔

اے عزیزاں یہ مسدس میں لکھا ہندی زبان
بھی سمجھ پن جاتی ہے کیا ہندواں اور کیا موموناں
قاضی ہاشم تو کیا ہے یہ مسدس کو تمام
آنکھ میں جو خیال دیکھا جھوٹ نہیں ہے وہ کلام
کمترین ہاشم کے حق میں اب تمھیں مانگو دعا
وقت آخر کو خدا ایمان مجھ راکھے بجا
کل موموناں کلمہ ستین سالم رکھے ایمان خدا
اور صحیح فرمایئے اس شعر میں ہووے خطا 31

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اس مخزونہ قلمی بیاض میں دونوں نظمیں شہر سورت میں لگنے والی آگ کے بیان میں ہیں۔قاضی ہاشم راندیری نے اپنی مسدس کو 183 بندوں میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ جب کہ دوسری نظم جس کا عنوان ہے ''قصہ سوختن شہر سورت'' ہے اس کے شاعر نجم الدین نے اس واقعہ کو صرف ایکسٹھ (61) بندوں میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم بھی مسدس کی شکل میں ہے۔اس کی ابتدا بھی بسم اللہ سے ہوتی ہے۔مسدس کے چار اشعار کے بعد اس میں بھی ٹیپ کا بند آتا ہے۔شاعر نے پہلے بند میں حمد کا مصرعہ اور نعتیہ اشعار قلمبند کر دیے ہیں:

بعد زاں حمد الٰہی نعت ختم المرسلین
مقبل درگاہ این و راکب عرش بریں
والی ہر دوجہاں و شافع ہر مذنبین
عرض ندویکی ہو درگاہ میں بالانشین
شہر سورت پر کرم کر یا الہٰ العالمین
کر دفع تو ہر بلا کو یا مجیب السائلین 32

قاضی ہاشم راندیری کی طرح نجم الدین کا موضوع بھی سورت میں لگنے والی آگ کا حادثہ ہے۔ یہ واقعہ 1253ھ ماہ محرم پیر کے دن عصر کے وقت پیش آیا تھا۔اس نظم کی زبان و بیان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نجم الدین زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔اپنی نظم میں وہ بھی یہ بتاتے ہیں کہ

انسانوں کے گناہوں کے باعث رب کا قہر آگ کی صورت میں نازل ہوا ہے۔دونوں مسدس میں آگ سے ہونے والے نقصان اور مدد کرنے والے افراد کا ذکر ہے۔شاعر کہتا ہے کہ سورت کے عالم و فاضل سید محمود اور دایا بھائی جیسے دولت مند سخی اس آگ میں جل گئے۔سورت کے محلوں اور آس پاس کے گاؤں یہاں تک ملا جی کا محل تک جل گیا۔تین دن کے بعد یہ آگ دھیرے دھیرے بجھنے لگی۔ممبئی کے ایک فیاض اور سخی شخصیت باٹلی والا نے 25 ہزار روپے نقد اور کئی کشتیاں اشیائے خوردنی کی یہاں بھجوائیں اور یہاں کے کوتوال اردسیر صاحب کو حکم دیا کہ سارا سامان ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔نجم الدین نے اپنی نظم میں جوہریوں اور بنیوں کی دوکانوں اور مکانوں کے ساتھ ان کے جل جانے کا ذکر بھی کیا ہے۔سورت کے نواب صاحب اور سورت کے رحم دل، ہمدرد انسانوں مثلاً جمشید بھائی، جی جی بھائی، ایڈل جی وغیرہ نے اس حادثہ سے متاثرہ لوگوں کی حتی الامکان مدد کی تھی۔

شاعر کا خیال ہے کہ سورت کے اولیاء اور صوفیا کے بدولت شہر کا اک بڑا حصہ آگ کی زد سے محفوظ رہا اور انھیں اللہ والوں کی دعاؤں کی بدولت آگ بجھتی گئی۔شاعر اس نظم کے آخری مصرعے میں اپنا خاتمہ بالخیر ہونے کی دعا بھی کرتا ہے:

یاالہٰ العالمین   پھرے محمد مصطفیٰ ؐ
واسطے خیر البشر کے   جو کہ ہیں بدرالدجا
یہ عرض کرنا ہے نجم الدین   ہر شام و صبا
وقت نزع مرگ ہو   خاتمہ بالخیر ما

شہر سورت پر کرم کر یاالہٰ العالمین
کر دفع تو ہر بلا کو یا مجیب السائلین

تمت تمام قصہ شہر سورت صالح، ہشتیم روز جمعہ بوقت ضحیٰ، شہر جمال الآخر 1259ھ ہجریہ مقدسہ برائے مطالعہ مہربان شیخ عبدالطیف بن شیخ امام کھانکی قلمی یافت[33]

ماخذ وحواشی:

1۔تاریخ گجرات۔مولف سید ابوظفر ندوی۔الجمعیۃ پریس۔دہلی 1958ء

2۔ہسٹری آف گجرات،از خان بہادر ایم ایس کمشنریات۔جلد پہلی۔مطبوعہ 1938ء

3۔شاہان مالوہ۔مولفہ امیر احمد صاحب علوی۔انوار المطابع۔لکھنؤ

4۔دیوان عزلت۔مرتبہ عبدالرزاق قریشی۔ادبی پبلشرز،ممبئی۔1962ء

5۔تاریخ گجرات۔مولف سید ابوظفر ندوی۔الجمعیۃ پریس۔دہلی 1958ء

6۔رسالہ نوائے ادب ممبئی۔مضمون گجرات کی مثنویاں۔ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی۔جنوری 1951ء

7۔رسالہ معارف۔مضمون عہد عالمگیری میں دکن کا نظم ونسق۔شکیل احمد انور۔دسمبر 2013ء

8۔ایضاً

9۔رسالہ معارف۔مضمون عہد عالمگیری میں دکن کا نظم ونسق۔شکیل احمد انور۔دسمبر 2013ء

10۔رسالہ نوائے ادب،ممبئی۔1983ء

11۔ایضاً

12۔کلیات اختر شیرانی۔مرتب گوپال متل۔جے اے آفسیٹ پریس نئی دہلی۔1997ء

13۔کلیات ولی۔مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی۔انجمن ترقی اردو کراچی۔1951ء

14۔اورینٹل کیٹلاگ،Surat About 1630

15۔گجرات کی تمدنی تاریخ(مسلمانوں کے عہد میں)مصنف سید ابوظفر ندوی،مطبع معارف اعظم گڑھ 1962ء

16۔مثنوی علی نامہ،تصنیف ملا نصرتی،مرتبہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی،اعجاز پرنٹنگ پریس،حیدرآباد 1959ء

17۔ایضاً

18۔ایضاً

19۔ایضاً

20۔تاریخ گجرات۔مولف سید ابوظفر ندوی۔الجمعیۃ پریس۔دہلی 1958ء

21۔کلیات ولی۔مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی۔انجمن ترقی اردو کراچی۔1951ء

22۔رسالہ نوائے ادب،منظور سورتی کی غزل گوئی۔عبدالحلیم ساحل۔جنوری 1975ء

23۔ایضاً

24۔تاریخ گجرات۔مولف سید ابوظفر ندوی۔الجمعیۃ پریس۔دہلی 1958ء

25۔رسالہ نوائے ادب ممبئی۔مضمون گجرات کی مثنویاں۔ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی۔جنوری 1951ء

26۔ایضاً

27۔رسالہ نوائے ادب،منظور سورتی کی غزل گوئی۔عبدالحلیم ساحل۔جنوری 1975ء

28۔قلمی مخطوطہ نمبر 65۔مخزونہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،ممبئی

29۔ایضاً

30۔ایضاً

31۔ایضاً

32۔ایضاً

33۔ایضاً

ڈاکٹر سعیدہ پٹیل،انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،ممبئی میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:257-264
Dr. Ghazanfar Iqbal, Deccan ka Shairi Naabgha: Nusrati

غضنفر اقبال

دَکن کا شعری نابغہ: نصرتی

اُردو شعر و ادب کا ارتقا دکن میں ہوا۔ بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین نے زبان اردو اور ادب کی تشکیل اور اشاعت میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ ان سلطنتوں سے وابستہ نثر نگاروں اور سخنوروں نے زبانِ اردو ادب کے خزانے کو اپنے فن سے مالا مال کیا۔ اس عہد میں صنف سخن میں مثنوی کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ اس عہد کے سخنوروں نے صنفِ مثنوی کی روپ ریکھائیں بدل کر رکھ دی تھیں۔ مثنوی ایک بیانیہ، توضیحی اور منظوم صنف سخن ہے۔ مثنوی کو حالی سے لے کر عہد موجود تک کے ناقدین نے اسے زیادہ ہمہ گیر بتایا ہے۔ کیوں کہ صنف سخن میں مثنوی وہ صنف ہے جس میں جذبات نگاری، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری اور تخیل کی بلند پروازی کے نقش گہرے ہوتے ہیں۔ گلشنِ عشق علی نامہ، پھول بن، خواب وخیال، سحر البیان، گلزارِ نسیم اور زہرِ عشق وغیرہ مثنویات کے باب میں اپنا ایک امتیازی نشان رکھتے ہیں۔ عادل شاہی دور کے ایک ہنرمند سخنور نصرتی نے صنفِ مثنوی میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا تھا۔ اس شاعرِ نابغہ نے تین مثنویاں گلشنِ عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری کے علاوہ غزلیں، قصائد، قطعات اور رباعیات بہ طور یادگار چھوڑی ہیں۔

نصرتی کا اصل نام محمد نصرت تھا۔ اس نے تین عادل شاہی بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ اور سکندر عادل شاہ کا عہد دیکھا تھا۔ نصرتی ایک سپاہی زاد تھا۔ عادل شاہی سلاطین کی سرپرستی اور حسنِ توجہ سے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز ملی۔ اس کا آبائی پیشہ شاعری نہیں بلکہ سپاہ گری تھا۔ نصرتی کی جائے ولادت کا علم ہنوز نہیں ہو پایا ہے اور تو اور نصرتی کی تاریخِ پیدائش سے بھی اردو ادب کا طالب علم لاعلم ہے۔ لیکن مورخین نے لکھا ہے کہ نصرتی کرناٹک کا

باشندہ تھا۔علی عادل شاہ نے نصرتی کو نہ صرف شاہی مصاحبوں میں داخل کیا بلکہ وہ ہر وقت بادشاہ کے ہمراہ اس کے رزم و بزم میں شریک ہوا کرتا تھا۔نصرتی نے علی عادل شاہ کو اپنا استاد تسلیم کیا تھا۔اورنگ زیب عالم گیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے سخنوروں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ان میں نصرتی بھی تھا۔شہنشاہِ ہندوستان عالم گیر نے نصرتی کے کلام کو سب سے افضل تسلیم کیا اور خطاب ملک الشعرائے ہند سے سرفراز کیا۔نصرتی نے 1095 ہجری میں وفات پائی۔

عہد عادل شاہی کا اہم ترین سخنور نصرتی تھا۔اس نے اصناف سخن کے ذریعہ اپنے عہد کی عکاسی کی ہے۔نصرتی کی شاعری کے مطالعے سے اس کی قادرالکلامی کا اندازہ بہ خوبی ہوجاتا ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے الفاظ میں:

''نصرتی کو دبستانِ بیجاپور کی شعری روایات کا حاصل اور نقطۂ تکمیل سمجھنا چاہئے۔اس نے ایک ایسے دور میں جنم لیا جب بیجاپور میں ادبی اور تہذیبی روایات کا معیار پختہ ہو چکا تھا اور دبستان بیجاپور کے امکانات کی دنیا واضح ہو چکی تھی۔نصرتی وہ شاعر ہے کہ جس نے شعری تجربات کی دنیا کو نہ صرف استحکام بخشا بلکہ اسے نئے تجربات کی دولت سے مالا مال بھی کر دیا۔اپنی ذات میں وہ ایک بڑا شعری نابغہ تھا۔ماضی حال اور مستقبل پر اس کی گہری نظر تھی''۔

(بحوالہ: کتاب: اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے 1857 تک، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ص 137)

گلشن عشق نصرتی کی اولین تصنیف ہے۔یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں منوہر و مالتی کے عشق کا افسانہ بیان ہوا ہے۔یہ مثنوی 1675ء میں لکھی گئی ہے۔گلشن عشق فارسی اور اس دور کی دوسری دکنی مثنویوں کے طرز پر تحریر کی گئی ہے۔نصرتی نے یہ مثنوی نبی بن عبدالصمد کی تحریک پر لکھی تھی۔مثنوی کو مختلف عناوین کے تحت منقسم کیا گیا ہے۔مثلاً حمد، نعت، معراج، منقبت، مدح گیسو دراز، مدحِ بادشاہ، مدحِ بڑی صاحبہ وغیرہ۔اس میں عقل اور عشق کے موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔گلشن عشق کا قصہ یوں ہے کہ راجا بکرم کے نام سے ہوا کرتا تھا مگر وہ لا ولد تھا۔ایک فقیر کے مشورے پر بکرم ایک درخت کا پھل رانی کو کھلا دیتا ہے۔پھل کھانے کے نتیجے میں رانی ماں بن جاتی ہے۔شہزادے کی پیدائش کے وقت علم ہوتا ہے کہ شہزادہ کو عشق ہوگا۔شہزادے کا نام منوہر اور شہزادی کا نام مالتی ہے۔یہ دونوں کی عشق کی دبستان ہے۔منوہر اور مالتی ایک ہوجاتے

ہیں اوران کی شادی ہوتی ہے۔گلشن عشق کی معنویت پر پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

''گلشن عشق کی تہذیبی اہمیت تو ہے ہی ،بعض خصوصیتوں کی بنا پر یہ مثنوی دکن کی بہترین ادبی مثنویوں میں بھی شمار کی جاسکتی ہے۔نصرتی کوقدرتی نظاروں کے بیان میں خاص قدرت حاصل ہے۔ہندوستانی قصہ پھر ہندوستان ہی کے نظارے،عجب لطف پیدا ہوگیا ہے۔ سردی گرمی کی کیفیت باغوں، پھولوں اور پرندوں، چرندوں کا حال کشتی کی روانی، کھانوں، ترکاریوں، پکوانوں اور پھلوں کی تفصیل اور چاندنی کا سماں جگہ جگہ خوب بیان کیا ہے۔مثنوی کے ہر باب کا خاتمہ اخلاقی استعار پر ہوتا ہے۔نصرتی کوانسانی جذبات کی کیفیت دکھانے میں بھی کمال حاصل ہے''۔

(بحوالہ: کتاب:ہندوستانی قصوں سے ماخوذاردومثنویاں۔پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ص100 تا101)

نصرتی کی شاعری دکنی شعری ادب کا نقطۂ عروج ہے۔یہ مثنوی زبان وبیان کے اعتبار سے بیجاپوری اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے۔لیکن مزاج کے لحاظ سے یہ گولکنڈہ کی مثنویوں سے قریب تر ہے۔گلشنِ عشق نصرتی جیسا بڑا سخنور ہی لکھ سکتا تھا۔مثنوی گلشنِ عشق سے چند ابیات ملاحظہ کریں۔

صفت اس کی قدرت کی اول سراؤں
دھریا جس نے یو گلشنِ عشق ناؤں
رنگا رنگ جسے گل یو بن باس ہے
اور ہر گل میں تجھ عشق کی باس ہے
دیا عشق کوں تونچہ عزت کمال
تمہیں ہے جمیل یحب الجمال
اچھے عقل تے دین دنیا کے کام
دونو جگ میں عاقل دے نیک نام
دلاں کا ہے اے عشق تو بادشاہ
جہاں ڈر ہے سو وانچہ تجھ تخت گاہ

(بحوالہ، کتاب، نصرتی، مولوی عبدالحق، ص34 تا35)

مثنوی گلشنِ عشق میں نصرتی نے ہر واقعہ اور واردات کی خوبصورت عکاسی اپنے ابیات کے ذریعے کی ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔

علی نامہ نصرتی کی ایسی مثنوی ہے جس کا موضوع وہ تاریخی واقعات اور فوجی کارگذاریوں کا بیان ہے جس کا مرکزی کردار علی عادل شاہ ثانی ہے۔ نصرتی نے اپنی اس مثنوی کا تقابل فارسی اور ہندی کے رزم ناموں سے کرنے کے بعد فردوسی کے شاہ نامے سے کرتا ہے۔ اور علی نامہ کو شاہ نامہ دکن سے تعبیر کرتا ہے۔ نصرتی نے علی نامہ میں وہی محور کا انتخاب کیا ہے جو فردوسی نے شاہ نامہ لکھنے کے لیے کیا تھا۔ علی نامہ کو نصرتی نے مثنوی میں فتح نامہ ہی کہا ہے۔ نصرتی نے اس مثنوی کی ابتدا حسب روایت حمد سے کی ہے۔ حمد کے بعد مناجات پھر نعت پھر ذکر معراج، معراج کے بیان کے آخری حصے میں چاروں خلفائے راشدین کے نام صرف گنا دیے گئے ہیں کہ یہ چاروں حضورﷺ کی معراج سے واپسی پر خوش ہوئے تھے لیکن منقبت حضرت علی کی لکھی گئی ہے۔ منقبت علی کے ضمن میں حضرت خواجہ گیسو دراز کی مدح میں پانچ شعر تبرکاً لکھے گئے ہیں۔ منقبت کے مدح علی عادل شاہ ثانی ہے۔ ڈاکٹر عصمت جاوید مثنوی علی نامہ پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

''نصرتی کا علی نامہ بلا شبہ دکنی ادب کا شاہ کار ہے۔ شمالی ہند میں بھی اردو میں اس پائے کا رزمیہ نایاب ہے اس لیے علی نامے کو اردو ادب کا شاہ کار قرار دینے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔ یوں تو دکنی ادب کی تاریخ عظیم ادبی روایات کی حامل ہے۔ اس ادب نے بڑے بڑے ادبی سورما پیدا کیے ہیں۔ رزم ہو بزم، تصوف ہو یا مذہب و اخلاقیات، تہذیبی روایات کی مرقع کشی ہو یا تخیل کی بزم آرائی ادب کے ہر شعبے اور ہر روایتی صنف میں دکنی ادب نے وہ لازوال کارنامے پیش کیے ہیں کہ وہ دنیا کے ہر قدیم ادب سے آنکھیں ملا سکتا ہے''۔

(بحوالہ، علی نامہ از نصرتی، کتاب زبان اورنگ آبادی، ڈاکٹر عصمت جاوید، ص86)

علی نامہ ایک رزمیہ ہے۔ نہ نصرتی سے پہلے اس پائے کا رزمیہ لکھا گیا اور نہ بعد میں کیوں کہ علی نامہ بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کے ایک انتہائی پر آشوب دور سے تعلق رکھتا ہے۔ مثنوی میں نصرتی نے اپنے ممدوح علی عادل شاہ ثانی پر اورنگ زیب عالم گیر اور شیوا جی کے حملوں

کی داستان کو شاعرانہ لطافتوں اور فنکارانہ خوبیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ہر ایک دیپ تجھ دیپ آن ضرور
کہ سب ملک اندھارا دھن پُر ہے نور

....

جو کوئی کار بد کا جو پالی ہے بد
ہوا ناؤں تس لعنتی تا ابد

....

ادکہ کردہ ٹاپاں تے دھرتی ہڈر
ٹپکنے لگے ڈوانگراں جیوں کنکر

....

سلامت رہنا کر بڑا شہ کا گھر
اوٹھے تھے سو سب جیو پہ کرنے کھتر

....

نکالیا ہوں کے نگ طبیعت کے اوٹ
دیا خوب سورج کے مہرے کی جوت

(بحوالہ کتاب نصرتی، عبدالحق ص 81)

بالائی سطور میں پیش کردہ ابیات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ نصرتی نے علی نامہ کو کس قدر دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ علی نامہ، نصرتی کی ایک بے مثال تصنیف ہی نہیں بلکہ دکنی ادب کا ایک شاہ کار ہے۔ تاریخ اسکندری نصرتی کی مختصر ترین مثنوی ہے۔ یہ مثنوی سکندر عادل شاہ کے کارناموں کا احاطہ کرتی ہے۔ تاریخ اسکندری کا جائزہ مولوی عبدالحق نے اپنی معرکہ آرا کتاب 'نصرتی' میں اس طرح سے لیا ہے۔

''نصرتی کی یہ مثنوی گلشنِ عشق اور علی نامہ کے مقابلے میں بہت ہی مختصر ہے یعنی اس میں صرف 554 شعر ہیں۔ کلام میں وہ زور اور شگفتگی بھی نہیں جو اس کی دوسری مثنویوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ نصرتی کا آخری کلام ہے اور اس کے بیجاپور کے انحطاط کا زمانہ ہے نہ اگلی سی شان

وشوکت تھی نہ پہلے بادشاہوں کا جاہ وجلال تھا اور نہ ان کے پرعظمت کارنامے تھے‘‘۔

(بحوالہ کتاب ،نصرتی ،مولوی عبدالحق ،کل پاکستان انجمن ترقی اردو کراچی ص220)

تاریخ اسکندری میں نصرتی کی دیگر مثنویوں گلشنِ عشق اور علی نامہ سی بات نہ ہومگر زیر بحث مثنوی بھی اپنے عہد کا ایک مرقع ہے۔ایک تاریخ اور ایک تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔تاریخ اسکندری سے یہ ابیات ملاحظہ کیجیے۔

حرکت زمانے کی رہی کوئی کھڑی
کہ یوں جگ میں گردوں تے ماٹی اڑی

....

بھری بھویں ہو گلشن کے جاگیاں پہ ناز
سمندر لیے چھین بھنوریاں کی ٹھار

....

کدھیں پھر کہ مردی پکڑ آئیں گے
کریں گے سو اپنا سزا پائیں گے

(بحوالہ۔کتاب نصرتی ،مولوی عبدالحق ،ص217)

محولہ بالا ابیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ملا نصرتی نے تاریخ اسکندری میں بھی رزمیہ شان کو برقرار رکھا ہے۔اور وہ تروتازگی کو قائم ودائم رکھا ہے جو اس کی دیگر مثنویوں کی امتیازی شان ہے۔ڈاکٹر انور سدید ،نصرتی کی مثنویات پر یوں رائے زنی کرتے ہیں۔

’’نصرتی نے دکنی مثنوی کو فارسی مثنوی کے ہم پایہ بنانے کی کوشش کی اور اس عمل میں دکنی ماحول اور تہذیبی نقوش کو خوبی سے اجاگر کیا ،منوہر و مالتی کی داستان عشق پر مشتمل مثنوی ’’گلشنِ عشق‘‘ میں حسنِ کنایہ کے عاشقانہ مزاج سے پیدا کیا گیا ہے۔علی نامہ اور تاریخ اسکندری میں تاریخ نگاری کا فریضہ ادا کیا گیا ہے‘‘۔

(بحوالہ ،کتاب اردو ادب کی مختصر تاریخ۔ڈاکٹر انور سدید ،ص106)

بہرصورت ،نصرتی ایک زبردست اور ذہین مثنوی نگار تھا جس نے صنف مثنوی کو ایک معراج عطا کی اور اس کو بامِ عروج تک پہنچایا۔نصرتی نے غزلوں ،رباعیوں اور قطعات میں بھی

کامیاب طبع آزمائی کی تھی۔نصرتی کی غزل، رباعی اور قطعہ میں بیجاپور کا عہد سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔وہ ایک پختہ مشق شاعر تھا جس نے اپنے عہد کی تجسیم اس قدر خوب تر انداز میں کی ہے کہ گمان ہوتا ہے اس دور کو ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں گویا نظارہ درمیاں ہیں:

نازک سی تیری کلیاں سویٹ نہ ہوئے سرانا
بادِ صبا چمن پر گر سرسری لکھے گا
بچھڑنے کی رات سب کے مرے سکھ کی کالی آہ
ہر سر کا بال سانپ دسے مجھ سرانے کا

....

تھا ایک تو رخ رقیب کا میانے پڑے دوتن
اے شاہ نجہ میرے کانجے شوم گھر نکو

....

دن پانچ کے مہماں کو گرفتاری کیا
پر گھر منے عالم کی دل آزاری کیا
نوبت نہ رہے عمر ہزاری ہو مقیم
آخرتو بسا کہ تری یاری کیا

....

کم ذات کو جب کام بڑا ہاتھ آوے
دکھلانے اسی وقت ایں ذات آوے
جوں ذرہ شر انگیز پیوے تو شراب
ہو دل میں سووے مکہ کے تو بری بات آوے

(بحوالہ، کتاب نصرتی کی شاعری، ڈاکٹر طیب انصاری، ص115)

ڈاکٹر طیب انصاری مرحوم نصرتی کی شاعری کا محاکمہ کرتے ہیں۔

''نصرتی اپنے دور کا دیدہ ور شاعر تھا اس کا نظریہ شعری صحت مند اور بامعنی اقدار اور اصولوں پر مشتمل تھا۔اس نے فہم وفراست سے رزم وبزم کو بڑی شان سے سنوارا ہے۔اس نے اپنے

کلام کو اسی نظریۂ شعری کی وجہ سے طاق گردوں پر لے جا کر رکھا ہے جہاں کسی کی رسائی ممکن نہیں''۔

(بحوالہ، کتاب نصرتی کی شاعری، ڈاکٹر طیب انصاری، ص 44)

ملا نصرتی دکن کی ادبی تاریخ کا روشن حوالہ ہے جس کو تاریخ ہر زمانے میں یاد کرتی رہے گی۔ کہ معنی کو تازگی دینے والا ایسا سخنور بھی ارض دکن میں گزرا ہے۔ جس نے شاعری کو نصف النہار تک پہنچا دیا تھا۔

بہ قول نصرتی

ہوا ہے نصرتی جگ میں ہلال سا مشہور
آپس کے قد میں تری بھول کے جب نشان لیا

کتابیں

1۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں
2۔ ڈاکٹر انور سدید اردو ادب کی مختصر تاریخ
3۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے 1857 تک)
4۔ ڈاکٹر طیب انصاری نصرتی کی شاعری
5۔ ڈاکٹر عصمت جاوید زبانِ اورنگ آبادی
6۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس
7۔ مولوی عبدالحق نصرتی
8۔ نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو

ڈاکٹر غضنفر اقبال، شعبہ اردو، سر راجیو گاندھی ڈگری کالج، باسوکلیان، ضلع بیدر (کرناٹک) میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:265-276
Dr. Muzammil Sarkhot, Firaq Gorakhpuri: Ek Nafsiyati Mutalea

مزمل سرکھوت

فراقؔ گورکھپوری: ایک نفسیاتی مطالعہ

کسی شخص کی زندگی اوراس کے کارناموں کے مطالعے میں علم نفسیات ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ خاص طور پر جب ہم کسی تخلیق کار کی زندگی اوراس کے کارناموں کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ تخلیق کار اپنی تخلیق میں اپنے وجدان اوراحساسات سے کافی مدد لیتا ہے بلکہ یوں کہیں تو زیادہ درست ہوگا کہ اس کی تخلیق دراصل اس کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش ہوتی ہے۔ اس تحریر کا مقصد فراق گورکھپوری کی زندگی کے چند مثبت اور منفی رخوں پر نفسیاتی روشنی ڈالنا ہے۔ فراقؔ گورکھپوری کے نفسیاتی مطالعے میں بنیادی بات ان کے انٹرویوز اوران کی بعض تحریروں کی روشنی میں ابھر کر آنے والا وہ نکتہ ہے جس میں فراقؔ کا ہندوستان کے ماضی کے ادب سے والہانہ لگاؤ دکھائی دیتا ہے۔

فراقؔ گورکھپوری اردو کی توانا شعری روایت میں جز و لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے طویل عمر پائی ۔ متعدد معرکے سر کیے۔ انعامات و اعزازات سے سرفراز کیے گئے۔ مشاعروں میں خوب شہرت حاصل کی۔ کامیاب تدریسی کارگزاریاں انجام دیں۔ علاقائی وملکی سطح پر اپنی دانشوری اورشاعری سے منفرد مقام بنایا۔ پنڈت نہرو سے قریب رہے۔ جوش اور متعدد ہم عصر شعرا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اردو تنقید میں بھی اپنی نگارشات اضافہ کیں۔ ہندی اور سنسکرت سے بھی کما حقہ استفادہ کیا۔ ویدانتی فلسفے میں زندگی کی رمق محسوس کی اوراسے ساری زندگی سینے سے لگائے رکھا۔ کوتاہ بینی وکوتاہ اندیشی کو ہمیشہ ناپسند کیا۔ اپنے اصول خود بنائے اوران میں ترمیم کے لیے بھی خود کو آمادہ رکھا۔ انگریزی تو ان کی مادری زبان کی حیثیت اختیار کرگئی

تھی۔ادب میں انگریزی طریقہ تنقید کو پسند کیا اوراس کی مثالوں کو بطور حوالہ درج کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔آخری عمر تک جو صحیح سمجھا اس پر ڈٹے رہنے کے جتن کرتے رہے۔الہ آباد میں رہتے ہوئے بھی گورکھپور کی شناخت قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔یہ ہیں فراؔق گورکھپوری کی زندگی کے روشن پہلو۔سب سے پہلے انہی پر بات کرتے ہیں۔

اگر''آبِ حیات'' کی روایت جاری رکھی جائے اوراسی طرح غزل گوشعرا کی سلسلہ وار درجہ بندی کی جائے تو فراؔق گورکھپوری داؔغ،امیر مینائی،جلیل مانکپوری وغیرہ کے بعد کی فہرست میں اپنا مقام بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔فراؔق کو نظرانداز کر کے ان کے دور کو محیط''آبِ حیات'' جیسی کتاب نہیں لکھی جاسکتی۔ان کی شعری دنیا ایک طرف جہاں قدیم ہندوستانی ادب سے اکتسابِ فیض کرتی ہے،وہیں انھوں نے اردواورانگریزی ادب کی درخشاں شعری روایت سے بھی استفادہ کیا ہے۔وہ قدیم ادب کے سلسلے میں ہندوستان تک محدود رکھنے کے لیے اپنے آپ کو جذباتی طور پر مجبور پاتے ہیں،تاہم یہ بھی کہتے ہیں....

''ہندوستان اور دنیا کے قدیم ترین ادب سے خلوص اور ذہنی بیداری کے
ساتھ میں نے اپنے آپ کو متاثر کیا ہے۔'' 1ؔ

فراؔق گورکھپوری نے بطور خاص اس''کمی''کو محسوس کیا ہے کہ اردو شاعری نے ہندوستانی ادب سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا اور وہ اسی''کمی''کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں مقامیت یا ہندوستانیت کے احساس کو شدید طور پر بسانے کی دانستہ سعی کی ہے۔ان پر ہندوستانیت کی روح اس بری طرح مسلط ہو چکی تھی کہ انھوں نے بعض ایسی خوش فہمیاں بھی پال لی تھیں جو انھیں اس مغالطے میں رکھتی تھیں کہ سوائے نظیر اکبرآبادی کے کسی اردو شاعر نے اس جانب توجہ نہیں کی اوراردو شاعری یہاں اجنبیت کے ساتھ پرورش پاتی رہی ہے۔کہتے ہیں....

''...اردو شاعری نے صدہا جواہر پارے اورامر بانیاں ہمیں دی ہیں لیکن
اردو شاعری نے جس کائنات وشعور کی تخلیق وتعمیر کی ہے وہ بہت ناقص
ہے۔ہم اس کائنات وشعور کو انسانی ثقافت کی بہترین دین نہیں سمجھ سکتے۔

اس سلسلے میں اور باتوں کے ساتھ ساتھ مجھے اس حقیقت کا شدید احساس ہونے لگا کہ ہزار ہا سال سے زندہ رہنے والی ہندوستان کی تہذیب سے اردو شاعری بہت کم ہم آہنگ ہے۔ جب ہم سنسکرت، ہندی، بنگالی، مراٹھی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کی شاعری کی گونج سنتے تھے تو اس میں ایک ہی طرح کی جھنکار اور بو باس پاتے تھے، ایک ہی دل دھڑکتا ہوا سنائی دیتا تھا۔ اردو شاعری ہندوستان کی دوسری زبانوں کی شاعری کے مقابلہ میں غیریت اور اجنبیت کا احساس میرے اندر ابھار دیتی تھی۔'' 2

مجھے نہیں علم کہ فراقؔ صاحب نے دکنی اردو، گجری اردو اور پنجابی اردو کے شہ پاروں کا کتنا مطالعہ کیا تھا؟ بلکہ نثر میں رتن ناتھ سرشار، منشی پریم چند اور ترقی پسندوں کی تحریریں ان کے مطالعے میں آچکی تھیں یا نہیں؟، ولی، میر، سودا، مصحفی، غالب، انیس وغیرہ شاعروں نے کونسی غیر ہندوستانی فضا کی عکس بندی کی تھی؟ اور تو اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی یادگار تصنیف ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' فراقؔ صاحب کی خوش گمانی کو کافی حد تک دور کر دیتی جو انھوں نے اردو شاعری کے تعلق سے پال لی تھی۔ یقین ہے کہ فراقؔ گورکھپوری ان سارے اردو جواہر پاروں سے واقف ہوں گے۔ میرا مقصد فراقؔ کی ان باتوں یا غلط فہمیوں کو رفع کرنا بالکل نہیں ہے۔ وہ آزاد تھے اپنی رائے قائم کرنے میں، اپنے نظریات کی تبلیغ و تشہیر میں۔ ان نظریات یا آرا کی تردید اس مقالہ کا مقصد ہرگز نہیں ہے۔ درج بالا باتیں تو سرسری میں نوک قلم آگئیں ہیں۔ میرا مدعا ان نظریات کے وجود میں آنے کی نفسیاتی وجہ دریافت کرنا ہے۔ فراقؔ کے ان نظریات نے انھیں اپنے خود کے وجود کی دریافت میں مدد کی ہے۔ وہ ازدواجی زندگی میں آسودگی کے جویاں تھے۔ انھیں اس جانب سے ہمیشہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ جائز طور پر اپنی شہوانی خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتے تھے اور ان کی تکمیل بھی چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھیں آسان راستے کی تلاش تھی۔ وہ اردو شاعر کے بیٹے تھے اور خود بھی اردو کے گیسوئے شاعری کے اسیر تھے۔ مطالعہ ان کا غضب کا تھا۔ انھوں نے بطور خاص ویدانتی فلسفے کو خوب سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے سنسکرت شاعری کے اہم رسوں سے واقفیت حاصل کی جس میں انھیں شرنگار رس

نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ شرنگار کے متعلق یہ انکشاف فراق کی شخصیت کے اس تشنہ پہلو کی بہتر ترجمانی کرتا ہے....

> ''سنسکرت اور ہندی کے اساتذہ نے شرنگار کے معنی ''کام'' (جنسی جذبہ) بھی بتایا ہے۔ سنسکرت کے اساتذہ نے شرنگار یا کام کو انسان کی سب سے پسندیدہ بھوک یا ضرورت قرار دیا ہے اور ''کام'' کی لذت کو متبرک، روشن اور فلسفیانہ بتایا ہے........ شرنگار رس کے سلسلے میں ہندوستانی نظریہ یہ ہے کہ یہ سب سے قدیم اور بنیادی رس ہے....... اور اس کو اس لیے عظیم تصور کیا گیا ہے کہ یہ جذبہ دنیا کے ذرّے ذرّے میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ بھگوان بھی اس سے مبرا نہیں۔ کام دیوتا کا تصور اسی احساس کا مظہر ہے۔ اسی لیے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور ادب میں جنسی اتصال کا تصور، ہوس پرستی، عریانی اور فحش نگاری کے دائرے میں نہیں آتا بلکہ اس میں ایک تقدس اور طہارت کا احساس پایا جاتا ہے۔'' 3

اب بات سمجھ میں آئی کہ فراقؔ کو اردو کی ساری شعری روایت میں کیوں ہندوستانیت کی روح مفقود دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جس ہندوستانی فلسفے کی تلاش میں تھے، وہ تو انھیں اردو شاعری یا نثر میں اتنی بے باکی سے مل ہی نہیں سکتی تھی جس بے باکی سے سنسکرت شاعری اور نثر میں مل جاتی ہے۔ بھرتری ہری کی شاعری کا اردو ترجمہ میرے سامنے ہے جس میں شرنگار رس کی مٹھاس ''تقدس وطہارت'' کے احساس کے ساتھ جگہ جگہ جلوہ نما ہے۔ فراقؔ گورکھپوری کو اپنی ناآسودگی کا مداوا مل گیا تھا۔ چنانچہ نہ صرف انھوں نے اپنی شعری کائنات میں اس نظریے کی تشہیر کی بلکہ عملی طور پر بھی وہ اس ''تقدس وطہارت'' سے لطف اندوز ہونے کو زندگی کی معراج سمجھنے لگے۔ فراقؔ صاحب نے اگر کسی فلسفے کو اپنایا ہے تو انھیں اس سے کوئی روک نہیں سکتا تھا، لیکن انھیں کس نے یہ حق دیا کہ وہ اردو شاعری کی روایت کو ناقص یا ناپختہ قرار دیں۔ جس طرح وہ آزاد تھے اپنی شاعری کے موضوعات کے انتخاب میں اسی طرح دوسرے بھی آزاد ہیں اپنے موضوعات کے انتخاب میں۔ وہ چاہے علامہ اقبالؔ ہوں یا انیسؔ ہوں یا کوئی اور۔ فراقؔ کو اپنی شہوانی ضرورت اور اس کی تکمیل کے

ہر جائز ناجائز طریقے کا دفاع کرنا تھا۔سوانھوں نے کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔

اس ذہنی ونفسیاتی پس منظر کے باوجود فراقؔ کی غزل گوئی میں کئی اور موضوعات بھی ہیں ۔عشقیہ موضوعات کے بغیر فراق کی شاعری مکمل نہیں ہوتی تاہم لطیف احساسات و جذبات نیز واقعاتی تنوع کی شاعرانہ وفنی عکس بندی بھی ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کوزندگی سے قریب کرنے اوراسے امر بنانے کی جانب خاص توجہ دی ہے۔

''غزل کے تمام لوازمات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے غزل میں حسن و عشق اوران کے باہمی تعلقات کواس طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی بہترین عشقیہ شاعری اور آفاقی عشقیہ شاعری کا سنگم میری عشقیہ شاعری میں نظر آنے لگے۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ حقیقی معنوں میں میری عشقیہ شاعری حیات نما بھی ہواور حیات آور بھی ہو۔'' 4

علامہ اقبالؔ کی آہِ سحر گاہی نے ان سے اپنے کلام میں وہ تازگی پیدا کی جوان کی پہچان بن گئی ہے۔فراقؔ گورکھپوری بھی شب بیداری یا سحر گاہی کو پسند کرتے تھے۔ان کے کلام کا بیش تر حصہ رات کے آخری پہر میں وجود میں آیا ہے۔کہتے ہیں.....

''میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی، اتنے ہی پرسکون اور حیات افزا اشعار کہنا چاہتا تھا۔ بلکہ یوں کہوں کہ تلخی کوشیریں میں بدل دینا چاہتا تھا۔عام طور پر رات گئے اشعار کہنا شروع کرتا تھااورغزل رات رہے ختم ہو جاتی تھی۔کبھی کبھی تو ایسا ہوا کہ ادھر پو پھٹی اورادھر غزل کا مقطع ہوا۔'' 5

رکی رکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی ۔۔۔ وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست ۔۔۔ تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

تم مخاطب بھی ہو، قریب بھی ہو ۔۔۔ تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی ۔۔۔ کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

آ گئی بادِ بہاراں کی لچک رفتار میں ۔۔۔ موجِ دریا کا تبسم بس گیا رخسار میں

ابھی فکرِ علاجِ عشق نہ کر ۔۔۔ ابھی کچھ دن یہ درد سہنے دے

نکہتِ زلفِ پریشاں ، داستانِ شامِ غم　　　صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کریں

یہ سرُمئی　فضاؤں کی کچھ کنمناہٹیں　　　ملتی ہیں مجھ کو پچھلے پہر تیری آہٹیں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں　　　ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

فراؔق گورکھپوری کو ان کے مجموعہ کلام ''گلِ نغمہ'' کے لیے ہندوستانی ادب کا سب سے بڑا اعزاز ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' دیا گیا۔حکومتِ ہند نے ان کی اردو شعری خدمات کی خاطر خواہ پذیرائی کی ہے۔انھیں اعلیٰ سرکاری اعزاز ''پدم بھوشن'' سے بھی نوازا گیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے بحیثیت وزیر اعظم خود اپنے ہاتھوں سے اردو شاعری کی خدمت کے صلے میں فراؔق صاحب کو ایک شاندار تقریب میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ساہتیہ اکادمی نے فراق کو اپنا فیلو بھی نام زد کیا تھا۔سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور غالب اکادمی ایوارڈ کے بھی فراق صاحب حق دار قرار دیے گئے ۔ یہ اعزازات ان کی شعری خدمات کا اعتراف تھا۔آگرہ یونیورسٹی نے ، جہاں سے انھوں نے ایم اے انگریزی ادب میں پاس کیا تھا، انھیں اعزازی ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا۔ فراؔق گورکھپوری اپنی زندگی ہی میں کامیابیوں کا لطف اٹھا چکے تھے۔ یہ سارے اعزازات انھیں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد تفویض کیے گئے تھے۔حالانکہ ان کا شعری سفر کافی پہلے سے جاری تھا۔تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے کسی قسم کی طمع نہیں رکھی کہ انھیں انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا جائے۔ وہ اپنا کام کیے جا رہے تھے۔اپنے وجدان اور احساس کی ترجمانی کیے جا رہے تھے ۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ ۔ وہ تخلیق کار تھے۔ سودے باز نہیں تھے۔ اپنے فن اور قدروں کی اہمیت جانتے تھے۔ وہ فطری قلم کار تھے، فطری شاعر تھے۔وہ ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو سے کافی قریب رہے ہیں۔ مجھے ایسی کوئی تحریر نہیں ملی اس بارے میں کہ کہیں فراؔق صاحب نے کسی ایوارڈ کے لیے اپنی سفارش کروائی ہو۔ان کے پنڈت نہرو سے تعلقات کی روایتیں آزادی سے پہلے کی تسلسل کے ساتھ دستیاب ہوتی ہیں اور یہ زمانہ پچھلی صدی کی تیسری دہائی کا ہے۔ جب وہ سیاست میں داخلہ لے چکے تھے۔تاہم کچھ عرصے بعد فراق سیاست سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور معاشی استحکام کے حصول میں جٹ جاتے ہیں ۔ یہ پہلو فراؔق گورکھپوری کی زندگی کا تابناک پہلو ہے۔

فراق گورکھپوری نے اردو، فارسی اور سنسکرت کی ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی، اس کے بعد میور سینٹرل کالج سے انٹرمیڈیٹ کامیاب ہوئے اور بی اے الہ آباد یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔انھوں نے مقابلہ جاتی امتحان دیا جس میں وہ کامیاب بھی رہے۔اوران کا انتخاب سول سروس آئی سی ایس میں ہوا۔مگر انھوں نے افسر شاہی کی ملازمت قبول نہیں کی۔حالانکہ اب وہ آئی سی ایس بن گئے تھے،انھیں مطمئن ہوجانا چاہیے تھا، کہ ایک عزت ووقار کی ملازمت حاصل ہوگئی ہے۔لہٰذا زندگی کوایک خاص ڈھرے پر چلانے کا وقت آچکا ہے۔مگر یہاں ان کے سوچتے ہوئے ذہن نے ایک نئی منطق ان کے سامنے پیش کی.......

''قبل اس کے کہ اعلیٰ عہدوں کی کرسی سنبھالتا میں نے یہ بھیانک فیصلہ کیا کہ جب تک رفیقہ حیات میری قسمت میں نہیں ہے تو دولت اورثروت کس کام کی اور میں نے دل شکستگی کے عالم میں کانگریس کی تحریک میں شرکت کرلی۔'' 6؎

چنانچہ کچھ وقفہ سیاسی گلیاروں کی خاک چھانتے رہے۔فراقؔ کانگریس سے ذہنی مطابقت بنا چکے تھے۔وہ دوسرے کانگریسی ورکروں کے ساتھ جیل بھی جاتے ہیں۔ڈیڑھ سال کا عرصہ انھوں نے آگرہ اورلکھنو کی جیلوں میں گزارا۔جس کے صلے میں رہائی کے بعد انھیں کانگریس پارٹی کے اہم منصب پر فائز کردیا جاتا ہے۔وہ کچھ سال اپنی ذمہ داریاں ایمانداری سے نبھاتے ہیں اور پھراس سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔اور تعلیم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ٹاپ کرتے ہیں۔اوراپنے لیے تدریس کا مقدس پیشہ اختیار کرتے ہیں۔فراقؔ گورکھپوری کوسیاسی پلیٹ فارم مل چکا تھااور وہ اپنا نام مجاہدینِ آزادی میں شمار کر سکتے تھے۔پنڈت نہرو کی رفاقت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔فراقؔ چاہتے تو اپنی زندگی کانگریس کے بینر تلے قربان کردیتے۔ان کے پاس اپنے وقت کا سب سے طاقتور سیاسی خاندان تھا۔پنڈت جواہر لعل نہرو کے والد موتی لعل نہرو بھی فراق پر نظرِ التفات رکھتے تھے۔گاندھی جی سے بھی ان کی یا داللہ تھی۔میں یہ بات سمجھ نہیں سکا کہ کیوں انھوں نے اس بہترین موقعے کا فائدہ نہیں اٹھایا؟ کیوں انھوں نے سیاست کے ہنگامے سے دور گوشہ تدریس میں جائے پناہ ڈھونڈ لی؟ ایک بات

یہ سمجھ میں آتی ہے کہ فراؔق اپنے نجی یا خانگی پس منظر کی وجہ سے بے انتہا تناو کا شکار رہے ہیں۔ سیاست میں جانے کا فیصلہ ان کا خانگی حالات ومسائل سے فرار کا معاملہ نظر آرہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ان سخت لمحات میں کہیں نہ کہیں مصروف کار رکھنا چاہتے ہونگے اور انھیں پنڈت نہرو سے تعلقات نے سیاست کی جانب راغب کیا ہوگا۔ مگر یہاں انھیں وہ اطمینان نصیب نہیں ہوا جس کے لیے ان کی روح تڑپ رہی تھی۔ چنانچہ وہ اس سے بھی دور بھاگ جاتے ہیں۔ مگر جائے عافیت کہاں پاتے ہیں؟ تدریس میں۔ سیاست میں جانے کا فیصلہ اگر ان کا حالات سے فرار کا تھا تو سیاست سے فرار کا معاملہ فراؔق کا ذمہ داریوں کی جانب مراجعت کا تھا۔ سیاست سے کنارہ کشی کے سوال پر وہ کہتے ہیں....

> ’’میرے بس کی بات نہیں یہ مکروفریب۔ بارہ سال کی عمر سے ہی مجھے وطن کی محبت کا روگ لگ گیا تھا۔ گاندھی جی، جواہر لعل ان سب کا ساتھ تھا لیکن بہنوں کی شادی، اسی ان چاہی عورت سے ہوئے بچوں کی پرورش، بھائیوں کی دیکھ ریکھ، آمدنی کا کوئی ذریعہ چاہیے تھا۔ میں نے بہتوں کو ناپسند کیا لیکن ذمہ داریوں سے بھاگ نہ سکا۔ اسی نے مجھ سے نوکری کروائی۔‘‘ 7

یہ گوشہ بھی فراق کی شخصیت کا خاصا روشن ہے۔ وہ ذمہ داریوں سے ڈرنے یا تلخ تجربات سے سہم کر گوشہ نشیں ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ میدانِ عمل میں آجاتے ہیں۔ تدریس کو اپناتے ہیں۔ فراؔق سب سے پہلے کانپور کے سناتن دھرم کالج میں اردو اور انگریزی پڑھانے پر مامور کیے جاتے ہیں۔ اور چند سال بعد انھیں الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرار کی حیثیت سے منتخب کیا جاتا ہے۔ فراؔق نے اس یونیورسٹی میں تقریباً ۲۸ سال تک درس تدریس کے فرائض نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیے۔

قانون قدرت ہے کہ دھوپ چھاؤں، خوشی وغم، کامیابی و ناکامی، یسر وعسر، روشنی و تاریکی انسانی زندگی کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ یہ انسان پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کن پہلوؤں سے مزین کرنا چاہتا ہے۔ آیا وہ مایوسیوں میں جینے کو زندگی کی معراج سمجھنے پر مصر ہے یا

آسودگیوں میں حقیقی مزہ پالینے کا ہنر جانتا ہے۔فراقؔ کی زندگی کے ان خوشگوار یادوں کے ساتھ کچھ ناخوشگوار یادیں اور باتیں نیز واقعات جڑے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں کچھ باتوں کی تکرار ہومگر کوشش یہ کی گئی ہے کہ نفسیاتی جائزہ ہی کومرکزِ نگاہ رکھا جائے۔اوراس میں کسی قسم کی تکرار نہ ہو۔فراق کے ہنسنے کھیلنے کے دن تھے، شباب ابھی ابھر رہا تھا کہ کسی رشتہ دار کے توسط سے ان کی شادی طے ہوئی۔شادی ہوجاتی ہے۔مگر یہ کیا؟ ان کی دلہن ان کے تصوراتی فریم سے بالکل مختلف نکلی !۔انھیں دلہن کی صورت پسند نہیں آئی۔

''میری زندگی ایک ناقابلِ برداشت عذاب بن گئی۔میری بیوی میں کوئی اخلاقی عیب نہ تھا لیکن معمولی انسان سے بھی یہ لڑکی کند ذہن اور نااہل تھی۔صورت میں کوئی کشش نہ تھی۔ بلکہ ناپسندیدگی کا اثر پڑتا تھا۔یہ لڑکی گھر کونہیں چلاسکتی تھی۔'' 8

مشہور ہے کہ شادی کے پورے ایک سال بعد تک فراق کو نیند نہیں آئی۔تاہم اب کیا کیا جاسکتا تھا!۔وہ عورت ان کی اردھانگنی بن چکی تھی۔تھوڑے عرصے بعد ان کے والد صاحب منشی گورکھ پرشاد عبرتؔ انتقال کر جاتے ہیں۔فراق پر دکھوں کی بارش ہوجاتی ہے۔والد کی ناگہانی موت سے ان پر گھر کی ذمہ داریوں کا بار آجاتا ہے۔فراق کو اپنے والد کی جانب سے پدرانہ شفقت حاصل تھی۔ان کے چلے جانے کے بعد وہ محبت اوراپنائیت کے لیے ترستے رہے ہیں۔ ان کی سوتیلی والدہ سے انھیں ویسا لگاو پیدا نہیں ہوسکا۔اور بھائیوں نے ہمیشہ انھیں پریشان کیے رکھا۔فراق محبت کے لیے تڑپ رہے تھے، اپنائیت کے اظہار کے لیے بے قرار تھے۔اسی ذہنی کشمکش میں وہ اپنے آپ کو مستحکم بنانے کے جتن بھی کررہے تھے۔اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ایم اے کامیاب ہوئے۔سول سروس امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ان نامساعد حالات میں فراق نے اپنے جذبات واحساسات پر قابو پانے کی کوشش کی۔تاہم ان کے گھریلو حالات انھیں ہر پل پریشان کیے رکھتے تھے۔ پہلے ہی سے ان پر گھر کی ساری ذمہ داریوں نے اپنا آسیب پھیلا رکھا ہے۔نئے سرے سے کسی اور ساتھی کی تلاش اوراس میں اپنی جسمانی، ذہنی اور قلبی تشفی کے سامان کی للک پیدا ہوجاتی تھی، مگراس پر عمل انھیں بے انتہا مشکل محسوس ہوا۔چنانچہ انھوں نے دوسری شادی

کی کوئی سبیل نہیں نکالی۔

''کوئی دوسرا ہوتا تو شاید دوسری شادی کر لیتا یا من مار کر رہ جاتا۔ میں دوسری شادی بھی نہ کر سکا اور تب سے آج تک میری زندگی ایک نا قابلِ برداشت تکلیف اور تنہائی کا شکار رہی ہے۔ پورے ایک سال تک مجھے نیند نہیں آئی۔ عمر بھر میں اس مصیبت کو بھول نہیں سکا۔ آج تک میں اس بات کے لیے ترس گیا کہ میں کسی کو اپنا کہوں اور کوئی مجھے اپنا سمجھے۔'' 9

(یہ باتیں انھوں نے عمر کے آخری پڑاو میں کہیں ہوئی ہیں۔) اس کے باوجود وہ کوشش کر رہے تھے کہ ازدواجی زندگی آسانی کے ساتھ بسر ہو۔ مگر انھیں گھر والوں کی طرف سے کسی قسم کا کوئی اخلاقی تعاون حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ اپنی انا کی تسکین اور شہوانی خواہشات کی تکمیل کے لیے انھوں نے دوسرے راستوں کا انتخاب کیا۔ اس کی وجہ سے خانگی سطح پر اتھل پتھل پیدا ہوگئی۔ گھریلو نا آسودگیوں نے انھیں کوچہ سیاست میں بھی داخلہ دلوا دیا تھا اور اسی راستہ پر چل کر انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سال اسیر زنداں کے تجربات بھی حاصل کیے۔ اور اسی خانگی بے اطمینانی نے فراقؔ کو بادہ خوار بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

فراقؔ گورکھپوری نے تقریباً 86 برس کی عمر پائی۔ ایک بھرپور زندگی انھوں نے گزاری ہے۔ ازدواجی زندگی کی ناکامی نے انھیں تمام عمر پریشان کیے رکھا۔ 1914ء میں ان کی شادی ہوئی۔ اس وقت سے لے کر ان کی زندگی میں معاشی استحکام کے ورود تک یعنی ان کے الہ آباد یونیورسٹی میں مستقل ملازمت تک فراقؔ کسی اہم فلسفے یا عقیدے یا نظریے سے ذہنی طور پر وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ اس دوران البتہ ان کا مطالعہ جاری رہا، ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی رفتہ رفتہ مکمل ہو رہا تھا۔ سول سروس امتحان میں کامیابی اور عمدہ و اعلیٰ سرکاری عہدہ بھی انھیں تفویض کیا گیا مگر اسے انھوں نے قبول نہیں کیا۔ کہتے ہیں......

''بیوی آئی بے حد گنوار، اک دم معمولی۔ وہ افسر کی بیوی کہلا ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے ایسی زندگی اپنانی چاہیے جس میں میری بیوی کھپ سکے۔ بس اسی جھک میں یہ سب چھوڑ دیا۔'' 10

ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ فراق کو اس لیے نہیں پسند آیا کہ ان کی شریک حیات اس قابل نہیں تھی اور تدریس کا اعلیٰ منصب پسند بھی آیا اور اسے انھوں نے گوارا بھی کیا!!! یہاں انھیں بیوی کی قابلیت میں کوئی شبہ نہیں ہوا؟ ۔ یہ بات سمجھ سے بالا ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت تھی کہ انھوں نے الہ آباد میں بیوی کو اپنے ساتھ رکھا۔ مگر کس طرح؟ ملاحظہ ہو......

''اپنی تمام تر شاعرانہ حسیت اور دانشوارانہ ذہانت کے باوجود ان کا اپنی بیوی کے ساتھ بہت ہی عجیب رویہ تھا۔ یا تو ان کے مزاج کی برہمی کے سبب یا پھر ان کی بیوی کے خوش شکل نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی بکھر گئی۔ برسوں تک فراق نے ان سے بات تک نہیں کی۔ بالآخر وہ 1985ء میں اپنے والدین کے پاس چلی گئی (فراق کی ملازمت سے سبکدوشی کے سال۔ مزمل)۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی میں اپنے گھر کے حصوں میں الگ الگ رہتے تھے۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کی سب ضرورتیں بے شک پوری کرتے، مگر یہ تجربہ دونوں کے لیے تکلیف دہ تھا۔'' 11

افسر شاہ بن کر فراقؔ آزادی کے ساتھ جسم کی بھوک (Hunger for Body) مٹانے کے کئی طریقوں کو روبہ عمل لا سکتے تھے۔ تاہم تدریس جیسے مقدس پیشے میں یہ انتہائی مشکل ہو جاتا۔ یہاں انھیں قدم قدم پر ایک آدرش وادی انسان کے روپ میں اپنے آپ کو ڈھالنے کے جتن کرنے پڑتے۔ سماج میں عزت بنائے رکھنے کے لیے اپنی خواہشات کی تکمیل کے ناجائز طریقوں سے بچنا پڑتا۔ طلبا اور ساتھی اساتذہ نیز ادبا و شعرا میں اپنی پاکیزہ ساکھ قائم رکھنے کے لیے ہر پل احتسابی کیفیت سے گزرنا پڑتا۔ لیکن حیرت ہے کہ فراقؔ نے تدریس بھی کی، عزت بھی کمائی، وقار بھی قائم رکھا اور موثر شخصیت بننے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ اور ان ساری بلندیوں کے حصول میں ان کی شراب نوشی یا عیاشی اور ان کی آخری عمر کی بدمزاجی کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بن سکی۔

آخر میں رگھوپتی سہائے ولد منشی گورکھ پرشاد کے فراق تخلص اپنانے کے تعلق سے دلچسپ روایت درج (پیش) کرتا ہوں۔ خود فراق کہتے ہیں...

''مجھے درد دہلوی کے کلام نے اب سے پچیس برس پہلے متاثر کیا تھا۔ منشی

پریم چند مرحوم کا اور میرا ان دنوں مین دن رات کا ساتھ تھا۔ ان کے یہاں ایک رسالہ ''کہکشاں'' آتا تھا۔ اس میں ناصر علی فراق دہلوی جانشینِ دؔرد کا ایک مضمون تھا۔ میں نے اسی نسبت سے فراق تخلص رکھ لیا۔'' 12؎

حواشی:

1) شاعر، دانش ور۔ فراؔق گورکھپوری از پروفیسر علی احمد فاطمی ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی 2007ء ص 13۔14

2) باتیں فراؔق سے....... از سمت پرکاش شوق اسٹار پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹیڈ نئی دہلی 1998ء ص 22

3) رسالہ جامعہ خصوصی اشاعت فراؔق: دیارِ شب کا مسافر مدیر شمیم حنفی ج 93 شمارہ 10، 11، 12 اکتوبر، نومبر، دسمبر 1996ء ص 160

4) باتیں فراؔق سے....... از سمت پرکاش شوق اسٹار پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹیڈ نئی دہلی 1998ء ص 23

5) شاعر، دانش ور۔ فراؔق گورکھپوری از پروفیسر علی احمد فاطمی ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی 2007ء ص 14

6) شاعر، دانش ور۔ فراؔق گورکھپوری از پروفیسر علی احمد فاطمی ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی 2007ء ص 115

7) رسالہ جامعہ خصوصی اشاعت فراؔق: دیارِ شب کا مسافر مدیر شمیم حنفی ج 93 شمارہ 10، 11، 12 اکتوبر، نومبر، دسمبر 1996ء ص 35

8) شاعر، دانش ور۔ فراؔق گورکھپوری از پروفیسر علی احمد فاطمی ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی 2007ء ص 11

9) شاعر، دانش ور۔ فراؔق گورکھپوری از پروفیسر علی احمد فاطمی ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی 2007ء ص 11

10) رسالہ جامعہ خصوصی اشاعت فراؔق: دیارِ شب کا مسافر مدیر شمیم حنفی ج 93 شمارہ 10، 11، 12 اکتوبر، نومبر، دسمبر 1996ء ص 34

11) رسالہ جامعہ خصوصی اشاعت فراؔق: دیارِ شب کا مسافر مدیر شمیم حنفی ج 93 شمارہ 10، 11، 12 اکتوبر، نومبر، دسمبر 1996ء ص 13۔14

12) باتیں فراؔق سے.......از سمت پرکاش شوق اسٹار پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹیڈ نئی دہلی 1998ء ص 191

ڈاکٹر مزمل سرکھوت، شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:277-291
Dr. Ali Abbas, Meer Taqi Meer ki ek Ghazal ki do Qiratein

علی عباس

میر تقی میرؔ کی ایک غزل کی دو قرائتیں

کسی بھی فن پارے کی عام طور پر دو جہتیں قرار دی جاتی ہیں۔ ایک تو اس کی معروضی حیثیت یعنی کہ بظاہر جیسا وہ ہے، اور دوسرے اس کی وہ حیثیت جیسا کہ وہ مختلف پرستاران فن کو ان کی اپنی اپنی ذات کے حوالے سے دکھائی دیتا ہے۔فن پارے کی یہ دوسری حیثیت بڑی ہمہ گیر اور جاودانی ہے، اس لیے کہ یہاں وہ فن پارہ تاریخ کے اس عہد سے نکل کر جس نے اسے جنم دیا تھا، تاریخ کے اس عہد میں داخل ہو جاتا ہے جس عہد میں اسے سمجھا، یا سراہا جا رہا ہے۔فن پارے کی معروضی حیثیت بہ ظاہر مبہم بلکہ بے معنی سی لگتی ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی پرستار فن اسے اپنے اضافی نقطہ نظر کے بغیر دیکھ ہی نہیں سکتا تو پھر محض معروضی حیثیت کے کیا معنی؟ اس اعتبار سے کسی بھی فن پارے کی دو حیثیتیں نہیں بلکہ تین حیثیتیں ہوتی ہیں یعنی ایک تو وہی اس کی نام نہاد معروضی حیثیت، دوسرے اسے دیکھنے کا پرستاران فن کا اپنا اپنا انفرادی نقطۂ نظر، اور تیسرے فن کار کی زندگی اور اس کے زمانے کی وہ سچائیاں جنھوں نے فن پارے کو جنم دیا۔ اور یہی وہ مقام ہے جو بسا اوقات شعر کی تشریح کا جواز پیدا کرتا ہے۔'(1)

''اگر متن کی صحیح خوانی اور اس کے بطن میں چھپے ہوئے معانی کے نیرنگ کو سمجھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں تو آپ کی تعبیر میں کم و بیش وہ ساری گنجائشیں نکل آتی ہیں جو دور بہ دور تفہیم کے مختلف دبستانوں سے منسوب قرار دی جاتی ہیں۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر فن پارے میں یہ گنجائشیں موجود نہ ہوتیں تو قرائتوں کے ان دبستانوں کا وجود میں آنا بھی ممکن نہ ہوتا۔ بڑی اور ہمہ

زمانی تخلیقوں کے اندر موجود معانی کا وفور ہی ان قرائتوں کے ظہور کا سبب بنتا ہے۔"(2)

میر کی جس غزل پر شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر انیس اشفاق نے تشریح و تعبیر کرتے ہوئے متن کی قراءت پر بحث کی ہے اس غزل کا متن درج ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

پہلا مرحلہ

ہر جزر و مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش
کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش

....

ابروئے کج ہے موج کوئی چشم ہے حباب
موتی کسی کی بات ہے سیپی کسی کا گوش

....

ان مغبچوں کے کوچے سے میں کیا سلام
کیا مجھ کو طوف کعبہ سے میں رند درد نوش

....

حیرت سے ہووے پرتوے مہ نور آئینہ
تو چاندنی میں نکلے اگر ہو سفید پوش

دوسرا مرحلہ

کل ہم نے سیر باغ میں دل ہاتھ سے دیا
اک سادہ دل فروش کا آکر سبد بدوش

....

جاتا رہا نگاہ سے جوں موسم بہار
آج اس بغیر داغ جگر ہیں سیاہ پوش

تیسرا مرحلہ

شب اس دل گرفتہ کو وا کر بزور مے
بیٹھے تھے شیرہ خانے میں ہم کتنے ہرزہ کوش

آئی صدا کہ یاد کرو دور رفتہ کو
عبرت بھی ہے ضرور ٹک اے جمع تیز ہوش

....

جمشید جن نے وضع کیا جام کیا ہوا
وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وہ نائے ونوش

....

جز لالہ اس کے جام سے پاتے نہیں نشاں
ہے کوکنار اس کی جگہ اب سبو بدوش

....

جھومے ہے بید جائے جوانان مے گسار
بالائے خم ہے خشت سر پیر مے فروش

بہ استثنائے مقطع میر کی یہ غزل گیارہ شعروں پر مشتمل ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے شعر شور انگیز میں محض سات شعروں کا انتخاب کیا ہے۔ جن میں پہلے دوسرے شعر کے بعد ساتویں شعر سے آخری شعر تک ہے، اور انہیں شعروں کی قراءت اور متن کی تشریح و تعبیر بھی کی ہے۔ جب کہ انیس اشفاق نے درج بالا پوری غزل کی مرحلہ وار قراءت کے ساتھ تمام شعروں کے متن پر بحث کی ہے، انہوں نے دوسرے مرحلے کے دونوں شعروں کو قطع بند قرار دیا ہے تو شمس الرحمن فاروقی نے آخر کے پانچ اشعار کو قطع بند کی صورت میں دیکھا ہے اور اسی کے ماتحت مضمون کی پیش افتاد کو واضح کیا ہے۔

اس غزل کے پہلے دو شعروں کو مربوط بتاتے ہوئے فاروقی نے میر کی سمندر سے گہری دلچسپی کا خصوصی حوالہ دیتے ہوئے سمندر کے پیکر کی تصویر کشی کے اس گونا گونی پہلو پر ان کے تخیل کی حیرت انگیز رسائی کو اجاگر کیا ہے۔ فاروقی دونوں شعروں کی قراءت سے سمندر کی حرکت و سکون اور اس کی گہرائی و پنہائی کے ساتھ شور و فریاد کی تشریح کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''خروش' کے معنی 'شور و فریاد' کے ہیں۔ میر نے لہروں کے اتار چڑھاؤ سے پیدا ہونے

والے شور کو آپس میں ہم آغوش دکھا کر آواز کو جسم دے دیا ہے۔ثبوت بھی موجود ہے۔ کیوں کہ سمندر کی ایک لہر چڑھتی ہوئی آتی ہے،شور برپا ہوتا ہے۔لہر کنارے سے ٹکرا کر واپس جانے لگتی ہے اور پھر شور اٹھتا ہے،لیکن وہ لہرا بھی پوری طرح واپس نہیں ہوئی کہ دوسری لہر چڑھتی آتی ہے اور اس کا شور بلند ہوتا ہے۔اس طرح دونوں طرح کے خروش ایک دوسرے کی آغوش میں گم ہو جاتے ہیں۔''(3)

آخر سمندر میں یہ شور اور ہنگامہ کس لیے برپا ہے۔اس کیفیت کو جاننے کے لیے فاروقی نے میر کے تخیل کو اور قریب سے محسوس کرتے ہوئے اسی شعر کے دوسرے مصرعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''شاید کسی کا راز (محبت،عرفان یا اسی طرح کا کوئی بھاری اسرار) اس کو سونپ دیا گیا ہے اور اس راز کے وزن سے بے قرار ہو کر یا اس کے روحانی اہتزاز کی بنا پر سمندر ایک طرح سے وجد میں آ گیا ہے،لہریں ہم آغوش ہو رہی ہیں اور لہروں کا خروش بھی آپس میں ہم آغوش ہو رہا ہے۔''(4)

فاروقی صاحب دوسرے شعر میں پہلے شعر کے اندر موجود سمندر کے شور وغل اور تلاطم کے پیکر کو وسیع ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور لفظ و معنی کی مشابہتوں کے ذریعے محذوف مفہوم تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں۔

''موج کا قوس نما پیکر ظاہر کرتا ہے کہ یہ موج نہیں بلکہ کسی معشوق کا ابرو ہے،اور بلبلہ، جو آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے،وہ کسی کی چشم تمنا ہے۔جب ابروئے معشوق موج کی شکل میں نمودار ہوتا ہے تو اس کو دیکھنے لیے سمندر بلبلے کی آنکھ سے کام لیتا ہے،یعنی سمندر خود ہی معشوق ہے اور خود ہی عاشق۔پھر سمندر کی تہہ میں جو موتی ہیں وہ کسی معشوق یا کسی حسین کی بات کی طرح آب دار،سڈول اور لطیف ہیں۔وہ سیپ جس میں موتی بند ہیں،کسی کے گوش شوق ہیں،جنہوں نے موتی جیسی بات کو فوراً اپنے اندر رکھ لیا۔۔۔ممکن ہے یہی وہ راز ہے جس نے سمندر کو اس درجہ بے قراری بخش دی ہے۔''(5)

شمس الرحمٰن فاروقی کے اس تعبیر شعر کے بعد ہم انہیں دونوں شعروں کو انیس اشفاق کی

قراءت اور تعبیر کی طرف لے چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ان اشعار میں کیا کچھ نیا مفہوم نکالا ہے یا اسی مفہوم میں مزید معنی پیدا کیے ہیں؟ البتہ فاروقی نے محض ابتدا کے دو شعروں کو اپنے انتخاب میں شامل کیا ہے اور انہیں دونوں کی تشریح و تعبیر بھی کی ہے جب کہ انیس اشفاق نے شروع کے چار اشعار کو نقل کر کے انھیں مربوط قرار دیتے ہوئے پہلے مرحلے میں شامل کیا ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انیس اشفاق نے اس پوری غزل کی مرحلہ بندی کیوں کی ہے اور اس سے غزل کی معنویت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں وہ منطقی استدلال پیش کر رہے ہیں:

''ایک دوسرے سے بہ ظاہر غیر متعلق معلوم ہونے والے ان تینوں مرحلوں کے مابین ربطِ معنیٰ کا لحاظ یوں رکھا گیا ہے کہ پہلے مرحلے میں بہ وسیلۂ استفہام ظاہری منظروں کی تہہ میں نظر آنے والے منظروں کے مرقعے تیار کیے گئے ہیں۔ دوسرے مرحلے میں سلسلہ مفہوم کو گزشتہ سے متعلق اور آئندہ سے مربوط رکھنے کے لیے درمیان میں دو شعروں کو لایا گیا ہے۔ تیسرے مرحلے میں معدوم ہو جانے والے مظاہر کو بدلی ہوئی ہیئتوں میں موجود دکھا کر عبرت کا احساس دلایا گیا ہے اور عبرت کا یہ احساس دلانے میں پہلے مرحلے کے تہہ نشین منظروں کے تئیں پیدا ہونے والے استفہام کو محرک بنایا گیا ہے۔''(6)

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ انیس اشفاق نے مرحلہ وار شعروں میں موجود وقوعوں اور ان کے مابین پائے جانے والے مربوط تخیل کی یافت کا عمل اور شعروں کے بطون میں چھپے ہوئے معانی کو کس طرح منور کیا ہے اور شعر کی قراءت سے متون کی تعبیر میں کیا کیا انکشافات کیے ہیں۔ پہلے مرحلے کے شعروں میں پوشیدہ استفہام کو واضح کرنے کے لیے انھوں نے کس طرح کی تعبیر کی ہے ملاحظہ کیجیے؛

ہر جزر و مد............. یارب کہ یہ ہیں جوش

''استفہام یہ ہے کہ سمندر کی تہہ میں کون سا عالم راز ہے کہ جو موجوں کے جزر و مد سے دست و بغل (دل ہلا دینے والا) شور اٹھ رہا ہے۔۔ یہ بصری اور سماعی پیکر بنا کر شاعر بصورت سوال ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس لرزہ بر اندام کر دینے والے شور کے پیچھے آخر ہے کون؟''(7)

دوسرے شعر میں میر تقی میر نے سمندر کی لہروں کا جو پیکر پیش کیا ہے وہ تلاطم کے ذریعے ایک ایسا متحرک منظر نامہ بن رہا ہے جس میں سمندر کی حرکتوں اور اس میں موجود معنوی تلازموں کو اخذ کرنے میں انیس اشفاق کے استفہامیے کے ذریعے شاعر کی نگاہ میں آنے والی سمندر کی حرکت، موتی اور سیپی کے ساتھ حباب کی ماہئیت اپنی جدید شکل میں سامنے آتی ہے۔اس شعر میں لفظی تلازمہ شمس الرحمٰن فاروقی کی تعبیر سے قریب تر معلوم ہوتا ہے، مگر معنوی ربط میں فرق ہے۔فاروقی صاحب نے اس شعر میں عشق، عاشق اور معشوق کو سمندر یہ قرار دیا ہے اور ہر ایک کے معاشقانہ رویے کے اعتبار سے ہیئت نگاری بھی کی ہے، جب کہ انیس اشفاق نے اس شعر میں موجود معنوی ربط کا اظہار یوں کیا ہے؛

ابروئے کج...............کسی کا گوش

''وہ (شاعر) دیکھتا ہے کہ موج کسی ابروئے خم دار کی شکل بنی ہوئی ہے اور حباب نے آنکھ کی وضع اختیار کر لی ہے۔سمندر کا موتی کسی کا سخن معلوم ہو رہا ہے اور صدف گوش کی صورت معلوم ہو رہا ہے۔اور اب سمندر کا عالم راز اس کی سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ سمندر کی تہہ میں جاندار رہنے والی کچھ بے جان چیزیں موجود ہیں۔یہ راز سمجھ میں آتے ہی اسے ''ڈوب جانے والوں'' کا خیال آتا ہے۔اور ڈوب جانے والوں کا خیال آتے ہی وہ سمجھ لیتا ہے کہ سمندر کے جوش خروش کا سبب کیا ہے۔غزل کا یہی شعر موزوں لفظوں کے درو بست کے ذریعے ایک ایسا بصری پیکر بناتا ہے جو ہمارے حلقۂ نگاہ میں دو منظروں کو ایک ساتھ لاتا ہے۔پہلے ہم محیط آب کو دیکھتے ہیں پھر یہ محیط آب آب محیط نہ رہ کر کارگاہ فنا معلوم ہونے لگتا ہے۔''(8)

شعر میں موجود پیکروں کی صوری مشابہتوں اور مناسبتوں کو واضح کرتے ہوئے پروفیسر انیس اشفاق نے بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے جن کو شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر شور انگیز میں بیان کیا ہے۔البتہ انیس اشفاق نے ان صوری پیکروں اور سمندری مناسبتوں کے ذریعے ذہن کو معدوم ہو جانے والی اشیا کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ انیس اشفاق نے اس غزل کے ابتدائی چار شعروں کو پہلے مرحلے میں رکھ کر تعبیر شعر کو مزید آسان اور متن سے قریب کر دیا ہے۔انہوں اپنی مرحلہ وار تعبیروں کے ذریعے مقدم اور موخر شعروں کے معنوی

ربط کو تلاش کر کے معنی کو منزل سے کافی حد تک قریب کر دیا ہے۔ بہ ظاہر دوسرے شعر میں ''ڈوب جانے والوں'' کا ذکر نہیں ہے لیکن انیس اشفاق نے ان ڈوب جانے والوں کو درج بالا شعر میں دکھایا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے قائم کیے ہوئے مرحلے کی وجہ سے اس میں موجود شعروں کے اندر معنوی ربط کو ملحوظ خاطر رکھا اور اسی کی مناسبت سے تعبیر شعر کے مرحلے کو بھی آسان بنا دیا۔ اب ہم پہلے مرحلے کے تیسرے شعر کی جانب چلتے ہیں؛

ان مغبچوں......................رند دردنوش

پہلے مرحلے کے اس تیسرے شعر کو اگر ہم دیکھتے ہیں تو بہ ظاہر دوسرے شعروں سے اس کا کوئی علاقہ نظر نہیں آتا لیکن انیس اشفاق نے اس شعر کی جو تعبیر پیش کی ہے اس سے شعر کی جامعیت و معنویت پوری طرح اجاگر ہو جاتی ہے۔ اس شعر کی تعبیر میں انہوں نے اپنی شعر فہمی کی بصیرت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے اس کی قرائت کو کس طرح مربوط کیا ہے ملاحظہ کیجیے:

''جب ہم تیسرے مرحلے کے دوسرے شعر پر نظر کرتے ہیں (آئی صدا کہ یاد کرو دور رفتہ کو.........الخ) تو معاً ہمیں خیال آتا ہے کہ یہاں متکلم کون ہے؟ اور ہم داخلی ربط کو وسیلہ بنا کر یہ قیاس کرتے ہیں کہ وہ متکلم شاید یہی 'رند دردنوش' ہے۔ اب اس شعر کے مفہوم پر نظر کیجیے۔۔۔ یہاں ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ کیا رند دردنوش کو طوف کعبہ سے اس لیے مطلب نہیں ہے کہ اسے خوف کعبہ نہیں ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ اسے ایک دن فنا ہونا ہے اور بعد الموت کے مرحلے سے گزرنا ہے (یعنی فرشتوں کے اس سوال سے جب وہ پوچھیں گے کہ تیرا قبلہ کیا تھا) حقیقتاً اس محل پر رند دردنوش موت کی قطعیت اور ناگزیری سے بیگانہ ہے لیکن اسی بایگانگی کا ردعمل اسے اس محل پر متکلم بناتا ہے جہاں وہ ہمیں جمشید اور اس کی ناونوش کی صحبتوں کی یاد دلاتا ہے۔'' (9)

درج بالا شعر کی اس تعبیر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ رند دردنوش کو کعبے کی عظمت اور اپنی رندی کا احساس ہے اور وہ خود کو طوف کعبہ کے لائق نہیں سمجھتا بلکہ کعبے سے بے گانگی ہی میں اپنے لیے عافیت جانتا ہے۔ جب کہ اسے اس بات کا خوف بھی ستا رہا ہے کہ فنا کی صدا کا وہ خود ایک دن متکلم بننے والا ہے۔ بہر حال پروفیسر انیس اشفاق نے پہلے مرحلے کے ابتدائی شعروں میں جو استفہام قائم کر کے قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا اس شعر کی تعبیر کے ذریعے بڑا

منطقی اور استدلالی جواب دے کر پہلے مرحلے میں پائے جانے والے مربوط معانی کے ساتھ فنا کے تصور کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ پہلے مرحلے چوتھے شعر میں بھی فنائیت کا تصور پایا جاتا ہے جسے انیس اشفاق نے مزید روشن کر دیا ہے۔ وہ شعر دیکھیں؛

حیرت سے.....................سفید پوش

اس شعر کو بھی شمس الرحمٰن فاروقی نے نقل نہیں کیا ہے۔اس لیے یہاں بھی ہم انیس اشفاق ہی کی بحث وتنقید کی طرف رجوع کرتے ہیں:

''پرتو مہ کا حیرت سے نور آئینہ بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ روشنی محبوب کے بدن کا انعکاس ہے۔ دوسری طرف محبوب کا سفید پوش ہونے میں فنا کا اشارہ بھی ہے۔ وہ یوں کہ محبوب تو عموماً سرخ پوش ہوتے ہیں لیکن یہاں محبوب سفید پوش ہے اور اس کی سفید پوشی سے ذہن کفن پوشی یعنی موت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔''(10)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ محبوب کی سفید پوشی کس انداز میں میر نے موت کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے اور اس کی تعبیر میں انیس اشفاق نے مفہوم کو کس حد تک آسان بنا دیا ہے۔

کل ہم نے۔..................سبد بدوش

جاتا رہا نگاہ.....................سیاہ پوش

اگر ہم پہلے مرحلے کے چوتھے شعر کو نگاہ میں رکھ کر درج بالا ان دونوں شعروں کی قرائت کو سمجھنے کی کوشش کریں تو اس کے لیے انیس اشفاق اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تشریح وتعبیر ہماری رہنمائی کرے گی۔

بقول انیس اشفاق:

''دل لینے والا وہ گل فروش جس کے سر پر پھولوں کی ٹوکری ہے اسے مزاجاً رنگین اور لباسا خوش پیرہن ہونا چاہیے۔لیکن وہ دیکھنے میں سادہ نظر آرہا ہے۔ادھر پہلے مرحلے کے چوتھے شعر میں محبوب سرخ پوش ہونے کے بجائے سفید پوش ہے۔محبوب کی سفید پوشی اور گل فروش کی سادہ پیرہنی کو دیکھ کر شاعر مبتلائے غم ہے اور اس غم کا اثر یہ ہے کہ اس کے دل کے داغ سیاہ پوش ہو گئے ہیں۔ پہلے مرحلے میں محبوب کا سفید پوش ہوکر سامنے آنا اور دوسرے مرحلے میں محبوب کا

معدوم ہو جانا اور اس کے نتیجے میں عاشق کے جگر کے داغوں کا سیاہ پوش ہو جانا فی الاصل فنا کے المیے کی طرف اشارہ ہے۔'' (11)

شب اس دل گرفتہ.........................ہم کتنے ہرزہ کوش

آئی صدا کہ یاد.............................اے جمع تیز ہوش

ان شعروں کو شمس الرحمٰن فاروقی اور انیس اشفاق دونوں نے نقل کیا ہے اس لیے ان پر دونوں کی تعبیروں سے بحث ممکن ہے اور دیکھا جا سکتا ہے کہ شعروں میں موجود وقوعوں سے قریب تر مفہوم کس کا ہے۔ پہلے ہم انیس اشفاق کی شرح پر نظر کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ان اشعار سے کیا مفہوم اخذ کیا ہے۔

''گل فروش ہمارے ساتھ چند ساعتیں گزار کر چلا گیا ہمیں اس کے چلے جانے کا غم ہوا، اس غم کو بھلانے اور دل کو دنیا کے معاملات کی طرف سے ہٹانے کے لیے ہم نے شیرہ خانے (شراب خانے) جا کر ایک فضول سا شغل (شراب نوشی) اختیار کیا لیکن وہاں شراب سے ہمارا غم غلط نہ ہو سکا بلکہ وہاں پہنچ کر جو کچھ ہمیں سنائی دیا (آئی صدا کہ یاد کرو......) اس نے ہمارے غم کو اور بڑھا دیا۔۔ جسے ہم نے غزل کے تیسرے شعر کے مفہوم کے بیان میں اس مرحلے کا متکلم قرار دیا تھا۔اس شیرہ خانے میں بھی وہی رند دردنوش ہے جسے بزورِ اپنے دل کو وا کر لینے کے بعد اپنے اندر سے ایک آواز آتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے اور یہ آواز اسے دور کے زمانوں کی طرف لے جا کر معدوم ہو جانے والے منظروں کو نگاہ کے آس پاس ان مظاہر کی شکل میں دکھا رہی ہے جو ہیں تو وہی لیکن اپنی ماہیت بدل چکے ہیں۔'' (12)

ذکر کیے گئے دونوں شعروں کو انیس اشفاق نے معدومیت سے ہم کنار کیا ہے اور پورے منظر کو شدید احساس موت سے انگیز کر دیا ہے۔ جو شعر کے بطن میں معنی موجود تھے ان کو ظاہر کر دیا ہے۔اب آیئے شمس الرحمٰن فاروقی کی 'شعر شور انگیز' کی جانب رخ کرتے ہیں جس میں انھوں نے اپنے انتخاب سے تیسرے تا ساتویں شعر کو قطعے کے طور پر برتا ہے۔وہ اس قطعے کی تعبیر کس طرح کرتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

''3/209 تا 7/209 اس قطعے کا مضمون بالکل پیش پا افتادہ ہے۔حسب ذیل نکات

قابل غور ہیں (1) انداز افسانوی اور ڈرامائی ہے اور افسانے کو مبہم اور نامکمل چھوڑ دیا ہے۔ مبہم اس لیے کہ یہ واضح نہیں کیا ہے کہ صدا دینے والا کون تھا...... نامکمل اس لیے کہ یہ ظاہر نہیں کیا کہ اس آواز کا اور ان حقائق کو سن کر جو کہ اس آواز نے بیان کیے، سننے والوں پر کیا اثر ہوا؟ اور نہ ہی متکلم خود اس واقعے کے ذریعے براہ راست ہمیں کوئی سبق سکھانے یا کسی عمل (مثلاً مے نوشی) کے ترک کی تلقین کرتا ہے........ کچھ دوست اپنی دل گرفتگی کو دور کرنے کی غرض سے مے خانے میں جمع ہوتے ہیں، ایک آواز آتی ہے جو گزشتہ مے نوشوں اور مے نوشی کی گزشتہ محفلوں کے گزرنے، اور اس طرح ان صحبتوں کے عبرت ناک اختتام کی تفصیل بیان کرتی ہے۔(2) دل گرفتہ کو ''بزورِ مے'' وا کرنے کی بات بظاہر خوش آئند ہے لیکن پہلے تو یہ غور کیجیے کہ ''بزورِ مے'' میں ایک طرح کا تشدد، ایک طرح کا جبر ہے۔ اور یہ کہ دل اس قدر گرفتہ ہے کہ زور صرف کیے بغیر وا ہو بھی نہیں سکتا۔ لیکن دوسرے مصرعے میں انہیں لوگوں کو جو دل گرفتہ کو بزورِ مے وا کر رہے ہیں ''ہرزہ کوش'' یعنی فضول کام کرنے والا کہا ہے۔ یعنی دل گرفتہ کو وا کرنے کی کوشش یا وا کرنے کا عمل در اصل ایک کارِ فضول ہے۔(3) پھر ان لوگوں کو تیز ہوش کہا گیا ہے۔ یہ طنز بھی ہو سکتا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ جو شخص ان کو پکار رہا ہو وہ ان کی تعریف کر کے یا ان کی غیرت کو متوجہ کر کے اپنی بات کو سننے کے لیے انہیں پوری طرح تیار کر رہا ہے۔''(13)

اب آیئے ہم دوبارہ میر کی غزل کے اگلے شعر کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس میں انہوں نے کیا کہا ہے اور اس سے ان دونوں شارحین نے کیا کیا نتائج اخذ کیے ہیں۔ اور کس کا مفہوم شعر کے متن سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

جمشید جن نے وضع کیا............ وہ نائے و نوش

اس شعر کے بطن میں پوشیدہ معنی کو جاننے کے لیے پہلے ہم انیس اشفاق کی قراءت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ انہوں نے اس کے کیا معنی اخذ کیے ہیں:

''بقیہ تین شعروں میں عبرت دلانے کی غرض سے شاعر نے جو بصری پیکر بنائے ہیں اور ان پیکروں کے وسیلے سے تضادوں اور مناسبتوں کی جو شکلیں پیدا کی ہیں وہی دراصل غزل کا حاصل ہیں۔ اب ان متضاد صورتوں اور مماثلتوں کو ملاحظہ کیجیے۔ دنیا میں نہ تو جام وضع کرنے والا

جمشید ہے نہ اس کی ناؤ نوش کی صحبتیں۔اب یہ لوازم اپنی سابقہ صورتوں میں نہ دکھائی دے کر دوسری شکلوں میں نظر آ رہے ہیں۔ باغ میں کھلا ہوا لالہ جمشید کا جام ہے اور کوکنار اس کا سبو۔ واضح رہے کہ لالے کی شکل جام کی سی ہوتی ہے اور کوکنار صراحی سے مشابہ ہوتا ہے۔۔۔اگرچہ ان کا تعلق شراب سے نہیں ہے لیکن معنا دونوں نشہ آور ہیں، کوکنار یعنی پوستہ لالے کا ظرف ہے اور جب پوستے میں چاک لگا دیے جاتے ہیں تو اس میں افیم بننے لگتی ہے۔شراب کا نشہ ہنگامہ کن ہوتا ہے لیکن افیم کے نشے میں فعالیت بالکل نہیں ہوتی۔ان دو متضاد صورتوں کو رکھ کر شعر کے جزئی مفہوم پر نظر کیجیے کہ کہاں جمشید کی صحبتوں کی رونقیں اور ہاؤ ہو اور کہاں حرکت اور عمل سے محروم بدلی ہوئی ہیئتوں میں سامنے آنے والی یہ صورتیں (لالہ اور کوکنار) (14)

اب دیکھتے ہیں کہ درج بالا شعر کی تعبیر شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا کی ہے اور وہ متن شعر سے کس حد تک قریب ہے:

''جمشید کو جام کا وضع کرنے والا کہا گیا ہے، جمشید کا ذکر پہلے کیا ہے یعنی جام بنانے والا یا بنوانے والا مقدم ہے، اس کی مصنوع موخر۔ جمشید اور اس کی صحبت ناؤ نوش تو جام کے بغیر بھی تھی اور جام کی زندگی جمشید کے بعد بھی باقی رہ سکتی تھی، اس لیے پہلے جمشید کے خاتمے کا بیان کیا، پھر کہا کہ اس کا جام بھی باقی نہیں۔ ہاں لالے کا پھول (جو جام سے مشابہ اور شراب کے رنگ کا ہوتا ہے) باقی رہ گیا۔ یعنی جمشید بھی مٹ گیا اب اگر کوئی جاننا چاہے کہ وہ کیسا رہا ہوگا، تو بس لالے کا پھول دیکھ لے۔ یہ ضرور ہے کہ اس سے افیون پیدا ہوتی ہے جو مسکن اور بے ہوشی آور ہے۔ لہذا ایک طرح سے وہ جمشید کے جام جہاں نما پر ایک زہر خند ہے۔۔۔لالے میں چونکہ سیاہ داغ ہوتا ہے، اس لیے اس کی مناسبت سے ''نشان'' بہت خوب ہے، افیون کا تلازمہ محض قیاسی نہیں ہے، کیوں کہ اگلے مصرعے میں 'کوکنار'' کا ذکر کیا گیا ہے۔''(15)

یہاں پر شمس الرحمٰن فاروقی کے درج بالا بیان کیے گئے شعروں کے مفہوم سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، البتہ وہ لفظوں کی تہہ میں اتر کر معنی کی جستجو میں ضرور کامیاب ہوتے ہیں لیکن شعر کے بطن میں چھپے ہوئے مطلب کو قاری کے ذہن سے ہم کنار کرنے میں قاصر نظر آتے ہیں۔ بعض موقعوں پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ لفظ کے معنی کے ذریعے شعر کے مفہوم تک پہنچنے والے ہیں مگر اس سے

پہلے ہی کسی اور لفظ کی تہہ میں اتر جاتے ہیں اور اس طرح شعر اپنی تعبیر وتشریح سے تشنہ رہ جاتا ہے۔

جھومے ہے/ ہیں بید.........................پیرمے فروش

اس شعر کو سمجھنے کے لیے پہلے ہم شمس الرحمٰن فاروقی کی تعبیر شعر کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اس سے کیا نتیجہ نکالا ہے اور شعر سے معنی کا علاقہ کتنا قریب ہے:

''بید کو مجنوں سے تشبیہ دیتے ہیں، لہٰذا جوانان مے گسار کی جگہ بید کا جھومنا حرماں نصیبی اور عبرت ناک انجام کا اشارہ ہے۔ بید کو بید مجنوں کہنے کی تین وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ بید کی پتیاں بہت بکھری بکھری اور جھکی ہوتی ہیں اور آشفتہ گیسو کی یاد دلاتی ہیں، پھر بید کا درخت بہت نازک اور ہلکے تنے کا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہلکا ہونے کے باعث یہ درخت ذرا سی ہوا میں بھی لرزش میں آجاتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ اس کی پتیوں سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ جوانان مے گسار اور بید کے جھومنے میں جو مشابہت ہے وہ خوفناک اور دردانگیز تاثر رکھتی ہے۔ خشت خم وہ اینٹ ہوتی ہے (یا کوئی بھاری چیز) جس سے شراب کے مٹکے کا منھ بند کرتے ہیں۔ پیرمے فروش کی کھوپڑی جس خم کے لیے خشت کا کام کر رہی ہے، اس خم میں کیسی شراب ہوگی اس کا تصور بھی محال ہے۔ سارا مے خانہ اجڑ گیا ہے۔ شاید کسی حملہ آور فوج نے مے نوشوں، ساقیوں، سب کو تہہ تیغ کر ڈالا ہے۔ اور بوڑھے پیر مغاں کا سر کاٹ کے خم مے پر رکھ دیا ہے۔۔۔ تباہی اور ویرانی کے لیے اس سے بڑھ کر استعارہ کیا ہوگا۔۔۔ ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ زمانی بدلا ہے کل جو میرمے کدہ اور پیر مغاں تھا، اس کا سر کاٹ کر خشت خم بنا دیا گیا ہے۔ اب نئے ساقی اور نئے بادہ گسار ہیں، کل کو ان کا بھی شاید یہی حشر ہو۔'' (16)

اسی شعر کی انیس اشفاق نے کس طرح قراءت کی اور اس سے کیا مفہوم اخذ کیا اور اپنے بنائے ہوئے مرحلوں سے کس حد تک استفادہ کیا ہے، ملاحظہ کریں:

''یہاں پردہ نگاہ میں جھومتا ہوا بید ہے لیکن پس پردہ نگاہ جوانان مے گسار ہیں۔۔۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں خم کے اوپر رکھی ہوئی اینٹ اصلاً اینٹ نہیں پیرمے فروش کا سر ہے۔ یہاں خم اور پیرمے فروش میں صوری مناسبت ہے۔ بید، لالہ اور کوکنار کا تعلق باغ سے ہے جو شراب خانے کے باہر کا منظر ہے اور خم کے اوپر رکھی ہوئی اینٹ شراب خانے کے اندر کا منظر ہے

جہاں اس خم کے گرد بیٹھے ہوئے میخوار صحبت ناونوش گرم کیے ہوئے ہیں۔لیکن یہاں بھی شاعر نے بیرونی اور داخلی منظروں کے تضاد میں ایک معنوی تعلق پیدا کر دیا ہے۔۔۔۔۔دور و نزدیک کی نسبتوں کے ذریعے بیان ہونے والے اس منظر کی انتہا تک پہنچتے پہنچتے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ جب خم کے گرد بیٹھے ہوئے مے گساروں کو یہ بتایا گیا ہوگا کہ خم کے اوپر رکھی ہوئی اینٹ، اینٹ نہیں پیرِ مے فروش کا سر ہے تو اپنے یقینی انجام کو دیکھ وہ سب گھبرا کر کھڑے ہو گئے ہوں گے۔۔۔اس طرح مرحلہ بہ مرحلہ سکون سے حرکت کی حالت میں آتا ہوا یہ منظر جب اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو ہم پیر مے فروش کے سر کی صورت میں متعلقین مے خانہ یعنی موت کی ناگزیری سے بیگانہ رہنے والوں کا عبرت ناک انجام اپنی انتہائی شکل میں دیکھتے ہیں۔''(17)

اب آیئے اس پوری غزل کے نتائج کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انیس اشفاق کی قراءت اور شعری تعبیروں سے برآمد ہونے والے نتیجے ہمیں غزل کے متن سے کہاں تک قریب کرتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پوری غزل سے انہوں نے موت اور فنا کا تصور پیش کرتے ہوئے اسے مختلف پہلوؤں سے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔لیکن وہ کہاں تک درست ہے۔اس کے لیے پہلے ہمیں ان کے برآمد کیے ہوئے نتیجوں کو دیکھنا ہوگا:

''سمندر کی تہہ میں نظر آنے والے منظروں کے تئیں پیدا ہونے والے استفہام سے شروع ہو کر یہ غزل خوش آہنگ بصری اور سماعی پیکروں کی تعمیر کے ذریعے مختلف مرحلوں کے متضاد معنوی تاثرات میں اندرونی ربط پیدا کرتی ہوئی بالآخر ہمیں اس المیہ نظام تک لے جاتی ہے جس کی گرفت سے نکلنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔۔۔میر کا حسن کمال یہی ہے کہ پوری غزل فنا اور زوال کا ایک ایسا متحرک استعارہ بن جاتی ہے جس میں طرح طرح کے مفاہیم پیدا ہونے کی گنجائش نکل آتی ہے۔اس لیے یہ غزل تعبیر کے بعد بھی تشنہ تعبیر ہے۔''(18)

زیر بحث میر تقی میر کی غزل کی جو نمایاں خصوصیت ہے وہ یہ کہ تقریباً تمام اشعار ایک ہی موڈ کی عکاسی کرتے ہیں، جس کی طرف پروفیسر انیس اشفاق نے اپنی قراءت اور تعبیر کے ذریعے اشارہ کیا ہے۔یعنی موت کا استعارہ اور فنا کا متحرک منظر نامہ، جیسے جیسے غزل اپنے اختتام کو پہنچتی ہے ویسے ویسے موت کی شدت اور اس کا بصری پیکر قاری کے سامنے مزید نمایاں ہوتو جاتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی اور انیس اشفاق کی قرائتوں اور شعری تعبیروں کے حوالے سے میر کی اس غزل کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ ایک ہی غزل کی دو قرائتوں اور دو حیثیتوں سے اس کی تشریح وتعبیر ہونے پر غزل کی معنویت اور اس کی ہمہ جہتی میں کتنی وسعت پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہاں پر جس طرح دونوں شارحین غزل نے میرؔ کی اس غزل پر ہمہ گیر بحث کر کے معانی اور مفاہیم کو روشن کیا ہے اس سے عام قارئین میر کو میر کے متن کی تفہیم میں آسانی ہوگی۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ کسی بھی غزل کو سمجھنے کے لیے ہمیں شعروں کے درمیان موجود وقفوں اور خلاؤں کو کس طرح پر کرنا چاہیئے۔ یہ خلا اور وقفے کو پر کرنے کا عمل اظہار بیان میں موجود ان تضادوں کو دور کرتا ہے جو کسی متن میں کہے اور ان کہے کے درمیان ہوتا ہے۔ لیکن اس درمیانی خلا کو پر کرنے سے پہلے اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ شعروں کے درمیان معنوی ربط اور تسلسل کا ایک دوسرے سے کیا علاقہ ہے۔ جبھی ہم کسی فن پارے کو جزومقدور کے ذریعے معنی محذوف کو پالیتے ہیں اور پورے فن پارے میں حرکت وعمل کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔

جب ہم دونوں شارحین غزل کی شرحوں کو پڑھ کر دوبارہ میرؔ کی اس زیر بحث غزل کو پڑھتے ہیں تو اس کا لطف کس قدر دوبالا ہوجاتا ہے اور ہر شعر اپنے معنی کے جواہر ہم پر کس طرح لٹاتا ہے اس کا احساس خود کیا جاسکتا ہے۔

حوالے

(1) بہادر شاہ ظفر، ڈاکٹر اسلم پرویز ص 362-361 انجمن ترقی اردو، ہند 1986

(2) (بحث وتنقید، پروفیسر انیس اشفاق۔ ص 9 اشاعت 2009)

(3) شعر شور انگیز جلد دوم ص 282

(4) ایضاً

(5) ایضاً

(6) بحث وتنقید ص 10

(7) ایضاً ص 10-11

(8) ایضاً

(9) ایضاً ص 12

(10) ایضاً ص 13

(12) بحث و تنقید ص 14

(13) شعر شور انگیز ص 284

(14) بحث و تنقید ص 14

(15) شعر شور انگیز ص 285

(16) شعر شور انگیز ص 286

(17) بحث و تنقید ص 16-15

(18) ایضاً ص 16

ڈاکٹر علی عباس، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:292-325
Dr. Sarfaraz Javed, Ghalib aur Ghalibiyaat: Ek Mutalea

سرفراز جاوید

غالب اور غالبیات : ایک مطالعہ

پروفیسر عبدالحق عصر حاضر کے ادب میں ایک متبحر شخصیت کا نام ہے۔ ماہرین اقبالیات میں انھیں کما حقہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ مگر جب ان کے علمی و تحقیقی کاموں پر نظر پڑتی ہے تو ہماری حیرتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ اقبالیاتی مطالعہ میں منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ درحقیقت ہند میں اقبال شناسی کی تحریک کے وہ رود رواں ہیں اور سنگِ نشاں بھی۔ اقبال ان کے رگ و پے ہی میں ہے۔ وہ رموزِ اقبال کے رازدانوں میں بھی منفرد ہیں لیکن اردو کے کلاسیکی ادب پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی 43 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جو ادبی حلقے میں بحث و مباحثہ کا موضوع بنی اور شہرت سے ہم کنار ہوئیں۔ اقبالیاتی مطالعہ سے ایک جست لگائی تو قدیم متون کی تدوین و ترتیب میں قابلِ ذکر کام کیا۔ حاتم کے دیوانِ قدیم کے ساتھ دیوان زادہ اور اکرم قطبی کے تیرہ ماسہ کی اشاعت نے ادبی تاریخ کے احوال و مقام میں خوش گوار اضافہ کیا۔ دنیا میں موجود واحد قلمی نسخہ فارسی کے تذکرہ الٰہی کو تین جلدوں میں شائع کیا۔ یہ عہدِ شاہجہاں کا تذکرہ ہے۔ ولی اور آبرو کے قلمی نسخہ کو اہل نظر سے متعارف کرایا۔ نصابی لغت تیار کردی، قدیم پر قناعت نہ کر کے عہدِ وسطیٰ پر متوجہ ہوئے تو عہدِ غالب کو ہدف بنایا۔ عہدِ شبلی کا بھی احاطہ کیا۔ تاریخی تسلسل کا یہ حیرت خیز مطالعہ ہے۔ جو جنسِ گراں کی طرح نادر ہے اور نایاب بھی۔

اقبال کے ابتدائی افکار، اقبال اور اقبالیات، اقبال شاعرِ رنگیں نوا، اقبال کا حرفِ شیریں، متن شناسی، اقبال کے شعری اسالیب، دیوان زادہ، تذکرۂ الٰہی وغیرہ ایسی کتابیں ہیں۔ جو ادب کے طالب علموں، ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ کے استفادہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ انہوں نے

علمی وتحقیقی کام کو اپنی زندگی کا مقصدِ حیات بنا رکھا ہے۔ اور وہ اپنے اشتیاق کی تسکین کے لیے ہمہ وقت تصنیف وتالیف اور ترتیب وتدوین کے کاموں میں مصروف ہیں۔ مزید ان سب سے بڑھ کر نوجوان نسل کی تربیت اور حوصلہ افزائی بھی کر رہے ہیں۔ جس سے نئی نسل کے جنبشِ قلم میں روانی وجولانی پیدا ہو رہی ہے۔ دراصل ان کے مخاطب جواں سال طلبا ہیں۔

اقبال سے صرفِ نظر کر کے غالبیات کے حوالہ سے عبدالحق کے اسالیب فکر وفن کو پرکھنے کی عمومی سی کوشش ہے۔ اس کتاب کا ہر عنوان تفصیل کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر راقم نے چند مضامین پر طائرانہ نظر سے حاصل تاثرات قلم بند کیے ہیں مطالعہ کو مربوط کرنے کے لیے حوالوں سے استفادہ ناگزیر تھا۔ راقم نے بہ ظاہر تبصرہ لکھا ہے۔ لیکن تبصرہ کے ساتھ صاحب کتاب کی شخصیت، علمی خدمات اور اسلوبِ تحریر پر بھی جا بجا اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ جس سے ان کا ہر قاری دوچار ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی ادبی مطالعہ میں تسلیم شدہ ہے کہ تحریر سے صاحبِ قلم کے احوال وآثار یا درونِ دل میں پوشیدہ تصورات لفظوں کے بین السطور ظاہر ہوتے ہیں۔ عبدالحق کی تحریروں میں ان کی شخصیت کا تقریباً ہر پرتو بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ ان سے دید وشنید کے بغیر تحریری عبارتوں سے ذکر وفکر یا شخصیت کی ایک شبیہ بہ آسانی بنائی جا سکتی ہے۔ غالب اردو ادب کا بڑا شاعر ہے۔ جس کے کلام میں معانی ومفاہیم کی بڑی گہرائی ہے۔ جو ابتدا سے ہنوز اردو قارئین اور ناقدین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کیونکہ کلام غالب کی معانی تہہ داری زمانہ سے ہم آہنگ ہو کر اپنے قارئین اور ناقدین کو مختلف جہات سے روشناس کراتی رہتی ہیں۔ غالب کے نقد وانتقاد کا معاملہ عہد غالب سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ کیونکہ ادبی مذاق رکھنے والے معاصر دوست واحباب نے اعترافات اور اعتراضات کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ غالباً غالب نے یہ شعر اپنے معترضین کی خدمت میں ہی میں پیش کیا تھا؛

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالب تخلیقی تنوع کی علامت اور ہمارے تہذیبی اظہار کا نشان ہے۔ اقبال نے صحیح لکھا ہے کہ دنیائے تخلیق میں غالب برِ صغیر کی مسلم ثقافت کا نذرانہ ہے۔ غالب کی شاعری صرف

سرشار ہی نہیں کرتی ہمیں افتخار بھی بخشتی ہے۔ یوں تو غالب پر سوانحی اور تنقیدی نوعیت کی اساسی کتاب حالی کی 'یادگار غالب' ہی ہے۔ جو غالب پر اولین مثبت و تعمیری قدم تھا۔ بعد کے ناقدین اور شارحین نے اس کتاب سے کسب فیض کیا۔ اور یہ عمل غالب کی معنوی تہہ داری کے باعث ہنوز جاری ہے۔ غالب کے کلام سے حالی نے صرف جلد متبادر ہونے والے معنوں پر ہی توجہ مرکوز کی تھی۔ مگر جیسے جیسے زمانہ اپنی پیچیدگیوں کے ساتھ ارتقا پذیر ہے۔ اسی طرح غالب کے کلام میں نئے نئے معنوی ابعاد اپنے تنوع کے ساتھ منظر عام پر آ رہے ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری کی کتاب 'محاسن کلام غالب' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جسے غالب کے حوالہ سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر تفہیم غالب میں محتاج وغریب ہے۔ کیوں کہ اس میں توصیفی بیانات کے علاوہ کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ ہاں شیخ محمد اکرام کی 'آثار غالب' تعین ادوار کے حساب سے دستاویزی حیثیت کی حامل ضرور ہے مگر نقد کا پہلو تشنگی کا احساس دلاتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'تفہیم غالب' استفہامیہ انداز کی شرح ضرور ہے۔ جو قاری کے ذہن کی استفہام سازی تو کرتی ہے۔ تاہم معانی ومفاہیم کی گتھیاں اچھی طرح وا نہیں کرتی۔ خورشیدالاسلام کی کتاب 'غالب' اور جیلانی کامران کی کتاب 'غالب کی تہذیب وشخصیت' ان دیگر کتب سے قدرے بہتر ہے۔ مزید تا حال جتنی بھی کتابیں غالب کے حوالے سے منظر عام پر آئی ہیں۔ وہ سب تفہیم غالب کے سلسلہ میں تشنہ ہیں۔ کیونکہ غالب جیسے بڑے شاعر کا راز قیاسات کو تقویت دیتا ہے۔ جو زمانہ اور حالات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر نئی نئی تعبیرات فراہم کرتا رہتا ہے۔

عبدالحق کی یہ کتاب غالب کے تعلق سے 10 مضامین پر مشتمل ہے۔ مگر اس میں بہ طور ضمیمہ تین مضامین بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کے عرض حال کے مطالعہ سے یہ بات تصدیق کو پہنچتی ہے۔ کہ ایک معتبر متبحر ادب شناس شخص علم سے جتنا ثمر بار ہوتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت میں اسی قدر عجز وانکسار کا پیکر بھی ہوتا ہے۔ ان کا یہ تحریری اعتراف لائق توجہ ہے؛

'ناچیز سے جتنا بن پڑا اقبال سے نباہنے کی کوشش کی۔ مگر غالب کا حق ادا نہ ہوسکا۔ سفینۂ عمر جب کنارے آلگا تو احساس ندامت کے بار کو سبک کرنے کے

لیے ناتواں اور ناتمام تحریروں کو جمع کرنے کا خیال آیا یہ تاثرات ہیں اور کم عیار بھی۔'(عرض حال،ص6)

غالب اس اعتبار سے اپنے عہد کا بڑا خوش قسمت شاعر تھا کہ اس کی زندگی میں ان کے کلام کے غالباً ترمیم واضافہ کے ساتھ چھ بار دیوان شائع ہوا۔مگر ان سب میں نسخۂ حمیدیہ کو بڑا اعتبار حاصل ہوا ہے۔ پروفیسر عبدالحق کی تحویل میں دیوانِ غالب کا ایک نادر مخطوطہ ہے۔ انہوں نے اسی کی بنیاد پر یہ تحقیقی مضمون 'دیوانِ غالب کا ایک اہم مخطوطہ' تحریر کیا ہے۔جو ان کے تحقیق وتدوین سے شغف اور تجربہ کا حامل ہے۔وہ اس میں اپنی تحقیقی دشواریوں اور اسناد کے حوالہ سے رقم کرتے ہیں؛

'تحقیق میں خطی نسخوں کی دریافت اور ان کا استناد ایک سنگین مسئلہ ہے۔اگر فن کار کا تیار کردہ یا اصلاح کردہ نسخہ موجود نہیں ہے مسائل اور بھی پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔تدوین کی راہیں مسدود اور مشتبہ ہو جاتی ہیں۔غالب کی زندگی میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔اس لیے دیوان کی ترتیب وتدوین میں مشکلات کم سے کم ہیں۔مگر بار بار کی اشاعتوں سے متون میں معمولی فرق کا آجانا ایک فطری اور غیر شعوری ہوتا ہے۔خود قلم کار کے ہاتھوں سے تبدیلی میں ایک آزمائش ہوتی ہے۔'(ص10,11)

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی کلام کے بار بار شائع ہونے سے متن (Text) کی صحت میں تبدیلی کا پیدا ہو جانا فطری اور لاشعوری عمل ہوتا ہے۔اسی لیے محقق کے لیے مختلف متون کی موجودگی میں صحت کے اعتبار سے حتمی رائے قائم کرنا بھی شک سے ماورا نہیں ہو سکتا۔خود مصنف بھی اس کا مرتکب ہو سکتا ہے۔غالب نے اپنے کلام کو انتقادی نظر سے پرکھا،اور حذف والحاق کے بعد انتخاب مرتب کر دیا تھا۔مگر بعد میں جو نسخے دستیاب ہوئے،وہ صحت کے اعتبار سے ہنوز متنازع فیہ ہیں۔مزید محققین کے لیے نفسیاتی طور پر علمی وقار کا مسئلہ بھی بنے۔جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں؛

'ایک اور متنازع مخطوطہ کا ذکر کرنا مناسب ہوگا،جسے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے

بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ انھوں نے دیوان غالب نسخۂ خواجہ (خواجہ منظور حسن) کو 2000ء میں شائع کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نسخۂ لاہوری ہے، جس کا تعارف ڈاکٹر سید عبداللہ کرا چکے تھے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن میں ٹھن گئی۔ اس بحث کے طفیل کئی اور تصانیف شائع ہوئیں۔ غالب شناس دو صفوں میں زور آزما ہوئے سطحی اور شخصی تنقید سے دیوان کا وقار مجروح ہوا۔ ہندوستان میں نسخۂ امروہہ پر بھی ہنگامہ ہوا۔ ایوان بالا تک بات پہنچی تھی مگر غالب شناسی میں اضافہ ہوا۔ دو نسخوں کی اشاعت اور ان پر جاری بحث سے غالب شناسی کو ایک جہت ملی اور شہرت بھی۔' (ص 12-11)

انھوں نے اس قلمی نسخہ سے غالب کے عہد کے رسم الخط کی املائی صورت پر بھی توجہ دی ہے۔ اس کے علاوہ اہم بات یہ ہے کہ دیگر نسخوں سے تقابل بھی کیا ہے۔ جس میں اختلافات، لفظی ترمیم، املائی صورت، حرف جار کی تحریف، اشعار کا تقدم و تاخر اور غزلوں میں تعدادِ اشعار کی کمی بیشی کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں خطی نسخہ کی قدامت کو سراہا ہے۔ اور دیگر نسخوں سے تقابل کرنے کے بعد بہت سے اختلافات کو نشان زد بھی کیا ہے۔ باوجود اس کے ادعائیت سے گریز کیا ہے۔ کیونکہ تحقیق میں کوئی بھی دعویٰ حرف آخر نہیں ہوتا۔ اور وہ بھی اپنے تحقیقی نتائج کو بہ حسن خوبی پیش کرنے کے باوجود، عجز و انکسار کا دامن نہیں چھوڑتے:

'متن میں اختلاف و اضافے کی صورت نے ایک نئی ترتیب و تدوین کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ خاکسار نے مخطوطہ اور متداول کا سرسری تقابل کیا ہے۔ پورے کلام کے مطالعہ سے اور بھی اختلاف نشان زد کیے جاسکتے ہیں۔ راقم اس موضوع کا اہل نہیں ہے اسی سبب ایک طالب علمانہ مطالعہ پر اکتفا کیا ہے۔' (ص 22)

انھوں نے خارجی طور پر نسخہ کی بوسیدہ حالت کو بھی بیان کیا ہے۔ مزید چند نسخوں کے تقابل کی رو سے کلام غالب کی ازسرنو تدوین پر زور دیا ہے۔ جس سے نسخوں کے متن کے اختلافات کو رفع کیا جاسکے۔ اور ایک جامع تصحیح شدہ متن قارئین کو حاصل ہو سکے۔ اسی سیاق میں وہ

امید ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی مرد مجاہد اس کام کو انجام دے۔ کیوں کہ صحیح تحقیق کے بغیر کسی کلام پر تنقید کا اطلاق بے معنی ہو جاتا ہے۔ مزید اس کے افکار و اسالیب کا تعین بھی بے سود ثابت ہوگا۔ پروفیسر عبدالحق نے اپنے تحقیقی تجربات کی روشنی میں عرشی اور نسخہ حمیدیہ کو بھی معاون ضرور مگر نامکمل مانا ہے۔ وہ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

'ان بزرگوں کی کچھ مجبوریاں بھی تھیں۔ یہ اگلے زمانے کے لوگ ہیں یہ پون صدی پہلے کی کوشش ہے جو مواد موجود تھا اس پر تدوین کی بنیاد رکھی گئی۔ تحقیق وتدوین کے جدید تر اصول ان کے پیش نظر نہ تھے۔ ان سے جو بن پڑا، بہتر طور پر انجام دیا۔ کسی فرد سے تکمیلیت کی توقع ایک تمنائے خام ہے۔' (ص 26)

'غالب کے شعری اسالیب' اس میں کوئی شک نہیں غالب کے شعری اسالیب کے سبب ان کی انفرادی شناخت قائم ہے۔ غالب کے کلام کا سرسری طور پر مطالعہ کرنے والا قاری بھی لفظیات، لہجہ اور مزاج سے کچھ اس طرح مانوس ہو جاتا ہے۔ کہ جب اس کے سامنے کوئی شخص غالب کا شعر پڑھتا ہے۔ تو اس کے ذہن میں غالب کی شخصیت متبادر ہو جاتی ہے۔ غالب نے خود اپنے کلام کو انتخاب وانتقاد کی کسوٹی پر پرکھا۔ جس میں مضامین اور معانی کے طلسم کا خزانہ جمع کر دیا۔ جو قارئین اور ناقدین کی توجہ کا مرکز بنا۔ اور ہر عاقل وبالغ اپنی استعداد کے مطابق تعبیر وتشریح کی تاویلات سے استفادہ کر رہا ہے۔ عبدالحق غالب کے اشعار میں معانی و مفاہیم اور جمالیاتی کشش کا اعتراف ضرور کرتے ہیں۔ مگر ان کے کلام کی کثرت تعبیر کو مستحسن نہیں سمجھتے؛

'حقیقت یہ ہے کہ غالب زمینِ شعر پر ابرِ گہر بار بن کر برسے اور سبزہ وگل کو صبحِ قیامت تک کے لیے شاداب کر گئے۔ ایسے فن کار پر لکھنا جاں گسل ہے اور پُرخطر بھی۔ تعبیر وتشریح پر اکتفا کر لینے میں ہی عافیت ہے اور آبروئے قلم کی حفاظت بھی۔ اگر چہ تعبیرات کے خاروخس کے ہجوم میں اکثر متن کا مدعا عنقا ہو گیا ہے۔ کثرتِ تعبیر سے متن کی تفہیم میں فسادِ خلق ضرور برپا ہے۔' (ص 27)

غالب اور اقبال اردو کے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے دو بڑی زبانوں میں (فارسی اور اردو میں) شاعری کی ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ دونوں فن کاروں نے اپنی فارسی شاعری کی ستائش

ضرورکی ہے۔مگر مقبولیت اردو کلام کے توسط سے ملی۔کیونکہ دونوں نابغۂ روزگار شاعروں پر تحقیق و تنقیداور شرحوں پرگراں قدر سرمایہ جمع ہوگیا۔مزید تحقیق وتنقید اور شروحات کے دفتر پر بھی تحقیق ہورہی ہے۔کچھ مقالات تو کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔اس سلسلہ میں پروفیسر عبدالحق رقمطراز ہیں؛

> ’اب تو ان کی شرحوں کو بھی تدوین وتحشیہ سے آراستہ کرنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ یہ بھی بڑے فن کی برگزیدگی کی پہچان ہے۔اقبال کی شرحوں پر کئی تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔پچھلے سال ڈاکٹر اختر النساء گورنمنٹ نسواں کالج لاہور کا465 صفحات پر مشتمل مقالہ ’شروحِ کلامِ اقبال‘ کے نام سے شائع ہوا ہے۔یہ بھی 2004ء تک کے جائزے پر محیط ہے۔‘(ص 27)

بیسویں صدی کے سالِ اوّل میں اقبال نے غالب کو انتقادی کسوٹی پر حکیمانہ نظر سے دیکھا ہے۔اور تسلیم کیا کہ مرزا غالب کو فطرت نے وہ جوہر عطا کیا تھا۔جس نے اپنے حرف وصوت کے آہنگ میں اپنے روایتی ادب کے مزاج سے اعتراف وانحراف کا مرکب تیار کرلیا تھا۔غالب کی اعلیٰ ظرفی اور اختراعی طبیعت نے اردو شاعری کا قلندر بنا دیا۔یہی وجہ ہے غالب کے بعد اردو کے عظیم شاعر وعبقری شخصیت نے بھی ان کی شاعرانہ اہمیت کا اعتراف ’بانگ درا‘ کی ’مرزا غالب‘ نظم میں کیا ہے۔جو اقبال کی انتقادی نظر پر دال ہے۔اسی حوالہ سے ہر انسان کی فطرت جداگانہ ہوتی ہے۔مگر طبعی میلان کے ساتھ کسب وریاض اور مشق ومزاولت بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔جو ہر مجتہد شخص کے لیے امتیاز کا باعث بن جاتی ہے۔جو فن کار کی سرشت میں ڈھل کر اس کی تخلیق پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ غالب کو بھی بہت سے الفاظ سے بڑی نسبت اور لگاؤ ہوگیا تھا۔جنھیں انھوں نے اپنے اشعار میں بارہا استعمال کیا ہے۔اسی لیے انھوں نے طرز کے لفظ سے بطور سابقہ، بہت سی تراکیب بنائی ہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان میں کسی شے کے تعلق سے فطری جذبہ موجود ہوتا ہے۔تاہم اس کو صیقل کرنے کے لیے کسب وریاض کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔غالب اور اقبال کا کلام کا بھی بڑے ریاض کے بعد ہی اس بلندی پر پہنچا ہے۔

کسی فن کار کی شخصیت کے ساتھ اس کے تخلیقی فن پاروں کو معیار واستناد اور اسلوب کو

انفرادیت عطا کرنے میں ماحول، تہذیبی روایت اور زبان و بیان کی باریکیوں کی فہم بے حد معاون ہوتی ہیں۔

پروفیسر عبدالحق کے مطالعہ کی وسعت اور کلاسیکی ادب کی فہم کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے غالب کے یہاں ایسے نکتوں کو گرفت میں لیا ہے جس پر عام تو کیا خاص محققین اور ناقدین نے بھی توجہ نہیں دی، جوامت مسلمہ کی انفرادی تہذیب کا حصہ ضرور ہے۔ مگر جملہ بنی نوع انسان کا رشتہ بھی ان سے قائم رہتا ہے۔ بیشتر اردو ادب کے ناقدین کی کم نگہی کا یہ عالم رہا ہے کہ کلام غالب کو شعریات کے محدود دائرے اور سیکولرزم کی نارسائیوں کے حصار میں بند کردیا، عبدالحق معترض ہیں:

'کوتاہ بینوں نے ان کی شعریات کو تنگ نائیوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن غالب کو دیکھیے کہ خالقِ کائنات کی ذات وصفات کے ذکر کے ساتھ تخلیقِ اول سے آخری بعثتِ رسالت کی بیش از بیش تلمیحات واشارات سے کلام کو آئینہ خانہ بنادیا۔ غالب نے ابنِ آدم، ابنِ مریم، ابنِ خلیل سے گزر کر ثنائے خواجہ تک برگزیدہ انسانوں اور ان کے متعلقات کی نورفشانی سے تخلیق کو پرنور کیا ہے۔' (ص 29)

بنی آدم کی فطرت وخمیر زرخیز زمین کی مانند ہے۔ اس میں انسان ذاتی طور پر جیسی کاشت کرتا ہے ویسی ہی فصل تیار ہوتی ہے۔ ہر بڑی شخصیت کی تخلیق کے اثرات قاری پر مرتب ہونے ناگزیر ہیں۔ کیوں کہ تخلیق فہم وشعور کے ساتھ ذہن سازی بھی کرتی ہے۔ پروفیسر عبدالحق کی ذہنی نشوونما میں تخلیق کاروں کی تخلیقات کے ساتھ مذہبی ادب کا بڑا رچاؤ بساؤ ہے۔ جو ہر لمحہ انھیں لغزش سے روکتا ہے۔ اور وہ بھی دنیا وآخرت کی فکر کے مدنظر مثبت پہلوؤں سے زیادہ سروکار رکھتے ہیں:

'ثقافتی ثروت کا دوسرا پہلو اسلامی آثار وعقائد سے متعلق ہے جو بعثتِ نبوت سے عصر غالب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں اشاراتِ کثیر نے اسلوب آفرینی کو بڑی دل آویزی بخشی ہے۔' (ص 30)

انھوں نے انسانی نفسیات کے میلان کو بڑی حد تک سمجھا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے

کہ ادب کے مطالعہ سے یہ بات بھی اخذ کی ہے کہ انسان کا طبعی میلان رہبری کرتا ہے۔ جس سے فن کار جداگانہ طرز کی خواہش اور خصوصی امتیاز حاصل کرتا ہے؛

’اسالیب کے جہانِ نو کی جستجو میں آثار و علائم کے ساتھ طبیعت کے تقاضے بھی رہبری کہتے ہیں۔ روشِ عام سے الگ اپنی دنیا آباد کرنے کی خواہش ہر فن کار کی خلش ہوتی ہے۔ یہی آرزو انفرادی اسلوب کو مہمیز کرتی ہے۔ بہت حد تک یہ کہنا درست ہے کہ طرزِ نگارش ذاتی وجود و نمود کی مظہر ہے۔ دوسرے عوامل، کیف و کم کے ساتھ مدد کرتے ہیں۔ ہر بشر قد و قامت کی طرح فکر و مزاج بھی مختلف رکھتا ہے۔ یہی تنوع زینتِ تخلیق کو نقش ہائے رنگ رنگ سے نوازتا ہے۔‘ (ص 31)

کسی فن کار کے اسلوب کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں۔ مگر خاص پہلو کی ترجیحی بنیاد پر ہی اسلوب شناخت قائم کرتا ہے۔ غالب کے یہاں بہت سی چیزیں شناخت قائم کرنے کے لیے وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ہاں ندرت خیال اور معانی آفرینی بھی کلام کی امتیازی شناخت کا باعث بنتی ہے۔

انھوں نے فن کار کے طبعی اسلوب کا ضرور اعتراف کیا ہے۔ مگر تخلیق کار کو کلام میں طرح داری اور لطافت کو بروئے کار لانے کے لیے خون جگر کو سوخت کرنا پڑتا ہے۔ یوں بھی غالب قدیم و عام روش سے دامن کش ہو کر اپنے طرز کے اول و آخر علم بردار تھے۔ کیوں کہ وہ سیدھے سادے انداز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بلکہ انھیں کلام میں معنی آفرینی اور ابہام عزیز تھا۔ اسی لیے انھوں نے مومنؔ اور بیدلؔ کو لبیک کہا ہے۔ ان کا خیال ملاحظہ ہو؛

’طرزِ بیاں کی یہی طرح داری ہے کہ وہ مسلسل خونِ جگر کا مطالبہ کرتا ہے۔ طبع زاد اسالیب، فن کار کو جاوداں بنانے میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ غالب ادائے خاص کے علم بردار ہیں۔ وہ روشِ عام اور مرگِ انبوہ سے گریز کرنے والے ہیں۔ معاصرین میں ذوق کی سادگی اور سادہ بیانی پسند نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف مومن کی معنی آفرینی ہو یا بیدل کی پُر اسرار پیچیدہ بیانی انھیں

مرغوب ہے۔تہہ دار معنی آفرینی سے طرزِ بیان کو جمال آفریں قوت ملتی ہے اور اسلوب کو پُر نور بناتی ہے۔'(ص32)

یوں تو ہر شخص اور فن کار کا اسلوب جداگانہ ہوتا ہے۔مگر سب کی خاص پہچان نہیں بن پاتی ہے۔ یہ تو قدرت کا معجزہ ہی ہے کہ ہر شخص اور فن کار کا اسلوب جدا ہوتا ہے۔مگر اتنی جہات اور تنوعات کی نشان دہی کا آسانی سے ہو جانا یا کر لینا نہ تو ہر شاعر کے یہاں ممکن ہے اور نہ ہی ہر کس و ناکس ناقد کی بساط کا معاملہ ہے۔ یہ تو کسی دیدہ ور اور لفظ و لسان کے ماہر کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ یہ مضمون اپنے آپ میں انوکھا اور نایاب ہے۔ کیوں کہ اس قدر باریک بینی سے کلامِ غالب کے اسلوب کا مطالعہ شاذ ہی کسی ناقد نے کیا ہو۔اس حوالہ سے یہ مضمون بے نظیر بھی ہے۔اسالیب کے مطالعہ کو ایک نئے اندازِ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کو آفریں ہو کہ شعر و ادب کے شعور کے لیے ثقافتی سرگذشت کو معیار قرار دیا جائے۔اس مضمون کا آخری پیرا پیش ہے؛

'کلامِ غالب حرف و صوت،صرف و نحو،فکر و فن وغیرہ کی صناعی و سحر کاری کا ایک مرقع ہے جس میں ہر دور کے لیے بیش از بیش تصویریں آویزاں ہیں۔ان شعری اسالیب کی متنوع مثالیں موجود ہیں جو ماضی کی روایات اور معاصر مذاقِ سخن کی موجودگی کے ساتھ مستقبل کی سخنوری کے لیے عالمِ ناز و ادا کی نشان دہی کرتے ہیں۔'(ص40)

غالبیات کے قابل قدر ذخیرے میں اس عنوان سے عظیم فن کار کا مطالعہ عبدالحق کے ندرتِ خیال کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ہم نے غالب کو شوخ و طرح دار یا نائے و نوش یا صلح کل کا علم بردار کہہ کر اپنے کو مطمئن کر لیا۔مگر ان کے دل میں مچلتے پیام کو پرکھنے کی سعی نہ کی۔ یہ ایک اچھوتا اور غالب کی تفہیم کا نیا زاویۂ نظر ہے۔مصنف کی اقدار شناسی کا یہ وجۂ امتیاز ہے۔

'غالب کی پیامی شاعری' اس میں کوئی شک نہیں کہ جملہ شاعری میں کچھ نہ کچھ پیام موجود ہوتا ہے۔ایک پیام تو وہ جو براہ راست بنی نوع انسان کو مخاطب کرتا ہے۔اور ایک وہ جو بالواسطہ طور پر کرتا ہے۔مگر ادب میں بلاواسطہ کم بالواسطہ زیادہ ہوتا ہے۔مزید بہت سے اشعار میں بالواسطہ طور پر بہت سی جہات بھی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ جو قاری اور ناقد کی توجہ خاص کی طالب ہوتی

ہیں۔اس معاملہ میں غالب کا کلام بڑا اہم اور جذبہ واحساس کی فراوانی سے بھرپور ہے۔ جو انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہر موقع ومحل کے مطابق فراہم کردیتا ہے۔اور انسان ذہنی آسودگی حاصل کر لیتا ہے۔مگر یہ آسودگی کاہلی وسستی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ جو انسان کو اضطراب اور عمل کی تحریک نہیں بخشتی ہے۔اس کے برعکس اقبال کی شاعری انسان کے ذہن کو آسودگی اور فکر وعمل کو بھی مہمیز کرتی ہے۔جس سے انسان قوت وتوانائی حاصل کرتا ہے۔مزید حرکت وعمل کا مضطرب پیکر بن جاتا ہے۔ہاں غالب کے یہاں انسانی روزمرہ کی گہرائی وگیرائی اور مشاہدات کا ایک جہاں موجود ضرور ہے۔مگر بے نیازی کی سی کیفیت بھی ہے۔اس کے باوجود ان کا کلام ہر دور کے آدم کو فکر وشعور بخشتا رہے گا؛

> 'غالب مصلح تھے اور نہ مفکر۔مگر مشاہدات کی ثروت سے مالا مال تھے۔انفس و آفاق کے معمولات پر ان کی دروں بینی ہماری حیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ مشاہدات فن کی عظمتوں میں ہم آمیز ہو کر جاوداں اقدار میں محفوظ ہو گئے ہیں۔وہ بہار ہو کہ خزاں یا زمان ومکاں سب سے بے نیاز ہیں۔فن کی ابدیت کی ان تصویروں کے روبرو جدید وقدیم کو دلیل کم نظری قرار دیا گیا ہے۔ان کے کلام میں ہر دور اور ہر صدی کی بازگشت ہمارے شعور کو دستک دیتی رہے گی۔'(ص41)

غالب نے ہنگامہ غدر دیکھا تھا اور لوگوں پر ناگہانی افتادِ بلا کا چشم کشاں سے مشاہدہ بھی کیا تھا۔انگریزوں نے 1857 کے بعد ہندوستان پر مکمل طور سے تسلط قائم کرلیا۔اس کے بعد حکومت کے خلاف براہ راست کچھ کہنا جان جوکھم میں ڈالنے سے کم نہ تھا۔عوام کے دلوں میں چنگاری کی آگ سلگ رہی تھی۔ غالب کے یہاں بھی آتش کدہ کی زیریں لہریں موجود تھیں۔ غالب دانا بینا اور زمانہ شناس شاعر تھا۔جس کے یہاں بڑی حساسیت تھی۔انھیں انسانیت اور اپنے ہم وطنوں سے بھی بے حد لگاؤ تھا۔ یہ درد ان کے اشعار میں جا بجا موجود ہے۔مگر سرسری مطالعہ سے استعاراتی باریکیاں ہر کہ ومہ کی فہم میں آسانی سے نہیں آسکتی ہیں۔اس تعلق سے موصوف کی تحریر کا مطالعہ کیجیے:

'انتقام کا آتش کدہ روشن تھا وہ زباں بندی اور خموشی کی مصلحت سے مجبور تھے۔
پھر بھی تحریر کے دبیز پردوں میں ان کا پیرایۂ بیان غالب کے جذبہ واحساس کو
سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔اس پس منظر میں اس شعر کی معنویت دو چند ہو جاتی
ہے ۔ جسے صرف شعری بیان یا استعاراتی اظہار کہہ کر نظر انداز کرنا کم نگہی
کہلائے گی۔' (ص44)

غالب عام آدمی نہ تھے جن کی زندگی عام طور پر کھانے پینے سوجانے اور مرجانے پر ہی موقوف ہوتی ہے۔ وہ تو زندگی کے رازِ دروں کا شعور رکھتے تھے۔ وہ حیات وزیست میں حرکت و حرارت اور عمل پیہم کی اہمیت سے بھی واقف تھے۔ کیوں کہ کائنات میں ہر شے اپنی حرکات و سکنات کی علامت پر قائم ہے۔ ورنہ وجود کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔اس لیے غالب سفر وحرکت کو لبیک کہتے ہیں۔اس تعلق سے پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں؛

'بقائے حیات کا یہ ابدی پیغام فکرِ غالب میں بہت نمایاں ہے۔ یہ مسلسل عمل
ہے جس میں قیام درماندگی کی دلیل ہے۔ ذرے کا ہر لمحہ مچلتے رہنا ہی جینے کی
علامت ہے۔کاروانِ وجود ایک ثانیہ کے لئے ٹھہرتا نہیں ہے بلکہ جاوداں پیہم
رواں رہتا ہے۔' (ص50)

غالب کی پیامی شاعری میں موصوف نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ انھوں نے ماضی کی نرگسیت میں مبتلا ہونے سے گریز کیا ہے۔ درحقیقت یہ بات صحیح ہے کہ اگر انسان اپنے پدرم سلطان بود ہونے پر بے جا فخر کرتا رہے اور حال میں بے عملی کی زندگی گزارے، تو ایسے ماضی کی یاد سے انسان کے لیے زیاں کی صورت ہی پیدا ہوگی۔ جس ماضی کی یاد سبق آموز نہ ہو اس ماضی کو یاد کرنا بے سود ہے۔غالب نے بڑی بے باکی اور عقائد وافکار کی پروا کیے بنا بزرگوں کے طرز عمل سے انحراف کرنے کا پیغام دیا ہے۔ غالب کے نزدیک انحراف کرنے والے صاحب نظر سے انقلاب پیدا ہوتا ہے اس تعلق سے مضمون نگار نے غالب کے شعر کے سیاق میں یہ بات رقم کی ہے:

'غالب نے کسی تلمیح کا اشارہ کیے بغیر بنی نوع بشر کی تاریخ کی ایک ناقابل
تردید تمثیل سے ایک کلیہ برآمد کیا ہے کہ فرزند آدم کی اس پرشکوہ تاریخ کا مشاہدہ

کرو کہ جتنے بھی صاحب نظر انسان وجود میں آئے انہوں نے اپنے بزرگوں کے عقائد وافکار کی پیروی نہ کر کے ان کی روایت سے انحراف کیا ہے:

با من میا و یز اے پدر فرزندِ آدم را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

صاحب نظر انسانوں کی اجتہادی فکر سے ہی انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ اور فرسودہ نظام کی ساحری کا بھرم جاتا رہتا ہے۔ تاریخ میں ایسے ہی افراد نئی دنیا کی تعمیر کرتے ہیں۔' (ص 51)

بالا اقتباس کی روشنی میں پروفیسر عبدالحق گفتگو اور غالب کے شعر سے کلام کا پہلو نکلتا ہے کہ انقلاب بزرگوں کے عقائد اور افکار کے انحراف سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ تو بزرگوں کے عقائد وافکار کے انکار و اقرار کے لیے عملی وفکری جدوجہد کا مرہون منت ہوتا ہے۔ یہ علمی اور تحقیقی مضمون اپنے عنوان سے کما حقہ انصاف کرتا ہے۔ ہاں اس میں فارسی اشعار کی اردو کے بالمقابل کثرت ہے۔ جس کا مضمون کے بین السطور اعتراف موجود ہے۔ مگر موصوف کے علم وحلم کے باعث عجز وانکسار تو دیکھئے:

'ناچیز کو غالب کی پیامی شاعری پر نہ اصرار ہے اور نہ ادعائیت۔ ان کے نہاں خانۂ اشعار کے استفہام واستشہاد کے انجام سے بے خبر ایک طالب علمانہ شوق کا اظہار ہے۔' (ص 57)

عبدالحق کی شخصیت میں عجز وانکسار کا عنصر بہ حد کمال موجود ہے۔ وہ ہر طرح کی ادعایت سے نفرت اور خودنمائی سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی تمام تحریروں میں یہ بات جابہ جا ملتی ہے۔

غالب کے فارسی واردو ہم معانی اشعار' غالب اور اقبال فاضل مضمون نگار کو بڑے عزیز ہیں اور ان دونوں شعرا کے ذولسان ہونے پر بڑا فخر وناز بھی ہے۔ اردو شعرا میں دنیائے ادب میں جو نمائندگی ان کو نصیب ہے وہ کسی دوسرے شاعر کو نہ ہو سکی۔ اسی لیے پروفیسر عبدالحق یہ تحریر کرنے کی جرأت کرتے ہیں:

'غالب واقبال اردو کے تخلیقی اعجاز ہیں۔ دنیائے ادب میں شاید ایسی مثال

ملے کہ مادری زبان نہ ہونے کے باوجود غیر مادری زبان میں شاعری الہام وادراک بن کر آسمانی عظمتوں کو آواز دے رہی ہو۔' (ص 59)

انسان کی سرشت میں احساسِ تفاخر فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔ اگر یہ تفاخر مبنی بر حقیقت ہے تو بہت خوب بھی ہے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ غالب اور اقبال وہ بڑے شاعر ہیں جس پر جتنا ناز کیا جائے کم ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اہل زبان دیگر زبان سے تعلق رکھنے والے شخص کے کلام کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ مگر اہل زبان اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ زبان الہامی و وہبی اور فطری نہیں ہوتی بلکہ کسبی ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ علاقائی آب وہوا کے طفیل میں خودرو نبات کی مانند محاورہ، روزمرہ اور نئے الفاظ کی نشو ونما کا امتیاز برقرار رہتا ہے۔ یہ امتیاز ماحول کے طفیل سے ہی مٹ سکتا ہے۔ غالب اور اقبال کی زبان فارسی نہ تھی ثانی الذکر کی مادری زبان اردو بھی نہیں تھی۔ مگر پنجابی لہجے اور لسان کے اثرات اردو پر ضرور تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام میں تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا جب کہ لکھنؤ کے طرز فکر سے وابستہ غیر مادری زبان سے تعلق رکھنے والے اردو کے باکمال شعرا کے یہاں تصنع نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ بہر حال ہمارے ان دونوں شعرا نے شعری فکر و خیال کو حد کمال تک پہنچا دیا ہے۔ حتیٰ کہ حکیمانہ اور فلسفیانہ افکار و خیالات کو بھی شعری سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اسی پر ناز کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق یہ لکھتے ہیں:

> 'سبک ہندی ہی سہی مگر غالب کی فارسی شاعری ایران و پارس کی سخن وری کی حریف ہے۔ بے سوادی اور کم نگاہی حائل نہ ہو تو غالب سبکِ ہندی کے نمائندہ شعرا کی صف میں مرتبۂ اعلیٰ پر فائز ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فارسی کو جو فروغ اور فیضان ہندوستان کے قلم کاروں نے بخشا وہ کسی اور ملک کو نصیب نہ ہو سکا۔ ایرانیوں کے عدم التفات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ ہند نے بھی فارسی سے ترکِ تعلق کر لیا۔ ہند کے لالہ زاروں سے سو سال بعد بھی کوئی اقبال و شبلی یا گرامی پیدا نہ ہو سکا۔' (ص 59)

ماحول اور مطالعہ کے اثرات کا انسانی شخصیت میں در آنا ناگزیر ہے اور اس سے کسی بھی

طرح مفر ممکن نہیں۔اسی طرح اسلاف کے تصورات نئے الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر اخلاف میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اور مزید اپنی تازگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔غالب نے بھی اپنے بزرگوں کے افکار وتصورات سے خوشہ چینی کی ہے۔اسی باعث ان پر دزدی اور سرقہ کا الزام بھی عائد کیا گیا ہے۔جس کے تعلق سے فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں؛

> ’فارسی ادب سے استفادے میں غالب کا کوئی بھی حریفِ سنگ پیدا نہ ہوسکا۔ کلیات میں ظہوری، انوری، نظیری، حافظ وسعدی، طالب وبیدل وغیرہ کا بار بار اعتراف کیا گیا ہے۔اسلاف کے تصورات کا تخیل میں شامل ہونا بشری خمیر کا حصہ ہے۔ غالب کے معترضین نے سرقہ کے الزام کے وقت اس حقیقت سے چشم پوشی کی۔غالب کی پرشوخ طبیعت کو جواب دینا پڑا؛
>
> مبر گمانِ توارد یقین شناس کہ دُزد
> متاعِ من زنہاں خانۂ ازل بُردست
>
> غالب کے فروغِ تخیل کی بلند پروازی سے یہی امید تھی۔ پوری شاعری میں سرقے کے اتہام کے لیے ’دزدی وبکف چراغ داری‘ کی ایسی مثال نہیں ملتی‘‘(ص61)

ہر عہد میں سرقہ وتوارد کا معاملہ منظر عام پر آتا رہا ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے اس معاملہ سے قطع نظر ہم معانی ومفاہیم پرمبنی اشعار حیطۂ تحریر میں لانے کی سعی کی ہے۔خالق کائنات نے ہر چیز میں امتیازات روا رکھے ہیں۔مگر وہ امتیاز قائم بالذات ہیں۔جس میں انسان کو دخل نہیں،مگر امتیازات کے ساتھ ایسی مماثلتیں بھی ہیں۔جو وہ بھی قائم بالذات ہی ہوتی ہیں۔اسی طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں انسان میں افکار وتصورات کے اعتبار سے مماثلتیں اور تضادات بھی ہیں۔مگر انسان کے جذبات واحساسات کی وابستگی کا معاملہ جبلت سے ہوتا ہے۔ہاں اس میں کمی وبیشی کا ایک حد تک بجالانا انسان کے اختیار میں ہے۔

غالب کے یہاں افکار وخیالات کی تکرار اشعار میں پائی جاتی ہے جو عین فطری ہے۔مزید برآں بزرگوں کے افکار وخیالات کا مطالعہ بھی اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے

غالب کے یہاں بھی تکرار موجود ہے۔ یعنی ایک پھول کے مضمون کو مختلف طرح سے باندھا گیا ہے۔ مزید یہ غالب کے ذولسان شاعر ہونے کی وجہ بھی ہے۔ اسی لیے ان کے افکار و خیالات کا دونوں زبانوں میں در آنا فطری عمل ہے۔ اسی لیے ان پر افکار و خیالات کے تعلق سے سرقہ کا الزام درست نہیں۔ ہاں اگر مصرعے اور اشعار بعینہٖ نقل کر دیے ہیں تو وہ ضرور سرقہ ہے۔ مگر اس کا اعتراف بھی مستحسن ہے کہ میں نے یہ خیال فلاں شخص سے لیا ہے۔ اس بحث کے حوالہ سے مضمون نگار کے خیالات ملاحظہ کریں؛

> 'ایک ہی شاعر کے کلام میں ہم معنی اشعار کو توارد نہیں کہہ سکتے۔ تکرار، تشابہت، ہم معنی یا ہم خیال کہنا زیادہ موزوں ہے۔ ایک ہی زبان میں کہے گئے اشعار میں بھی معنی کی مشابہت ممکن ہے۔ اردو کے کئی فن کاروں کی تخلیقات میں تکرارِ خیال موجود ہے۔ ویسے بھی بڑے قلم کاروں کے زاویۂ اظہار میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ خیالات کا دہرانا بھی ایک حقیقت بن جاتی ہے۔ یہ تخلیق کا ایک لاشعوری عمل ہوتا ہے۔ اسے خیال کی ترجمانی بھی کہہ سکتے ہیں۔'
>
> (ص62)

عبدالرحمٰن بجنوری کے اس خیالِ ماخوذ یعنی وید مقدس اور دیوان غالب دو الہامی کتابیں ہیں ان کے قول کے طور پر خوب تشہیر بھی ملی ہے بلکہ ہماری نقد و تنقید اور گفتگو و تکلم کا وتیرہ بھی بن گیا ہے۔ جب کہ یہ خیال خود غالب کا ہے کہ انھوں نے بطور فخر یا حقیقت کی بنیاد پر یہ بات عرض کی تھی کہ اگر شعر و سخن کا کوئی آئین مرتب ہوتا تو میرا دیوان اس کا آئین ہوتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کائنات قدرت کی ہر شے اپنے اثرات کا زور رکھتی ہی نہیں دوسروں پر مرتب بھی کرتی ہے۔ ادب اور معاشرے میں تنقید اور ازم کی گمراہیاں کسب و کاوش سے کم بلکہ خودرو نباتات کی مانند پھل پھول رہی ہیں۔ جس میں تنقید و تخلیق کے حربہ سے کام لینے کی مزید ضرورت ہے۔ اور گمراہیوں، فریب کاریوں کے فروغ پر قدغن لگانے کی ذمہ داری بھی ہے۔ کیوں اس معاملہ میں ہمارا ادب بڑا خود کفیل ہے۔ پروفیسر عبدالحق اس گمرہی اور ادعائیت کی نفی غالب کے شعر کی روشنی میں اس طرح کرتے ہیں؛

'گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دے کر انھوں نے قاری، متن اور تنقید کی موجودہ گمرہی کی تمام ادعائیت کی نفی کی ہے۔ اس اساسی خیال کو پیش نگاہ رکھیں تو فارسی کے اس مآخذ کی داد دے سکیں گے؛ (ص 63)

در تہ ہر حرفِ غالب چیدہ ام میخانۂ
تاز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

غالب شریعت اسلامیہ کے عامل و عارف نہ تھے مگر ان کے نعتیہ اشعار حضرت محمدؐ کی عقیدت واحترام کی شہادت دیتے ہیں جو جزو دین ہے۔ غالب کے آنحضرتؐ سے احترام وعقیدت کے جذبہ کو پروفیسر عبدالحق خوش آمدید کہتے ہیں؛

'آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی سے والہانہ وارفتگی کا اندازہ ان کے نعتیہ قصیدوں سے ہوتا ہے۔ حدتو یہ ہے کہ شعری روایت کے برخلاف محبت سے سرشار نعتیہ غزل لکھی جو فارسی اور اردو تاریخ کی نعتیہ شاعری میں بہت ممتاز اور منفرد مقام کی حامل ہے۔ خاص طور پر مقطع میں حضورِ رسالت مآبؐ کی عظمت کا جو اعتراف ہے وہ سیرتِ نبویؐ کا مہتم بالشان موضوع ہے۔ ایک دوسری حیرت فروز مثال اردو غزل کا مقطع ہے:

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہؐ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

(ص 66)

غالب کے دین ومسلک کے بارے میں گمراہی پھیلانے والوں کا برا ہو کہ انہوں نے اپنے غلط عقیدہ وافکار کے پرچار میں کلامِ غالب سے دوراز کار مطالب پیدا کر لیے اور ہم مشرب وہم خیال بنانے کی سعی رائگاں میں عمریں گنوادیں۔ یہ ہماری تنقیدِ تنگنائی کی مکروہ مثالیں ہیں۔

موصوف نے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی سعی کی ہے جس میں کامیاب بھی ہیں۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جسے دوزبانوں سے اچھی واقفیت اور مطالعہ بھی وسیع ہو، ہر ہمہ شمہ اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ بغیر اسلام کے علمی کارناموں سے استفادہ کیے، ان کو فروغ دے کر

آگے بڑھانا نہایت ہی مشکل ہے۔ ہاں غالب واقبال اپنی منفرد شناخت اورشہرت میں اپنی مثال آپ ہیں؛

> 'نفسِ موضوع میں تکرار کے اندیشوں کا گمان بہت تھا لیکن تنوع اورتوسیع طلبی نے اسے بہت محفوظ رکھا۔ بزرگوں سے استفادہ کرتے ہوئے انفرادیت کو بحال رکھنا کوہ کنی سے کم نہیں۔ غالب واقبال نے اسلاف سے استفادے کی راہِ کہکشاں کو کشادگی بخشی ہے مگران کی انفرادیت میں کوئی بھی شریکِ سخن نہیں ہے۔'(ص71)

'غالب بطرزِ استفہام' بنی آدم کی فطرت میں استفساراورافہام وتفہیم کا مادہ ودیعت الٰہی ہے۔ خالقِ کائنات نے شرع میں نوع بشر کے لیے جودستورحیات پیش کیا ہے وہ ہمیں غوروفکر کی دعوت دیتا ہے۔ جوہمیں استفہام سے دوچار کرتا ہے۔ اور کئی تسلی بخش جوابات بھی فراہم کرتا ہے۔تاہم بہت سے سوالات انسان کی پیدائش سے ہنوز تشنہ طلب ہیں اور یہ رازمشیت ایزدی ہے۔جس کی حدومقام پرانسانی عقل وخرد کی رسائی ممکن نہیں۔ ہاں جسے خالق کائنات اپنی رحمت سے عطا کردے۔مگر وہ بھی فرد واحد کے احساس ہی پرضرورمنکشف ہوا ہے۔جس کا انکشاف وہ دوسروں پرکرنے سے قاصر ہے۔موت وحیات کے تعلق سے جملہ دانشوردوچار رہے ہیں۔وہ اپنی عقل وفہم کے مطابق سوالات قائم اور جوابات بھی فراہم کرتے رہے ہیں۔ پروفیسرعبدالحق استفساروستفہام کے تعلق سے تحریر کرتے ہیں؛

> 'ازروئے قرآن یہ کائنات بذات خودایک استفہامیہ ہے۔ وجوداور بیرون وجود پرفکروتدبر کی تواتر کے ساتھ تاکیداسی سبب ہے''اورزمین میں نشانیاں ہیں اورخودتمہارے اندر''اسی کا نتیجہ ہے کہ دانشوروں کی جماعت فکری مہمات سے ہمیشہ دوچاررہی۔'(ص74)

غالب نے اردوزبان وادب میں استفہامیہ انداز کے باعث ممتازمقام پایا ہے۔کیوں کہ انھوں نے اپنے لب ولہجہ شعروادب کووہ حسن وجمال عطا کیا ہے۔جس کی مثال وہ خود ہیں۔ انھوں نے اپنے شوخ انداز میں تفکرآمیز سوالات قائم کیے جوذاتی وجوداورمظاہرکائنات سے بھی

تعلق رکھتے ہیں۔

مصنف نے غالب کے اردو دیوان اور فارسی کلام کو مدنظر رکھا ہے۔جس میں ان کے استفہامیہ اشعار بلکہ ایسی ہی غزلوں کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے۔مزید اپنے تجربہ اور علمی استعداد کو بروئے کار لاتے ہوئے افہام و تفہیم کی مستحسن کوشش بھی کی ہے۔جس کی رو سے وہ غالب کے وجودی فکر اور تصوف کے میلان کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

'یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وجودی خیالات کے زیادہ قریب ہیں،جس میں تصوف کی روایتی تعلیم کو بڑا داخل ہے۔ساتھ ہی مولانا فضل الحق خیر آبادی کی قربت بھی حاصل ہے۔'(ص76)

یہ بات حقیقت ہے مگر غور و فکر کی متقاضی ہے کہ اس دنیا میں ہر شے کے ادراک و تفہیم کا سلسلہ وہم و گمان اور سوالات کے باعث ہی قائم ہوا ہے۔جو انسان کا فطری عمل ہے۔استفہام اور استفسار انسانی تشکیک اور اوہام کو رفع کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔اور علم کے فروغ کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔

انسان عقلی طور پر اپنے فکر و تدبر میں عموماً وجود مطلق سے استفہام کی شروعات کرتا ہے۔جب وجود مطلق کے تعلق سے براہِ راست خاطر خواہ اور تشفی بخش جواب پانے میں نامراد رہتا۔تو پھر کائنات میں منتشر قادر مطلق کی آیات یعنی موجودات عالم کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔اور خالق کائنات کی آخری تنزیل میں بھی یہی اشارہ ہے کہ مجھے پانے کے لیے کائنات کے مظاہر پر غور و فکر کرو۔جس پر غالب نے توجہ مبذول کی۔اس باب میں غالب کے حوالہ سے موصوف لکھتے ہیں؛

'اب ذرا دوسرے زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔استفہامی اندازِ نظر وجودِ مطلق سے موجودات عالم کی طرف بڑھتا ہے۔اشیائے کائنات کے ان گنت مظہر ہیں۔ان سب میں انسان کو ارتفاعیت حاصل ہے بلکہ وہی نقطۂ پرکار یا مرکزی محور ہے۔غالب اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ان کے وجود کی وابستگی بھی اسی کی مرہون نظر ہے۔نوع بشر بھی مجموعۂ استفسار ہے۔'(ص78)

غالب کے یہاں وجود مطلق، کائنات، انسان اور دنیاوی معاملات میں جتنے استفسار ہو سکتے ہیں۔ وہ سب شعری حسن و جمال کو بڑھاتے اور نوع بشر کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں جو غالب کی انفرادیت کا زبردست پہلو اور بے باکانہ اظہار بھی ہے۔ یہ استفہام فارسی اور اردو کلام میں بہ کثرت موجود ہے۔ جوان کے معاصر شعرا کے یہاں بہت کم ہے۔

'تفہیم غالب آزادی کے بعد' اس مضمون کے مطالعہ سے یہ احساس ناگزیر ہے۔ کہ پروفیسر عبدالحق کی غالب اور اقبال کے حوالہ سے لکھے جانے والے تحقیقی وتنقیدی مقالات پر گہری نظر ہے۔ انھوں نے نہ صرف ان کو دیکھا بلکہ بیشتر کا گہرائی سے مطالعہ بھی کیا ہے۔ یہاں تک کہ مجلسوں اور محفلوں میں مقررین اور واعظین کی تقریر و خطاب اور تکلمات و مفلوظات پر بھی ان کی نظر ہے۔ یہ دونوں بڑے شاعر خاص و عام میں یکساں مقبول ہیں۔ ان دونوں شعرأ نے ناقدین اور دانشوروں کا ذہنی امتحان لیا ہے۔ اور یہ علمی مشق ومزاولت ہنوز جاری ہے۔ ان دونوں کا مطالعہ بصارت کو کمزور مگر بصیرت کو جولانی بخشتا ہے۔ اردو شاعری میں معاصر عہد کی رو سے یہ دونوں اپنا ثانی اور حریف نہیں رکھتے۔ مگر ہاں زمانہ بعد کے لحاظ سے غالب کے حریف اقبال ہی ٹھہرتے ہیں۔ اور ہاں اقبال نے نہ صرف غالب کے فکر و شعر کا اعتراف کیا ہے بلکہ تحسین کی نظر سے دیکھا بھی۔ حالی اور اقبال کے انتقادی نقطۂ نظر کے بعد غالب مزید دوسرے باذوق ناقدین کی ذہنی کشادگی اور مشق کی کسوٹی بن جاتے ہیں۔ جس کا اعتراف فاضل مضمون نگار ان الفاظ میں کرتے ہیں؛

> 'غالب کے انتقال کے بعد ان کے سب سے معتبر نقاد، شارح اور نیازمند مولانا حالی ہیں۔ دوسرے علامہ اقبال اور ان کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہیں۔ جنھوں نے غالب شناسی کی طرح ڈالی اور غالب کی فنی ارتفاعیت کو شہرت دوام سے روشناس کیا۔ ان کے بعد غالبیات کی پائیدار روایت فروغ نظر کی شاہراہ بن جاتی ہے۔' (ص 84)

عبدالحق نے غالب کی افہام وتفہیم اور تجزیہ کے حوالہ سے دو طریقہ کار پر اختصار سے اظہار کیا ہے۔ مگر وہ دوسرے طریقہ اظہار کو بہتر تسلیم کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد اردو میں

جو غالبیات پر بڑی تعداد میں کام ہوا ہے اور ہنوز جاری ہے وہ اب تک کے کام کو تین عنوانات کے زمرے میں رکھنے کی بات کرتے ہیں؛

> ’آزادی کے بعد غالبیات کے ذیل میں پیش کی جانے والی کاوشوں کو مجموعی طور پر اور مطالعے کی سہولت کی خاطر تین عنوانات میں شمار کر سکتے ہیں۔شماریات کا یہ سلسلہ بہت زیادہ میکانکی نہیں ہے بلکہ مطالعہ کے سیاق اور تفہیماتی تعین ہے جس میں: سیرتِ غالب اور شخصی کوائف کے ساتھ احباب واسلاف کا ذکر ہے۔دوسرا جز شعری اسالیب اور فکری رویوں کی تشریح و تعبیر پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصہ عہد غالب اور معاصر ادیبوں کے متعلقات پر مبنی ہے۔‘(ص85)

غالب اردو زبان و ادب میں منفرد ندرتِ فکر کے حامل ہیں۔ان کے اشعار میں معانی و مفاہیم کا سرمایہ مختلف جہات سے عبارت ہے۔اسی وجہ سے بہت سی شرحیں منظر عام پر آنے کے باوجود بھی کلامِ غالب تشنہ طلب ہے۔مگر یہ سرمایہ تاہم غالب کی تفہیم میں بے حد معاون ضرور ہے۔اور ادبی حلقہ میں استحسان کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔جو غالب کی بازیافت میں روز افزوں پیش رفت کا ضامن بھی ہے۔مگر ہنوز ہمارا بہت سا دستاویزی بیش از بیش بہا سرمایہ منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔لیکن اسے حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔

غالب کا کلام ندرت فکر اور گہرائی و گیرائی کے باعث باذوق قارئین کی توجہ کا ہی مرکز نہیں بنا بلکہ اساتذہ اور طلبا کی دلچسپی کی بدولت ہماری جامعات کے نصاب کا حصہ بنا اور محققین اور ناقدین نے متن و مفہوم پر بھی خاصی توجہ دی ہے۔جو ہمارے دیگر فن کار کو نصیب نہ ہوئی۔پروفیسر صاحب نے تدریسی پیشہ کی وابستگی کے باعث اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر یہ فرمایا ہے؛

> ’آزادی کے بعد بوجوہ غالب پر خاص توجہ دی گئی۔تدریسی تقاضوں سے قطعِ نظر تنقید و تحقیق پر حد درجہ التفات مطالعہ کے ارتکاز کا باعث بنا۔مطالعۂ اقبال پر غیر محسوس عدم دلچسپی نے اندازِ نظر کو بدلا اس ادبی مراجعت نے غالب شناسی کو عمومی مطالعے میں شامل کیا۔دانش گاہوں کے خصوصی مطالعہ اور موضوعات نے درِ تحقیق و تنقید کو زیادہ کشادگی بخشی۔‘(ص86)

’اردو ادب کی تحقیق وتنقید میں غالب وہ سنگ میل ہے جو اپنے محققین، ناقدین اور قارئین کی نگاہ بینا کو منعطف کراتا رہا ہے۔ جو غالب کے شاعرانہ تخیل اور کسبِ فیض وریاض کے باعث ممکن ہوا۔ ہمارے علمائے ادبیات نے انتقاد کی کسوٹی پر پرکھنے کی حتی المقدور سعی کی ہے۔ اس معاملہ میں غالب اپنے معاصرین میں سب پر سبقت رکھتا ہے۔ اس قدر کام ہونے کے باوجود غالب شناسی کا معاملہ بہت کچھ باقی ہے۔ کیوں کہ کلامِ غالب کے معانی ومفاہیم کی ترسیل کماحقہ ہنوز نہیں ہو پائی؛

’غالب ایک عظیم المرتبت فن کار ہیں جن کی کارگہِ فکر میں تہذیبوں کی تقدیر اور کشاکشِ زیست کا سوزِ دروں شعری پیکروں میں نمایاں ہوا ہے اور جس کا علوئے فکر عرش سے بھی پرے مکاں تعمیر کرنے کی آرزو سے دوچار ہے۔ اس پر انتقاد کی کمندیں ڈالنے اور تخلیق کے پُر اسرار رمز کو گرفت میں لانے کے لیے بلند نگہی چاہیے جو سینۂ تخلیق کو چیر کر سرچشموں کی شناوری کر سکے۔ تب ہی ترسیل کی تکمیل ممکن ہے اور یہی تفہیم کی غایت بھی ہے۔‘ (ص 87)

غالب کے حوالہ سے فارسی تو کجا اردو میں بھی اس پائے کا کام نہ ہو سکا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے محققین اور ناقدین غالب شناسی میں مسلسل لگے ہوئے ہیں۔ اور روز افزوں ترقی بھی کر رہے ہیں۔ مگر اب تک جو کام ہوا ہے ان میں لائق اعتبار بہت کم ہے۔ اس کا اعتراف ملاحظہ ہو؛

’ایک سرسری مطالعہ سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ حالی سے تا حال چند ہی بزرگوں کی خدمات کو توقیر حاصل ہے۔ انھیں انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس بارے میں آپ بھی متفق ہوں گے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مالک رام اور ڈاکٹر حنیف نقوی وغیرہ۔‘ (ص 88)

اردو ادب میں محققین اور ناقدین کی نظر التفات اور اپنی معنوی تہہ داری کے باعث جہانِ غالب انسائیکلوپیڈیائی عمل کا متقاضی ہے۔ اس علمی کارِ خیر کو بروئے کار لانے کے لیے کوئی ماہر غالب اور ادبی مرد مجاہد مستقبل کے بطن میں پوشیدہ ہے۔

جہاں پروفیسر عبدالحق نئی نسل سے تحقیقی وتنقیدی عمل کو فروغ دینے اور کارہائے نمایاں

کی امید رکھتے ہیں وہ بیشتر معاصر اساتذہ کی تساہلی اور تحقیق وتنقید سے بے رغبتی، طلبا سے بے اعتنائی حتی کہ اپنے فرض سے عدم توجہی کو مدنظر رکھتے ہوئے جامعات کی سطح پر بیم ورجا کی کیفیت کا عالم ان کے الفاظ میں پڑھیے؛

> 'دانش گاہوں کی دہلیز پر سنّاٹا ہے۔ اساتذہ شوق نہیں دلاتے اور خود بھی بادپیمائی سے گریز کرتے ہیں۔ پاکستان میں کچھ کام تحقیقی مقالوں کے حوالوں سے قابلِ قدر ہیں۔'(ص90)

پروفیسر عبدالحق کے مطالعہ کی وسعت اور تحریر کی دلکشی سے ہمیں حیرت ہوتی ہے اور مسرت بھی۔ جدید قدیم موضوعات پر ان کی رسائی اور خوش بیانی سے ہمیں بے حد درجہ حوصلہ ملتا ہے۔ طلبا کو گہرے مطالعہ کی طرف مائل کرنا ان کی دلکش شخصیت کا ایک انفرادی امتیاز ہے۔ مثبت اقدار کی ترجمانی ان کی تحریروں میں موجِ خوں بن کر رواں ہے۔ یہ ان کے فکر وسوچ کی صحت مند علامت ہے۔ وہ تحریر وتقریر یا ظاہر و باطن میں ایک شفاف شخصیت کے پیکر ہیں۔ اسی سبب ان کے اظہار کی بے باکی اور مزاج کی منصفی سب کو متاثر کرتی ہے۔ اقبال پر تنقیدی رویوں کی گمرہی ہو یا اسرائیل کی توسیع پسند جارحانہ کردار اور حکمرانِ ملک کا مکروہ فکری اندازِ نظر ان کی حق گوئی کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ادبی معاملات میں بھی انہوں نے کئی بڑے ناموں کی نامناسب تحریروں کو ناقبول قرار دیا ہے۔ انھیں بارہا تاکید کرتے سنا ہے کہ طلبا کو اپنی انفرادی فکر کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔ دوسروں کے اقوال پر تکیہ مکروہ علامت ہے۔ متن کے براہِ راست مطالعہ کی تاکید ان کے درس وگفتگو کی اساس ہوتی ہے۔ اس کتاب میں بھی متن ہی زیرِ غور ہے کسی دوسرے کے اقوال واعتراف سے گریز کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مطالعہ اقبال اور درس اقبال کی نذر ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنے مطالعہ کو محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں وسعت پیدا کرتے رہے۔ اور وہ مسلسل اردو کے قدیم وکلاسک شعرا و ادبا کو اپنے مطالعہ کا حصہ بناتے رہے ہیں۔ حاتم کے دیوان کی تدوین، انتخاب ولی، آبرو، ذوق، غالب، سرسید، شبلی اور حالی، آزاد، انیس ودبیر وغیرہ پر ان کے مضامین اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ مزید یہ مضمون بھی اس بات پر دال ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر عبدالحق شاہ غمگین کی شخصیت میں قناعت، سادگی اور

بے نیازی کے عالم کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ ہر بادشاہ اور امیر کے آستانہ سے لاتعلق رہے بلکہ خود اپنی ستائش سے بھی بے پروا رہے۔؛

'شاہ غمگین کو آفریں ہو کہ انہوں نے قلم کی حرمت کا پاس رکھا اور قصیدے کے قریب سے بھی نہ گزرے۔ دو مجموعے منظر عام پر آئے۔ 'مخزنِ اسرار' میں صرف غزلیں ہیں، جن کی تعداد تقریباً 800 ہے۔ 'مکاشفات الاسرار' 1800 رباعیوں پر مشتمل ہے۔ چند مخمسات اور قطعات تاریخ بھی تخلیق کیے۔' (ص 91)

شاہ غمگین نے اپنی رباعیات کے مجموعہ کلام 'مکاشفات الاسرار' کو غالب کو معنون کیا ہے۔ غالب نے اس کو اپنے لیے عزت و توقیر سمجھا، جو تھا بھی۔ غمگین کے استاذ سعادت یار خاں رنگین تھے وہ بڑے بے باک شخص تھے، جنھوں نے انگریزوں سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ انھیں محمد حسین آزاد نے مومن کی طرح تو نظر انداز نہیں کیا۔ مگر خالص ریختی کا شاعر کہہ کر ادبی انصاف سے گریز کیا اور غیر دیانت دارانہ سلوک کے مرتکب ہوئے۔ پروفیسر عبدالحق کی تحقیقی وتنقیدی نظر کو آفریں کہیے؛

'سعادت یار خاں رنگین بھی سلطان ٹیپو کی شان میں قصیدہ اور انگریزوں کی تحقیر کر چکے تھے، جس کی پاداش میں مولانا محمد حسین آزاد نے ریختی کا شاعر کہہ کر اس عبقری کو ادبی انصاف سے محروم کر دیا۔'

رنگین کی یہ وراثت شاگرد رشید حضرت غمگین کے مقدر کا حصہ بنی۔ شاہ غمگین نے استاد رنگین کی رحلت پر قطعۂ تاریخ لکھی جو 'مخزن اسرار' میں موجود ہے:

'جب استاد رنگین جہاں سے گئے — تو اک یادگاری رہی ریختی
خرد نے کہا یہ بھی تاریخ ہے — کہ ساتھ ان کے غمگین گئی ریختی'
(ص 97)

شاہ غمگین غالب کے معاصرین اور ممدوح تھے جنھوں نے اپنا شعری اور نثری سرمایہ ادب چھوڑا ہے۔ جن کے چودہ قلمی نسخوں کی نشان دہی ہو چکی ہے۔ شاہ غمگین فن ادب کے ساتھ ایمان وایقان کی دولت سے سرفراز تھے۔ یہ بات درست ہے کسی ادیب وشاعر کی شخصیت اور اس

کے ادبی سرمایہ کی تفہیم کے لیے اس کے معاصرین کو بھی خاطر خواہ توجہ دینا ناگزیر ہے۔ شاہ غمگین کے غالب سے تعلقات کے بارے میں عبدالحق رقم طراز ہیں؛

'مطالعۂ غالب میں معاصرین اور معاشرے کی حددرجہ معنویت ہے۔ انھیں خاطر میں لائے بغیر غالب کے امتیاز اوراعجاز کی تفہیم کم نگہی کہلائے گی۔ غالب اورشاہ غمگین میں بے تکلف مراسلت تھی، خطوط میں غالب کا نیازمندانہ تخاطب گہرے تعلقات کی دلیل ہے۔' (ص99)

ایک فکرانگیز مضمون 'غالب شناسیٔ اقبال' ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر سید عبداللہ سے لے کراب تک کئی مضامین لکھے گئے۔ مگر زیر بحث مقالہ سب میں بہتر اور بہت ہی خیال افروز ہے۔ ہندو پاک میں اس مقالہ کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ یہ دونوں شاعرفکراور تخیل آفرینی کے اعتبار سے دنیائے ادب میں اردو زبان وادب کی نمائندگی ہی نہیں کرتے بلکہ توقیر وعزت کا استحقاق عطا کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ان کے کلام کا اعجاز ہی ہے جو مکمل طور سے نہ صرف دوسری زبان میں منتقل ہوا ہے بلکہ چند زبان وادب کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ پروفیسر عبدالحق دونوں شاعروں کی عظمت کا بلامبالغہ اعتراف کرتے ہوئے انہیں قدر سے دیکھتے ہیں؛

'غالب واقبال کی عظمت کے اقرار واعتراف میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ انکار تو کجا اشتباہ کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی عظمت لازوال شہرت رکھتی ہے۔ دونوں نے بظاہر اپنے کو فرداً کے فن کار کی صورت میں پیش کیا اوراس پر اصرار بھی کرتے رہے مگر واقعہ یہ ہے کہ دونوں نے زمان ومکان کے فصلین کو مسخر کرلیا ہے اوراُن سے ماورا ہیں۔ انھوں نے ہمارے شعر وثقافت کو آفاقی اساس بخشا ہے۔ ہمیں دنیا کی بڑی تخلیقات کے روبرو اس شان سے لاکھڑا کیا کہ آنکھوں کو خیرگی نہیں ہوتی اور نہ شرمساری بلکہ ایک تفاخر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔' (ص102)

ان دونوں شعرا کی پرواز فکر ارض وسما سے بھی آگے نظر آتی ہے۔ اسی لیے دونوں جہانِ نوخلق کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ جو زمان ومکان کی ابدیت کے واسطہ مستعار

فکرونظر کی فراہمی کے خواہش مند ہیں۔ یوں تو ان کی فکرونظر کا محور ومرکز بنی آدم ہی ہے۔ کیوں کہ خدا کی کائنات میں ابن آدم کے علاوہ اس قدر تخلیقی صفات سے کوئی مخلوق متصف نہیں ہے۔ اسی لیے دونوں آرزومندی کو بروئے کار لاتے ہوئے خود تخلیق کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

بنی نوع انسان کی فطرت میں زبان، مذہب اور جغرافیائی طور پر باہم چشمک، اختلاف، استعصاب کے ساتھ حسد بھی پایا جاتا ہے۔ ہر عہد میں انسان باہمی طور پر اس کا شکار بھی رہا ہے۔ غالب اور اقبال بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اقبال پر معاصرانہ چشمک اور جغرافیائی تعصب کی بنا پر غیر فطری انداز میں تصنع کے زیر اثر دبستان لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے شعرا نے ان پر بہت سے اعتراضات کیے۔ تو اقبال نے اپنے مطالعہ کی بنیاد پر ان کے جوابات قدما کے کلام ہی سے پیش کیے۔ اور معترضین کو لاجواب کر دیے۔

یہ تاریخی اور لسانی ماہرین کے سیاق سے ثابت ہے کہ اردو زبان کا گہوارہ دہلی اور اس کے اطراف کے علاقے ہیں۔ ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی آمد اور ان کی حکومت کے باعث ہی یہ زبان اپنے لسانی تدریجی عمل سے گزر کر تیزی سے جلا اور فروغ پاتی رہی۔ یہ زبان بہت سی زبانوں کی آمیزش اور اثرات کے ساتھ پنجابی کا خاصا اثر رکھتی ہے۔ بلکہ لسانی طور پر پنجابی لہجہ سے بے حد اثر قبول کیا ہے۔ اس کے اثرات آج بھی دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقہ کے عوام وخواص کی بولی میں پائے جاتے ہیں۔ جو فطری طور پر اردو زبان کا حقیقی حصہ ہیں۔ جو لہجہ کی شکل میں غیر رسمی اور بے تکلفانہ انداز میں عوام سے ادا ہوتے ہیں۔ اسی لیے لکھنؤ اور اس کا تتبع کرنے والے حضرات اردو کے فطری لہجہ کے سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ جس کے باعث دہلی اور اس کے آس پاس کے عوام کو یہ لوگ غیر مہذب اور اردو سے نابلد تک گردانتے ہیں۔ طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ دہلی اور اس کے اطراف کے بہت سے حضرات اپنے آپ کو اشرافیہ طبقہ میں شمار کرنے کے باعث لکھنؤ کے تتبع میں غیر فطری مگر تصنع آمیز زبان کو بولنے میں افتخار محسوس کرتے ہیں۔ جو پر تکلف ہی نہیں بلکہ تملق آمیز لہجہ سے مملو بھی معلوم ہوتی ہے۔ جو دراصل اردو کا فطری خمیر ہی نہیں ہے۔ غالب، میر، سودا دہلی کے حلقہ سے تعلق رکھنے والے شعرا وادبا کے یہاں تو، تم، آوے، جاوے اس کے علاوہ اردو مادہ اور مصدر کا استخفاف ان کے یہاں ظاہری طور پر پایا جاتا ہے جو لکھنؤ

والے اور لکھنؤ پرستوں کو گراں گزرتا ہے۔اس کی وجہ خاص یہ ہے کہ وہ لسانیات کے علم سے واقفیت نہ ہونے کی بنا پر اس طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔اقبال فلسفہ السنہ سے بھرپور آگاہی رکھتے تھے،مزید پنجابی ان کی مادری زبان بھی تھی جو اردو پر اپنے اثرات رکھنے کے باوجود جملہ کی ساخت بھی وہی رکھتی ہے۔اسی لیے اقبال نے ان کے اعتراضات کے مدلل جوابات تو دیے مگر ان کو خاطر میں نہ لائے۔اقبال کے فلسفہ السنہ کے علم و آگاہی کے تعلق سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو؛

> ''فلسفۂ لسان یا علم السنہ پر اقبال کو بہ غایتِ کمال درک حاصل تھا ان کے کلام سے بہ خوبی اس کا یقین ہوتا ہے لفظوں کے استعمال اور اختراع میں اقبال بذات خود ماہر و مکتفی تھے۔اس لسانی فیضان سے فارسی و اردو میں اس حد تک شاید ہی کوئی مستفیض ہو۔ساتھ ہی ان کی تنقیدی نظر بھی تخلیقی وجدان سے مربوط تھی۔فن اور فن کار کے رشتوں اور دونوں کی ذمہ داریوں پر ایسے انکشافات،قبل اور مابعد کے انتقادی ادب میں ناپید ہیں ان کے اقوال و افکار کی اقتدا تو کی گئی، مگر تنقیدی مزعومات ان سے سبقت نہ لے جاسکے۔'(ص107)

مضمون نگار نے عشق اقبال کے باوجود غالب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔اور تحقیق و تنقید سے بھی نوازا ہے جو غالبیات کے مطالعہ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔کیونکہ غالب اردو زبان و ادب میں فکر و تخیل کا واحد شخص و شاعر ہے جس کا ذکر اقبال کی ہر عہد کی تحریر و شعر میں موجود ہے۔اقبال جیسا عبقری شاعر و فلسفی غالب کی عظمت کا فراخ دلی سے اعتراف کرتا ہے۔صاحبِ کتاب نے اقبال کے کلام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ استنباط کیا ہے؛

> 'راقم کا یقین ہے کہ ان حوالوں کے ہجوم میں غالب منفرد فن کار ہے، جس کا ذکر اقبال کے ہر دور کی تحریر میں کسی نہ کسی صورت اور عنوان موجود ہے اس سے لگتا ہے کہ غالب کے قرب کی قندیل سے اقبال نے اپنی گزرگاہِ خیال کو ہمیشہ فروزاں رکھا جو شہر آرزو کے ماتم خانہ میں بھی شمع بن کر روشنی بکھیرتا رہا۔' (ص108)

اس مضمون کے مطالعہ سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ فاضل مضمون نگار نے جس

باریک بینی اور نقد ونظر سے غالب اور اقبال کا مطالعہ کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال نے اردو شعرا میں غالب کے فکر وتخیل سے جس قدر استفادہ کیا اور کسی سے کیا ہی نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے فکر وتخیل کی سیرابی غالب کے علاوہ دیگر سے ممکن ہی نہیں تھی۔حسن اتفاق یہ ہے کہ اقبال نے فارسی شعرا کو ہی لائق اعتنا سمجھا۔غالب پہلے ہی ان شعرأ سے خاطر خواہ استفادہ کر چکے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اور اقبال کی ذہنی پرواز میں کافی حدتک مماثلت پائی جاتی ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے اپنے مطالعہ، تجربہ اور مشاہدے کی بنیاد پر یہ بڑی اہم اور قابل غور باتیں بیان کیں ہیں تنقید کو فکر وتدبیر سے ہم آہنگ کرنا ہی عبدالحق کی امتیازی شناخت ہے۔ان کی تحریریں نئے نکات کے ساتھ قاری کو غور وفکر کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔تنقید میں خیال افروزی یا دعوتِ غور وفکر پر توجہ ان کا شیوہ خاص ہے۔

غالب اور اقبال اردو شاعری میں اپنی طرز کے موجد اور مختتم ہیں۔حسن کمال دونوں کا دیکھئے کہ دونوں نے اپنے تفکرات کی ترسیل کے لیے الفاظ اور تراکیب ڈھالے اور پرانے الفاظ کو نئے معنی بھی عطا کیے۔کیوں کہ غالب اور اقبال کے طرز بیان کی شدت کے سامنے الفاظ نے اپنے معانی ومفاہیم کے کینوس کو وسعت عطا کی۔غالب اور اقبال کو بہت سے شعرأ یکساں طور پر عزیز ہیں۔دونوں ہی ان فن کاروں کی مشکل گوئی اور ابہام کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہیں۔ان بہت سی باتوں میں مطابقت اور مماثلت کے باوجود دونوں نے اپنا مقام ومرتبہ قطعی الگ بنایا ہے۔اور اپنے فن کو دائمی زندگی بخشی۔اسی سیاق میں پروفیسر عبدالحق کی تحریر دیکھئے؛

> 'کیا یہ ادبی تخلیق کا اعجاز نہیں ہے کہ تفکر اور طرزِ اظہار کی اتنی قربت کے باوجود اقبال نے اپنا الگ مقام پیدا کیا اور غالب سے آگے گامزن ہوئے۔کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو وہ اپنی ندرتِ فکر واسلوب کا سفینہ ڈبو چکا ہوتا۔'(ص 111)

اقبال فکر وخیال کے اعتبار سے ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں رہے اسی لیے فکر وخیال کے مثبت ومنفی پہلوؤں سے رجوع اور ترک کا عمل بدستور جاری رکھا۔اردو شاعری میں اقبال کو غالب سے جو فکری مناسبت رہی ہے وہ غالب کے فکر کی مرہون منت ہے۔سوال یہ ہے کہ اقبال کو غالب کے مطالعہ کی توفیق وتحریک میں کون معاون ہوا؟ اس میں مضمون نگار نے

قیاسی طور پر اقبال کے استاد میر حسن اور مولانا گرامی پر تکیہ کیا ہے۔ مگر اقبال کے غالب شناسی کی طرف رجوع ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> 'ان قیاسات سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ 1897 سے 1901ء تک تین سال یا چار سال کا درمیانی وقفہ غالب شناسی کا نقطۂ آغاز ہے وہ ابتدا جو اپنے باطن میں بلندی کی معراج رکھتا ہے۔ یادگارِ غاب 1897 میں شائع ہوئی اور اقبال کی نظم 'مرزا غالب' مخزن ستمبر 1901 میں شائع ہوئی اگر مرثیۂ غالب کو نظر انداز کر دیں تو اقبال کی یہ نظم حالی کے بعد کسی بڑے شاعر کا پہلا اخراج عقیدت ہے جو غالب کے فکر و فن کو نئی معنویت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔' (ص 114)

لاریب حالی غالب کے اولین شارح و ناقد ہیں۔ ہنوز 'یادگار غالب' غالب کی تفہیم میں خشت اول ہے جس کے مطالعہ کے بغیر کسی بھی دیگر شارح اور ناقد نے غالب فہمی میں نمایاں کردار ادا نہیں کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اقبال سے قبل غالب کے شاعرانہ فکر و تخیل اور نکات کی طرف نہ تو حالی نے اور نہ ہی دیگر ناقدین نے توجہ مبذول کرائی ہے جس کی طرف اقبال جیسے عبقری شاعر نے توجہ دلائی ہے۔ اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

> 'حیرت ہوتی ہے کہ غالب پر سب سے اچھی کتاب 'یادگارِ غالب' سمجھی جاتی ہے اور سچائی بھی یہی ہے مگر حالی نے فکر کی عظمت، تفکر، تخیل کی بلند پروازی، فکر کامل، فردوسِ تخیل مختصراً غالب کی عظمتِ فکر اور تخیل کی بلند پروازی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ہاں نادر خیال، نیا خیال، اچھوتا خیال جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ اقبال اور صرف اقبال ہیں جنھوں نے پہلی بار غالب کے فکری ارتفاع پر توجہ دلائی ہے۔' (ص 115)

اقبال نے غالب کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے شاعرانہ معیار کو بلند کیا ہے۔ اقبال سے قبل غالب کا موازنہ یا مقابلہ صرف فارسی شعرا سے کیا گیا۔ مگر اقبال کی نظر تو بہت سی زبانوں کے عالمی ادب کے شاہکار پر تھی۔ اسی باعث انھوں نے سب سے پہلے غالب کو جرمن شاعر گوئٹے کا ہم پلّہ قرار دے کر آفاقی شاعر بنا دیا۔

اردو شعرا میں غالب ہی وہ شاعر ہے جس نے اقبال جیسے عبقری شخص اور شاعر کو متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ متاثر بھی کیا۔ وہ بھی فن شعر کے حوالہ سے نہیں بلکہ فکر و خیال کی ندرت اور نکتہ بیں کے باعث۔ اس لیے اقبال کے انتقادی شعور نے غالب کی عظمت اور فن کارانہ شکوہ کا اعتراف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے شعری اور نثری کلام میں غالب کی تحسین کی ہے۔ اقبال کے علاوہ غالب کے حوالہ سے یہ نظر دیگر ناقدین کو میسر نہیں ہوئی۔ عبدالحق اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں؛

’اقبال کی نظر میں غالب کا مقام صرف شاعر یا فن کار کا نہیں ہے بلکہ ایک فکر ساز اور نکتہ رس مردِ قلندر کا ہے، جس کی کارگہِ فکر میں قوموں کی تقدیر کے ماہ وانجم تخلیق پاتے ہیں۔ کیا کسی ناقد کی نظر اس بازیافت کی متحمل ہوسکی؟ یا کسی شارح نے قارئینِ غالب کو یہ پرواز دی یا کسی شاعر نے پیکرِ غالب میں یہ رنگ اور نقش ونگار محسوس کیا۔ تفہیمِ غالب کے لیے ایک دانائے راز کی ضرورت ہے جو فلسفہ وفکر کے ساتھ شعر ونغمہ کا رمز شناس ہو اور تخلیق کے پُر اسرار اعجاز کا امین بھی ہو۔‘ (ص 121)

غالب کی عظمت کا جو اعتراف فکر وانتقاد کی رو سے اقبال کے یہاں ملتا ہے اس پر ہمارے ناقدین کی نظر نہیں گئی۔ آفریں کہیے عبدالحق کو جنھوں نے اس طرف توجہ کی ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے یہ بات تو مبرہن ہوتی ہے کہ اقبال نے غالب کے فکر وخیال سے استفادہ ہی نہیں کیا، بلکہ الفاظ اور بہت سی نادر تراکیب کی خوشہ چینی ضرور کی ہے۔ جس کے ثبوت کے لیے اس مضمون سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں؛

’اخذ واستفادے کی ان متعدد مثالوں میں اقبال کے شعری اظہار کی نوع بہ نوع کیفیات ملتی ہیں ان کی موجودگی سے نمایاں ہے کہ غالب کے اثرات کو اقبال نے کس قدر جذب کیا ہے اور لاشعوری طور پر ان کے کلام میں ان کا در آنا ایک فطری تقاضا بن کر حرف وصوت میں نمایاں ہوتا ہے۔‘ (ص 124)

’غالب واقبال کی شاعری کے چند انگریزی تراجم بھی خاصے اہم ہیں۔ غالب اور

اقبال کے شغف کا فیضان ہے کہ عبدالحق کی نظر خالی تحقیق وتنقید تک ہی نہیں بلکہ ان پر ہور ہے تراجم پر بھی ہے۔مزید ان تراجم کے معیار بھی پیش نگاہ ہے اور مترجم سے ہونے والے ترجمانی سہو سے بھی اچھی طرح واقف ہیں؛

'ڈاکٹر نکلسن کو اسرارِ خودی کے ترجمہ میں ایک مقام پر غلطی کے سبب ہدفِ تنقید بننا پڑا۔ڈاکٹر اینمری شمل بھی غلطی سے دوچار ہوئیں اور نہ جانے کتنے مترجمین مرتکب ہوئے۔'بانگِ درا' کے مترجم ڈاکٹر ایم۔اے۔کے خلیل بھی معتوب ہوئے۔انھوں نے سُعدیٰ کو سعدی پڑھ کر اس پر شیخ سعدی کے بارے میں حاشیہ بھی لکھا اور پیر کنعاں کو یوسف علیہ لکھا ہے۔ترجمہ کی پر خطر راہوں سے دامن بچا کر گزرنا پل صراط سے کم نہیں ہے۔موصوف اس مقام شوق سے آساں گزر گئے۔یہ ان کی فرزانگی اور زباں دانی تھی جو کام آتی رہی۔(ص134)

اس میں عبدالحق نے اقبال کے شکوہ کے کئی بندوں کے چند حضرات کے ترجمہ پر نظر ڈالی ہے اور اپنے نقطہ نظر کی رو سے خواجہ طارق محمود کے ترجمہ کو بہتر بتایا ہے۔

غالب کی غزلوں کے ترجمہ کئی ہیں، غالب کے اس شعر:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

کی کئی مترجمین نے انگریزی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان سب میں قرۃ العین حیدر کے ترجمہ کو مضمون نگار نے پسند کیا ہے:

To me the world is children at play
a passing show watch night and play

'غالب کے طرف دار: اقبال' مضمون میں عبدالحق نے اقبال سے فطری وعملی مناسبت کے ساتھ عقیدت مندانہ حد تک لگاؤ رکھنے کے باوجود غالب کو اقبال کا پیش رو تسلیم کیا ہے۔

یہ فطری حقیقت ہے کہ انسان کسی کی اتباع ضرورت اور فکری مناسبت سے ہی کرتا ہے۔مزید یہ بھی ہے کہ انسان اپنی تہذیب وروایت سے اسی حد تک ہی استفادہ کرتا ہے جو اس کے فکر وعمل میں معاون ہوتے ہیں، نہیں تو اس سے دامن کش ہو جاتا ہے۔اقبال نے اردو

شعرامیں سے سوائے غالب کے کسی اور کو لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ ہاں غالب پر توجہ خاص دی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اقبال کے مزاج سے میل کھاتے ہیں۔ اقبال نے غالب کو پیش کیے گئے منظوم خراج عقیدت میں ایسے نکات پیش کیے ہیں جو حالی بھی پیش کرنے سے قاصر رہے۔ عبدالحق لکھتے ہیں؛

'اگر اس نظم کا تجزیہ کیجیے تو یقین آئے گا کہ غالب کے فکر و فن اور شخصیت کے بعض ایسے نکات اقبال نے بیان کیے ہیں جن کا ذکر نہ تو حالی کی کتاب اور نہ ہی مرثیے میں ملے گا۔ دوسرے لفظوں میں غالب کے کمالات کا جو فکری اعتراف اس نظم میں ملتا ہے وہ غالب شناسی میں نقشِ اوّل یا نقشِ دوام کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ص156-155)

اس کتاب میں ضمیمہ کے طور پر تین شخصی مرثیوں کے حوالہ سے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ جس رثائی ادب میں میر انیس نے اپنے کلام کو جو وقار و معیار عطا کیا ہے۔ جس کی نظیر اردو ادب تو کیا دنیائے ادب فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ مگر وہ شخص بھی اپنے مشہور مرثیہ 'نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت مری' میں اپنی ہی قصیدہ خوانی کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں؛

'مرثیے میں ایسی خودستائی کی گنجائش نہ تھی۔ مگر مضامین نو کے ذخیرے سے صنف کو سیراب کرنے کی آرزو نے اپنی مداح لکھنے کے لیے مجبور کیا۔' (ص166)

اردو کا رثائی ادب بڑا مالا مال ہے۔ انیس اور دبیر نے مرثیہ کی صنف کو بلندی پر پہنچایا ہے۔ مگر ان کے یہ مرثیے ہماری اسلامی تاریخ کے دل دوز واقعہ یعنی شہیدانِ کربلا تک ہی محدود ہیں۔ اس صنف کی روایت شکنی نہ کہیے تو غالب نے اپنی غزل میں اپنے بھانجے کی موت پر جو نوحہ کہا ہے وہ شخصی مرثیہ کے ضمن میں آتا ہے۔ مزید آگے غالب کے شاگرد حالی نے خود غالب کا شخصی مرثیہ کہا ہے۔ اس کے بعد اقبال نے 'اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں'، 'مرثیہ داغ اور راس مسعود'، شبلی، حالی اور دیگر شخصی مرثیہ کہے اور جاں نثار اختر نے 'خاک دل' لکھا۔ ان نظموں کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں؛

'حالی و اقبال اور جاں نثار اختر کی یہ تینوں طویل نظمیں شخصی مرثیہ نگاری کی

تثلیث ہیں۔' (ص167)

انھوں نے ان تینوں نظموں کا بڑا خوبصورت تجزیہ کیا ہے جو اس حقیقت پر دال ہے کہ شخصی مرثیوں میں یہ نظمیں اردو ادب میں ایک بلند پایہ حیثیت کی مالک ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر بڑا فن کار حیات وزیست کے ادبی معاملات میں ساتھ بھی دیتا ہے اور رہنمائی بھی کرتا ہے۔ مزید یہ کہ جب کسی بڑے فن کار سے ناقد وقاری کی ذہنی وفکری نسبتیں ہوتی ہیں تو وہ ہر محاذ پر رہنما بن جاتا ہے۔ اقبال کے مطالعہ نے عبدالحق کو شعری فکر وفن کے بیشتر نکات سے آگاہی عطا کی ہے۔ جس کے باعث وہ کسی بھی عالم وفن کار کے تخلیقی وتنقیدی پہلو میں اقبال سے رشتہ کی ہمواری کے نکات دیکھ لیتے ہیں۔ اقبال نے اپنے پیش رووں میں سب سے زیادہ اگر کسی سے استفادہ اور استناد کیا ہے تو وہ غالب ہی ہیں۔ میر، سودا، ذوق اور مومن کے کلام سے استفادہ نہ کر سکے شاید وہ ان کے مزاج سے سروکار نہیں رکھتے۔ میر کی پستیٔ فکر کو وجہ جواز بتاتے ہوئے موصوف رقمطراز ہیں؛

'اقبال نے شاید اسی سبب ان شعرا سے استفادے اور استناد سے گریز کیا ہے۔
میر کی پستیٔ فکر کیسے قبول کی جاسکتی تھی، جس میں اس طرح کے اشعار ہوں:

جو حیدری نہیں اسے ایمان ہی نہیں
ہو گر شریف مکہ مسلمان ہی نہیں'

(ص174)

مومن اور غالب معاصرین ہیں۔ جب ڈاکٹر ضیاء احمد بدیوانی نے اقبال کو دیوان مومن ارسال کیا تو اقبال نے اس پر تبصراتی نوعیت کا خط مرسل کو بھیجا، جس میں انھوں نے مومن کے سوقیانہ پن کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ جس میں انھوں نے بیدل اور غالب کے کلام میں ابہام کو بھی تشنہ بیانی سے تعبیر کیا ہے۔ اس خط کے حوالہ سے عبدالحق صاحب نے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔

زیر مطالعہ کتاب کا ایک اہم اور خیال افروز مضمون 'قصائد ذوق کی تفہیم' ہے۔ ذوق کے تعلق سے شاعری میں سب سے مشکل موضوع پر گفتگو کرتے وقت مقالہ نگار نے فارسی اور اردو قصیدہ

نگاری کے بڑے اہم نکات کو حوالے میں لاکر اسے گراں قدر بنا دیا ہے۔قصیدہ نگاری میں دو اہم نام سودا اور ذوق ہیں۔ذوق،سودا،مومن اور غالب کے ہم دوش نہیں ہیں۔قصیدہ اردو ادب کی سب سے مشکل صنف سخن رہی ہے۔جو ہر کس و ناکس شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔کیوں کہ قصیدہ شاعر کے طبعی میلان کے ساتھ کسب و ریاض کا حد درجہ متقاضی ہے۔ذوق کی طبیعت قصیدہ نگاری کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتی تھی۔وہ تو درباری شاعر ہونے کے ناتے وقتی تقاضیٰ پورا کرتے تھے۔مزید یہ بھی کہ ہر شاعر دربار میں رسائی اور عزت کے حصول کے لیے قصیدہ لکھا کرتا تھا۔

'قصیدہ نگاری ان کی طبیعت کا تقاضا نہیں ہے بلکہ سلطنتِ شاہی سے منسلک ہونے،انعام واکرام کی سرخ روئی خواص وعوام میں عزت کے حصول کے لیے قصیدے لکھے گئے۔ساتھ ہی غالب کے قول کی روشنی میں عصری تقاضوں سے بھی مجبور تھے۔کیوں کہ شاعری کی عظمت قصیدہ نگاری پر قائم تھی اور فن کو تسلیم کرانے کے لیے قصیدہ لکھنا از بس ضروری تھا۔آخری مغل تاجدار مدح کے سزاوار تھے۔کیوں کہ ذوق ان کے نمک پروردہ تھے۔'(ص 185)

انھوں نے غالب،مومن کے ساتھ محسن کاکوروی اور اقبال سہیل کے خوش آہنگ نعتیہ قصیدے کا ذکر بھی کیا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے جدید کے ساتھ کلاسکی شعرا کو پڑھا اور سمجھا ہے۔جس کی شہادت ان کے مقالات میں ملتی ہے۔اردو ادب میں ان کی نقد و نظر کا یہ عالم ہے۔کہ کسی شاعر کے کلام پر ان کی رائے قارئین اور ناقدین کے لیے توجہ طلب ہوتی ہے کیونکہ ان کی تحریروں کے مطالعہ سے فکر انگیز نکات ناگزیر حقیقت بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ان کی تحریروں کا یہ خاص وصف ہے۔جو ہماری فکری وسعتوں کو فروغ دیتا ہے۔اور کچھ سوچنے کے لئے نئے امکانات روشن کرتا ہے۔ساتھ ہی تحریر کی جمالیاتی دلکشی سے ہمیں سرشار بھی کرتا ہے۔خیال افروزی اور انبساط بخشی کو ہم ان کے امتیازات میں شمار کرتے ہیں۔انتقادی نظریات کے خشک و تر سے قطع نظر پروفیسر موصوف نے تنقید کو تہذیبی اقدار اور صالح افکار سے ہم آہنگ کر کے تخلیقی تفہیم کی نئی طرح ڈالی ہے۔

ڈاکٹر سرفراز جاوید،دہلی یونیورسٹی،دہلی میں ریسرچ اسوسی ایٹ ہیں۔

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2019, P:326-344
Mr. Mohd. Tariq, Tarjuma aur Nazaria-e-Mudakhlat

محمد طارق

ترجمہ اور نظریۂ مداخلت

ترجمہ کثیر لسانی دنیا میں انتہائی ناگزیر عمل ہے۔ زبان، خیالات، احساسات، تہذیب، ثقافت، تمدن، علوم وفنون کا تبادلہ اوران سے استفادہ اس سہارے کے بغیر تقریباً ناممکن ہے۔ دنیا کی معلوم تاریخ سے یہ عمل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس کی ضرورت میں اضافہ ہورہا ہے اور بڑھتی ضرورت سے اس کی اہمیت مزید سے مزید تر ہوتی جارہی ہے۔ موجودہ دور میں ترجمہ مختلف ممالک میں رہنے والے انسانوں کے مابین تعلقات کی استواری کے لیے ایک اہم ذریعے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

آج کا دور علمی دھماکے کا دور ہے، ایک دھماکے کے ساتھ علم پوری دنیا میں پھوٹ پڑا ہے۔ مجموعی طور پر علم کی سطح ماضی کے مقابلے کہیں زیادہ بلند ہو چکی ہے۔ ہر روز نئی ایجادات سامنے آتی ہیں۔ ایک ایک شعبۂ علم کی کئی کئی شاخیں بن چکی ہیں۔ ایسے حالات میں ترقی پذیر ممالک وزبانوں کے لیے ترقی کی دوڑ میں برقرار رہنے کا اہم ترین راستہ ترجمہ ہے۔ جو زبانیں اس میدان میں پیچھے رہ جائیں گی وہ ترقی کے میدان سے بھی باہر ہو جائیں گی۔ آج کوئی زبان ترجمے کے بغیر جدید اور ترقی یافتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

اصول فطرت یہی ہے کہ جو چیز جتنی اہم اور ضروری ہوتی ہے اس کی قدر ومنزلت اور اہمیت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کو اسی کے بقدر پذیرائی ملتی ہے۔ اس کام میں مصروف کار افراد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سماج ومعاشرے میں ان افراد کو معزز ومحترم شمار کیا جاتا ہے؛ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ترجمے کے ساتھ لوگوں کا رویہ اس اصول کے برعکس ہے۔ اصولاً تو ترجمہ

اور ترجمہ نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے، مترجمین کے عمل کو سراہا جانا چاہیے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ترجمہ اور مترجمین ہمیشہ سے عتاب کا شکار رہے ہیں۔ ابتدا میں ترجمہ کو گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ مترجمین کو ''نمک حرام، اور ''غدار'' کے لقب سے نوازا گیا۔ بہت سے مترجمین کو اس کارِ عظیم کے عوض زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مرورِ ایام کے ساتھ اس سلسلے میں نرم گوشہ پیدا ہوا اور خیالات میں تبدیلی پیدا ہوئی لیکن اس کے باوجود ترجمے کو وہ مقام اب بھی نہیں مل سکا جس کا وہ حقدار ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ترجمے کی ضرورت و اہمیت کے مسلمہ ہونے کے باوجود زمانۂ قدیم سے اس کے تئیں منفی خیالات کیوں پائے جاتے ہیں؟ یہ سوال بادی النظر میں چاہے آسان اور سادہ نظر آ رہا ہو لیکن اس کا جواب اس قدر آسان نہیں ہے۔ ترجمے کے متعلق ان نظریات کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ترجمے کو تخلیق کے مقابل رکھ کر اس میں وہی تمام خصوصیات ولوازمات تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اصل تخلیق میں پائی جاتی ہیں۔ دانتے نے کہا تھا:

> "nothing wich is hamonized by the vond of the Muses can be changed it's own to another language without destroying all its sweetness" 1
>
> (جو چیز موسس کے گہرے ربط کے ذریعے ہم آہنگ ہوتی ہے وہ اپنی تمام تر مٹھاس کو برباد کیے بغیر اپنے آپ سے کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں ہوسکتی)

گویا اس طرح کے دیو مالائی متون کے ترجمے میں اصل کی تمام شیرینی ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے دانتے کی یہ منشا ظاہر ہوتی ہے کہ اصل متن میں موجود شیرینی اور خوبصورتی ترجمے میں بھی اسی طرح برقرار رہنی چاہیے جیسے اصل متن میں موجود تھی۔ لیوس جارج ہنری اس سلسلے میں اس بات کا تو اعتراف کرتا ہے کہ ترجمہ بحیثیت ترجمہ بہتر ہوسکتا ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ ترجمہ اصل کی بازتخلیق نہیں ہوسکتا 2۔ اسی طرح مشہور نظریہ ساز وارین نے اچھے ترجمے کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ اسے اصل کی طرح پڑھا جانا چاہیے 3۔ ترجمہ شدہ متن کے مطالعے کے دوران قاری کو یہ نہ محسوس ہو کہ یہ ترجمہ ہے؛ بلکہ اسے یہ احساس ہو کہ وہ جس متن کا مطالعہ کر رہا ہے وہ اسی (ہدفی) زبان میں لکھا گیا ہے۔ رفیق خاور مصنف و مترجم کو ایک شاخ پر چہچہانے والے

دو ایسے پرندوں سے تشبیہ دیتے ہیں جن کا نغمہ ایک ہے لیکن آہنگ مختلف ہے4۔ عابد حسین کی نظر میں کسی ترجمے کو ادبی قدر و قیمت اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب ایک زبان سے دوسری زبان میں مفہوم کے ساتھ وہ آب ورنگ ، وہ چاشنی، وہ خوشبو، وہ مزہ بھی آجائے جو اصل عبارت میں موجود تھا5۔ بیرو (Berrow) کے خیال میں کسی ترجمے کی معراج یہ ہے کہ اس میں اصل کی باز گشت ہو6۔ مولانا صلاح الدین احمد معیاری افرادکار کی عدم دستیابی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک زبان کے فنکار کی روح کو دوسری زبان میں اس طرح داخل کرنا کہ ترجمے پر تصنیف کا گمان ہو، بہت کم اہل قلم کو ارزانی ہوا ہے7۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ترجمہ اور تخلیق دونوں میں یکساں مماثلت تلاش کرنا، ترجمے کو تخلیق کے مدمقابل رکھ کر تعین قدر کرنا اور معیار و میزان مقرر کرنا درست رویہ ہے؟ کیا ترجمے کی یہی خصوصیت اصل ہے کہ وہ ترجمہ نہ رہے بلکہ ہدفی زبان میں اس کی حیثیت تخلیق کی ہوجائے؟ ہدفی قارئین تخلیق سے جو حظ اٹھاتے ہیں وہی حظ اور لطف انہیں ترجمے میں بھی میسر ہو؟ ان سوالات کی تہہ میں جائیں تو متعدد مباحث زیر بحث آئیں گے جن میں سب سے اہم اور بنیادی بحث یہ ہوگی کہ جب مترجم اصل زبان کے متن کو ہدفی زبان میں منتقل کرتا ہے تو اس کے پیش نظر کس چیز کی منتقلی ہوتی ہے: لفظ کی یا مفہوم کی۔ اس سلسلے میں دو گروہ ہیں: ایک گروہ لفظ کو اولیت وفوقیت دیتا ہے اور اسے امانت داری سے تعبیر کرتا ہے، جبکہ دوسرے گروہ کے نزدیک اصل اہمیت مفہوم کو حاصل ہے؛ کیونکہ کلیتاً لفظ کی رعایت سے عبارت پیچیدہ اور بے معنی بھی ہوسکتی ہے یا کم از کم ہدفی قارئین کے مذاق پر ضرور گراں گزرے گی؛ جس کی واضح مثال شاہ رفیع الدین کا ترجمۂ قرآن ہے جس میں لفظ کی جگہ پر لفظ رکھ دیا گیا تھا۔ خلیق انجم اس ترجمے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یہ ترجمہ لفظی تھا۔ یعنی قرآن شریف کے ہر لفظ کا اس طرح ترجمہ کیا گیا کہ اردو فقروں کی ساخت بالکل بدل گئی۔ اس ترجمے میں سلاست اور روانی نہ ہونے کی وجہ سے اصل مفہوم سمجھنا مشکل تھا'' 8

اس ترجمے میں اصل متن کی تو بھرپور رعایت برتی گئی لیکن ہدفی زبان کے مزاج، محاورات اور اسلوب کو یکسر نظرانداز کردیا گیا تھا اسی بنا پر ترجمہ اصل سے حد درجہ مماثل ہونے کے

باوجود عمدہ نہیں شمار کیا گیا۔

جو لوگ مفہوم کے ترجمے کی وکالت کرتے ہیں ان کا یہ ماننا ہے کہ جس طرح تصنیف کا بنیادی مقصد متن کی تفہیم ہوتا ہے اسی طرح ترجمے کا مقصد بھی وہی ہونا چاہیے۔ مرزا حامد بیگ اس قسم کے تراجم کو مکھی پر مکھی مارنے کا عمل قرار دیتے ہیں9۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترجمے میں لفظ نہیں بلکہ مفہوم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی خیال کی وکالت خلیق انجم نے بھی کی ہے کہ ترجمے میں الفاظ عزیز نہیں ہوتے اور نہ ہی اس کی لسانی خوبیوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ لفظوں کی شکل وصورت، ان کے تلفظ اور ان کے حسن اور موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ دلچسپی ہوتی ہے تو صرف اس شے سے جو لفظوں کا لباس پہنے لفظوں کے پرے کسی طلسمی راز کے طور پر موجود ہوتی ہے10۔

یہ بات بظاہر تو بہت عمدہ معلوم ہوتی ہے لیکن دو وجوہات کی بنا پر کلی طور پر درست نہیں۔ اول یہ کہ کسی بھی تحریر کا منشا صرف مفہوم کی ترسیل نہیں ہوتا۔ علمی تحریروں کے متعلق تو کسی حد تک یہ بات درست ہے لیکن ادبی تحریروں میں صنعتوں کے استعمال اور الفاظ کی بازیگری کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صرف مفہوم منتقل کرنے پر ہی توجہ مرکوز کریں تو ہدفی زبان ترجمے کی راہ سے اصل زبان سے جو استفادہ کرتی ہے اس کے مواقع مفقود ہو جائیں گے۔ محمد حسن عسکری نے وضاحت کے ساتھ یہ بات بیان کی ہے کہ جن ترجموں سے تخلیقی ادب پر کوئی اثر نہ پڑے ان کا جواز کیا ہے؟ ترجمے کا تو مقصد ہی یہی ہونا چاہیے کہ خواہ ترجمہ ناکام ہو جائے مگر ادیبوں اور پڑھنے والوں کے سامنے ذرائع اظہار کے نئے مسائل آئیں11۔

کیا یہ ممکن ہے کہ مفہوم کو ملحوظ رکھا جائے تو ترجمے کا حق ادا ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ترجمے میں مفہوم کے ساتھ ساتھ مضمون بھی اسی قدر اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مضامین کا تعلق بھی زبان سے ہوتا ہے۔ ہر زبان میں کچھ خاص مضامین زیادہ فٹ ہوتے ہیں جو دوسری زبان کے لیے نئے اور اس کے متعین و مقرر سانچے میں اس قدر چست درست نہیں بیٹھتے، مثلاً جس زبان کے اندر فلسفیانہ و سائنسی مضامین کا ڈھانچہ مضبوط نہ ہو ایسی زبان کے قارئین کے لیے کچھ بھی کر لیں اس کی پیچیدگی اور اغماض بہر حال برقرار رہے گا۔ اکبر الہ آبادی اپنے ایک

ترجمہ کے متعلق کہتے ہیں:

''جہاں تک ممکن تھا میں نے لفظی ترجمہ کیا ہے اور مصنف کے سلسلۂ خیالات کو ذرا برہم نہیں ہونے دیا۔ فقروں کی ترکیب کی پیچیدگی دور کی ہے۔ معانی کو کامل اور روشن کرنے کے لیے ایک لفظ کے ترجمے میں حسب ضرورت دو اور تین تین لفظ رکھ دیے ہیں لیکن خیالات پیچیدہ کا سہل کرنا میرا کام نہیں تھا۔''12

مذکورہ بالا اقتباس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو کئی چیزیں قابل غور نظر آتی ہیں جن میں اہم بات یہ ہے کہ کیا فقروں کی پیچیدگی دور کرنے اور معانی کو روشن کرنے کے لیے الفاظ کی تعداد میں اضافہ کر دینے کے بعد بھی ترجمہ لفظی ہی رہتا ہے؟ بہر حال ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود ترجمے میں پیچیدگی اپنی جگہ قائم ہے۔ وہ اس لیے کیونکہ مضمون یا اصل متن ہی پیچیدہ ہے تو ہدفی زبان میں اسے سہل کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

ترجمے کے نظریات میں مختلف النوع تضادات کی وجہ یہ ہے کہ ترجمہ بذات خود انتہائی پیچیدہ مضمون ہے جس کا اندازہ تھیوڈر ساوری کے ترجمے سے متعلق جمع کردہ باہم متضاد اصولوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ترجمے کے متعلق اس قسم کے مباحث کی بنیاد کیا ہے؟ وہ کیا وجوہات اور اسباب و عوامل ہیں جن کی وجہ سے ترجمہ نگاری ایک پیچیدہ عمل بن جاتی ہے؟ کیوں ایک ہی بات دو زبانوں میں یکساں نہیں رہ پاتی؟ اور کیوں ایک ہی چیز بیان کرنے میں مصنف اور مترجم الگ الگ نظر آتے ہیں؟

اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ تصنیف و ترجمہ دونوں کی حیثیت جدا ہے۔ وہ اس طرح کہ تصنیف میں صرف دو واسطے ہوتے ہیں ایک خیالات جو مصنف کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں دوسرے وہ زبان جس میں مصنف ان خیالات کو منتقل کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصنف اپنے خیالات اور احساسات کی ترجمانی براہ راست اپنی زبان میں کرتا ہے۔ یہ بات تقریباً متفق علیہ ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے اسے صد فی صد تحریری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک ترجمے کا سوال ہے اس میں اگر انتہائی توسع سے کام لیں تب بھی کم از کم

ایک واسطہ یعنی ہدفی زبان کا اضافہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو ترجمہ وسیلہ در وسیلہ بلکہ تسلسل وسائل سے گزر کر ہدفی زبان کے متن میں وجود پذیر ہوتا ہے۔ جس قدر وسائل بڑھتے جائیں گے اصل سے دوری میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

اس مقام پر مادری زبان کی اہمیت کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ ایک ہی زبان میں دو افراد تصنیفی و تخلیقی عمل انجام دیں جن میں ایک فرد کی وہ مادری زبان ہو اور دوسرے شخص کی ثانوی۔ جب ایسے دو افراد کی تحریروں کا موازنہ کیا جائے گا تو اس میں واضح فرق ظاہر ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک ہندوستانی شخص کی انگریزی تحریر کا مطالعہ کریں اور اسی موضوع پر ایک انگریز (جس کی مادری زبان انگریزی ہو) کی تحریر کا مطالعہ کریں دونوں تحریروں میں بالکل واضح فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی مصنف اپنی تحریر میں جو تشبیہات، استعارات، تمثیلات، محاورے، کہاوتیں استعمال کرے گا اس میں کہیں نہ کہیں ہندوستانیت نظر آئے گی۔ اس کا اسلوب بہر صورت مختلف ہوگا۔ بہت سے ایسے مصنفین بھی ہوسکتے ہیں جن کی ثانوی زبان انتہائی معیاری بلکہ مادری زبان بولنے والوں سے بھی اچھی اور شستہ ہو؛ لیکن ان تمام خوبیوں سے آراستہ ہونے کے باوجود اس میں مادری زبان کی باریکی و لطافت کلی طور پر نہیں پیدا ہوسکتی۔ ایک شخص جس کی ابتدائی نشو و نما کسی خاص خطے میں ہوئی پھر کچھ عرصے بعد وہ کسی دوسرے علاقے میں آباد ہوگیا، جہاں کی مادری زبان اس کی مادری زبان سے الگ ہو، تو وہاں پر سالوں گزارنے کے بعد بھی اس کی زبان میں وہ بات نہیں پیدا ہوسکتی جو مادری زبان بولنے والوں میں ہوتی ہے۔ زبان کی بات تو دور کی ہے لہجے پر مکمل کنٹرول نہیں ہوسکتا، مثال کے طور پر ایک شخص لکھنو کا رہنے والا ہو، اپنی عمر کے چند سال گزارنے کے بعد حیدرآباد میں آکر آباد ہوجائے اور یہاں کے رنگ میں اپنے آپ کو ڈھال لے، یہاں کے لہجے کو اپنانے کی کتنی بھی کوشش کرے اس کے اندر کچھ کمی ضرور باقی رہے گی۔ اہل حیدرآباد گرفت کرلیں گے کہ یہ شخص یہاں کا رہنے والا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ الفاظ، روز مرہ، محاورے اور ان کے محل استعمال ایسے ہوتے ہیں جن سے اسی خاص خطے کے لوگ ہی واقف ہوتے ہیں۔ یہی مثال ہر جگہ اور ہر زبان کے تعلق سے دی جاسکتی ہے۔

جب مادری اور ثانوی زبان کا فرق رکھنے والے دو افراد کی ایک ہی زبان میں پیش کی

جانے والی تحریر یکساں نہیں ہوسکتی تو اصل متن اور ترجمہ شدہ متن دونوں یکساں کیسے ہوسکتے ہیں، دوسرے میں پہلے کی تمام تر صفات کیسے منتقل ہوسکتی ہیں۔ مصنف اور مترجم دونوں کے درمیان معمولی مگر انتہائی دبیز فرق ہے: مصنف مادری زبان میں سوچتا ہے اور مادری زبان میں ہی تخلیق کرتا ہے اور مترجم ثانوی زبان سے (عموماً) مادری زبان کا سفر کرتا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ ترجمہ منتقلی کا عمل ہے نہ کہ نقل کا اور کسی چیز کو دوسری جگہ یا چیز میں منتقل کرنے میں کمی بیشی کا ہونا لازمی ہے خصوصاً اس صورت میں جب کہ وہ شئے یا مقام اس کیفیت سے مختلف ہو جس سے منتقل کیا جارہا ہے جیسے ترجمے میں زبان اور فرد کی تبدیلی۔ اس تمہیدی گفتگو کے بعد اب مداخلت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

نظریۂ مداخلت اپنے واضح تصور کے ساتھ سب سے پہلے انگریزی اور مغربی زبانوں میں سامنے آیا جس کے لیے Intervention کی اصطلاح رائج ہے جو Intervene سے ماخوذ ہے۔ اردو میں اس کا متبادل لفظ 'مداخلت' ہے جس کی اصل عربی مصدر داخل مداخلۃ ہے۔ انگریزی لغات میں اس کے کئی معانی مذکور ہیں جیسے کسی کام یا کسی چیز کی کیفیت میں خارجی عنصر کی طرح داخل ہونا، کسی عمل یا نتیجے کو روکنے یا اس پر اثر انداز ہونے، اس کی تصحیح کے لیے درمیان میں شامل ہونا، کسی کیفیت میں اس کو فروغ دینے یا اس میں معاونت کے لیے شرکت کرنا، اس کے علاوہ اور بھی معانی مذکور ہیں ان سب میں ایک مفہوم مشترک یہ ہے کہ کسی شئے یا کام کے درمیان میں داخل ہونا یا شامل ہونا۔ انگریزی اردو ذولسانی لغت میں بیچ میں آنا، حائل ہونا، بیچ بچاؤ کرنا، مداخلت، کوئی ایسا اتفاقی واقعہ ہونا جس سے نتیجہ بدل جائے، فریقین کی ملاقات میں دخل اندازی کر کے اختلافات دور کرنا یا کسی فریق کی مدد کرنا، دخل دینا، مداخلت توسط، اور یک لسانی اردو لغات میں دخل اندازی، دست درازی، مزاحمت، تعرض، قبضہ، قابو، تصرف جیسے معانی مذکور ہیں۔

مذکور معانی کا اگر جائزہ لیا جائے تو تمام مترادفات میں ایک بنیادی مشترک معنی شمولیت کا پایا جاتا ہے۔ البتہ ثانوی معنوں میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ جو شمولیت یا دخول ہو رہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے۔ اس سلسلے میں اردو کی یک لسانی لغات کے علاوہ دیگر لغات کے اندر مثبت شمولیت کا اشارہ ملتا ہے جیسے دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں کسی عمل، نتیجے کو روکنا یا اس پر اثر

انداز ہونا اوراس کی تصحیح کے لیے درمیان میں شامل ہونا،اسی طرح آکسفورڈ ڈکشنری میں فروغ دینے یا معاونت کے لیے شرکت کا مفہوم شامل ہے۔قومی انگریزی لغت میں فریقین کے درمیان اختلافات کو دور کرنے کے واسطے دخل اندازی کی بات کہی گئی ہے۔مولوی عبدالحق کی ڈکشنری میں بیچ بچاؤ کا لفظ موجود ہے۔المورد الحدیث میں واضح انداز میں لکھا گیا ہے کہ اس انداز میں وقوع پذیر ہونا جس سے نتیجے میں تبدیلی واقع ہو یا اس سے نتیجے پر اثر پڑتا ہو۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کسی چیز، حالت یا کیفیت میں اس طرح شامل ہونا یا داخل ہونا جس سے اس چیز، حالت، کیفیت میں کسی خاص قسم کی تبدیلی واقع ہو جائے خواہ اس کا نتیجہ ہی بدل جائے یا صرف اس پر کوئی خاص اثر ثبت ہو۔قومی انگریزی لغت میں توسط اور وسیلہ کا معنی بھی دیا ہوا ہے جس سے مفہوم اور واضح انداز میں سامنے آتا ہے کیونکہ مداخلت ایک وسیلہ ہی ہے جس کے توسط سے اصل متن کے مواد کو ہدفی زبان میں مزید بہتر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

البتہ اردو کی یک لسانی لغت میں اس قدر وضاحت کے ساتھ یہ مفہوم نہیں ہے بلکہ اس میں کسی قدر منفی رجحان ظاہر ہوتا ہے مثلاً دست درازی کرنا، مزاحمت کرنا وغیرہ اور اسی طرح اردو میں جو مرکب الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کی ترکیب میں بھی منفیت جھلکتی ہے؛ کیونکہ اردو میں ''مداخلت بلا مرضی، مداخلت بے جا'' جیسے الفاظ رائج ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں عام طور پر اس لفظ سے متعلق منفی رجحان پایا جاتا ہے لیکن صرف منفی رجحان ہی ہو ایسا بھی نہیں ہے کیونکہ ان تمام معانی اور مرکب ترکیبوں کے ساتھ ساتھ 'بیچ میں بولنا اور تصرف' جیسے معانی بھی شامل ہیں۔مزید یہ کہ اگرچہ اردو زبان کا حصہ ہونے کے بعد اس لفظ کے اپنے معنی متعین ہو گئے مگر اس کے باوجود اس کی اصل عربی ہی ہے اور عربی معانی میں واضح طور پر اثبات جھلکتا ہے، لہٰذا اصل کا اعتبار کرتے ہوئے اور خود اردو معنی میں موجود امکانی اثبات کے پیشِ نظر اس کو مثبت قرار دینے میں کوئی تعجب، حیرت اور تردد نہیں ہونا چاہیے۔

جب اتنی بات اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ مداخلت کا معنی اور مداخلت کا معنوی رجحان کیا ہے تو اب ہم مداخلت کے اصطلاحی مفہوم پر گفتگو کریں۔

شہباز حسین نے ترجمے کے عمل کو جوہری کے نگینہ جڑنے سے تشبیہ دی ہے 13۔ جس

طرح تراش خراش سے قبل نگینہ کی حیثیت ایک عام اور معمولی پتھر کی ہوتی ہے خواہ ماہرین کی نظر میں اس کی کتنی ہی قیمت ہو۔ اسے کتنا بھی نادرونایاب اور بیش قیمت بتایا جائے کوئی اسے خریدنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اسی طرح اصل زبان کا متن ایسے لوگوں کے لیے جو اس زبان سے واقف نہیں ہیں بے معنی اور ناقابل استفادہ ہوتا ہے۔ خواہ اس کے اندرون میں علوم ومعارف کے کتنے ہی نکتے بیان کیے گئے ہوں۔ ہیرا تراشنا انتہائی نازک اور باریک ودقیق کام ہے۔ ہر کس وناکس کے ہاتھوں یہ کام نہیں سونپا جاسکتا کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے نگینہ محض ایک بے قیمت پتھر بن کر رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کام کے لیے ماہرین کی خدمت لی جاتی ہے جو بڑی عرق ریزی اور محنت کے ساتھ یہ کام انجام دیتے ہیں؛ اس کے باوجود حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ کامیاب ہی ہوں گے، ناکامی کا اندیشہ برابر قائم رہتا ہے لیکن اس کے باوجود تراش خراش کا عمل بھی جاری رکھا جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر ایک پتھر ہیرا نہیں بن سکتا۔ ان تمام مشکل مرحلوں سے گزرنے کے بعد اس کو جڑنا اس قدر پرخطر کام ہے کہ اگر ذرا سی بے احتیاطی برتی گئی اور تھوڑی سی کم توجہ دی گئی تو اس سلسلے میں جتنی محنتیں ہوئیں ہیں وہ سب اکارت اور بے کار ہو جائیں گی۔ اسی طرح ترجمہ بھی عموماً اہل لوگ (گوکہ اہلیت کا معیار انتہائی مختلف فیہ ہے) ہی کرتے ہیں۔ مترجم کتنا ہی ماہر ہو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا ہے وہ ترجمے کا حق ادا ہی کرے گا۔ ترجمہ ناکام ہو جانے کے اندیشہ کے باجود ترجمہ کا عمل جاری رکھا جاتا ہے۔ مترجم اپنی طرف سے بھرپور کوشش کرتا ہے کہ وہ اس میدان سے سرخرو نکلے۔ کامیابی اور ہدفی زبان وقارئین کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے وہ نگینہ ساز کی مانند محنت کرتا ہے۔ مترجم کی تراش خراش اور حد درجہ احتیاط ہی دراصل 'مداخلت' ہے۔ وینوٹی مداخلت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> The term intervention is used here to refer to translation decisions made deliberately "on the basis of textual effects, cultural values, social function that translations possess in target situations"[14]
>
> (مداخلت کی اصطلاح سے ترجمے کے وہ انتخابات مراد ہیں جو ترجموں کو ہدفی صورت حال میں لاحق متنی تاثرات، ثقافتی اقدار اور سماجی افعال کی

بنیاد پر دانستہ طور پر عمل میں لائے جاتے ہیں)

یہ بات معلوم ہے کہ ترجمہ مسلسل متبادلات کا عمل ہے۔ دوران ترجمہ مترجم کو ہر لمحے مختلف فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ وینوٹی کی مذکورہ بالا تعریف میں انتخابات میں تین انتہائی اہم باتیں ذکر کی گئی ہیں۔ایک یہ کہ یہ انتخابات ''متنی تاثرات، ثقافتی اقدار اور سماجی افعال'' کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں، دوسری یہ کہ یہ عمل ''دانستہ'' ہوتا ہے، تیسری یہ کہ اعتبار ہدفی صورت میں لاحق ہونے والے متنی تاثرات، سماجی و ثقافی اقدار کا ہوگا۔

وینوٹی کی عائد کردہ پہلی شرط ''دانستہ'' کی قید سے بالکلیہ اتفاق کرنا دشوار ہے؛ کیونکہ ترجمے کے دوران جو کچھ فیصلے ہوتے ہیں ضروری نہیں ہے کہ وہ سب دانستہ طور پر باضابطہ کیے جائیں بلکہ بہت سے ایسے انتخابات ہوتے ہیں جو مترجم سے غیر دانستہ سرزد ہوجاتے ہیں۔ مصنف کی طرح مترجم بھی اپنے گرد و پیش، ماحول، مزاج، تہذیب و تمدن کا پروردہ ہوتا ہے۔اس کے اپنے افکار اور اپنے احساسات بھی اس کے ساتھ کارکرد رہتے ہیں۔ جن کی بنا پر وہ بہت سارے فیصلے ایسے کرتا ہے جس کا خود اس کو احساس نہیں رہتا۔یہی فیصلے مترجم کو مخصوص شناخت اور اس کے ترجمے کو علیحدہ آہنگ عطا کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس کا ترجمہ دوسرے ترجموں سے ممتاز ہوتا ہے۔دوسری اہم بات یہ تھی کہ مترجم ترجمے کے دوران اپنے فیصلوں میں جن چیزوں کا لحاظ رکھتا ہے۔ان میں ''متنی تاثرات، ثقافتی اقدار اور سماجی افعال'' کو بنیاد بناتا ہے۔

''متنی تاثرات'': ہر متن اور ہر تحریر کا اپنا ایک خاص مزاج اور آہنگ ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص ایک تحریر پڑھتا ہے تو اس کے اندر خاص قسم کا وجدان نما تاثر پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایک مخصوص کیفیت سے دوچار ہوتا ہے جس کا زیادہ تر تعلق احساس سے ہوتا ہے۔ مصنف کی تحریر میں یہ کیفیت اس کے الفاظ کے انتخاب، جملوں کی ترکیب، بندش اور چستی، معنی آفرینی اور تہہ داری و دیگر اسباب و عوامل سے پیدا ہوتی ہے جیسے تشبیہات واستعارات وغیرہ کا استعمال۔ مترجم جب ترجمہ کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ جو تاثر اصل زبان کے قاری پر متن پڑھنے کے بعد ہوا وہی تاثر ہدفی قاری پر بھی قائم ہو۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ مختلف راستے و طریقے اختیار کرتا ہے۔

''ثقافتی اقدار'': دنیا میں بے شمار زبانیں بولی، سمجھی اور لکھی جاتی ہیں جو اپنی امتیازی

شناخت کے باعث دوسروں سے ممتاز ہیں۔ ہر زبان کی لسانی خصوصیات الگ الگ ہیں۔ ان کے استعارے، تشبیہات، روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال، طرزِ تحریر، رسم الخط، قواعد اور علامیے (Code) جداگانہ ہوتے ہیں۔ ہر زبان خاص علاقے، ماحول، مزاج اور کیفیت میں پروان چڑھتی ہے۔ خاص تہذیبی رنگ و آہنگ میں اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ مشہور مغربی ماہر لسانیات نام چامسکی زبان کو تہذیب کا جز قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ زبان دراصل تہذیب سے مختص ہے 15۔

زبان و تہذیب کے درمیان مضبوط اور گہرا رشتہ ہی نہیں ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر علاقے کی مخصوص تہذیب اس کے رہن سہن، طرز معاشرت، اخلاقیات، رسم ورواج کا واضح اثر وہاں رائج زبان پر نظر آتا ہے۔ علاقائی قربت سے تہذیبوں کی قدریں مشترک ہوتی ہیں اور بُعد میں اضافے سے قدروں میں اشتراک کم اور زبانوں کے درمیان اجنبیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دو لوگوں کے درمیان لسانی علامیے مشترک نہیں ہوتے تو گفتگو میں مشکل پیش آتی ہے جسے دور کرنے کے لیے دوسری زبان کو سیکھنا اور اجنبی علامیوں کو مانوس علامیوں میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ درحقیقت انہیں علامیوں کی منتقلی اور رمز کشائی کا نام ہے اور منتقلی متقاضی ہے حذف و اضافہ کی۔ اس سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے:

> ''علامیوں کے اس طرح منتقل کرنے میں ان کے معنی کا کتنا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ مثالی صورت یہ ہے کہ کچھ بھی ضائع نہ ہو۔۔۔ لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ بہت کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔ کیفیت کے اعتبار سے بھی اور کمیت کے اعتبار سے بھی'' 16

کس قدر ضیاع ہوتا ہے یہ ایک الگ بحث ہے لیکن مسلمہ امر یہ ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کے دوران بہت کچھ تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ لسانی نظام ترسیل میں تفاوت کے باعث دوران ترجمہ متبادل لانے میں پریشانیاں اور مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر فن پارہ مخصوص صفات سے متصف ہوتا ہے۔ الگ الگ تہذیبی ماحول میں رچی بسی زبانوں میں یہ اوصاف یکساں نہیں ہوتے اس لیے ایک کے فن پارے کو دوسرے میں بجنسہ

منتقل بھی نہیں کیا جاسکتا۔مترجم اصل زبان کے متن میں موجود ثقافتی اقدار، ہدفی زبان اور ہدفی قارئین کے وقوفی ماحول کو مدنظر رکھتا ہے اور ان میں ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اپنی زبان میں اس کے متبادلات لانے کی جدوجہد میں اسے اصل متن سے انحراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

''سماجی افعال'': ہر سماج دوسرے سماج سے ممتاز وجدا ہوتا ہے۔اس کے طور وطریق رسم ورواج علاحدہ ہوتے ہیں۔انداز فکر الگ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ بہت ساری ایسی صفات ہیں جن کی وجہ سے ہر سماج علاحدہ شناخت کا حامل ہوتا ہے۔سماج کی تشکیل میں عام طور پر ثقافت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے؛ بلکہ یوں کہیے کہ سماج وثقافت میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔لیکن ایک قابل غور بات یہ ہے کہ وینوٹی نے ''اقدار'' کی قید لگائی تھی۔یہی وہ قید ہے جو دونوں کو ممتاز بناتی ہے؛ کیونکہ بہت سے ایسے افعال واعمال ہوتے ہیں جو سماج کا حصہ بن جاتے ہیں، اس میں رچ بس جاتے ہیں اور لوگ ان کو سماج کا حصہ سمجھ کر انجام دینے لگتے ہیں لیکن وہ اس معاشرے اور اس قوم کے ثقافتی ''اقدار'' سے ہم آہنگ ہوں ضروری نہیں ہوتا، مترجم چونکہ اسی سماج کا پروردہ ہوتا ہے اور اسے اپنی کاوش بھی اسی سماج کے سامنے پیش کرنی ہوتی ہیں اور وہی سماج اس کا ہدفی قاری بھی ہوتا ہے۔اس لیے اس کو اس کی رعایت کرتے ہوئے اصل متن سے ہدفی متن کی تشکیل کے دوران حذف واضافہ اور تغیر وتبدل سے کام لینا پڑتا ہے۔

تیسری بات تھی ''ہدفی زبان کو لاحق'' ہونے کی یعنی مترجم جب ترجمے کے دوران مختلف وجوہات کے پیش نظر فیصلے کرتا ہے تو اس کے پیش نظر ہدفی صورت حال ہوتی ہے۔اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ متن کو اس سے ہم آہنگ کرے تاکہ ہدفی حالات میں ترجمہ غیریت کا احساس نہ پیدا کرے۔

وینوٹی کے بیان کردہ ان تین امور کے علاوہ اور بھی کئی ایسے میدان ہیں جن کا مترجم کو سامنا کرنا ہوتا ہے۔مذکورہ بالا تینوں باتوں کی طرح وہ بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جس کی ہلکی سی وضاحت کرتے ہوئے برین موساپ لکھتا ہے:

> "As a translator, I cannot write in no style,......I must intervene, more or less consciously, selecting one wording rather than other." 17ؕ

(بحیثیت مترجم میں کسی نہ کسی اسلوب میں ہی لکھوں گا۔ایک لفظ کے
بجائے دوسرے لفظ کے انتخاب میں مجھے کم یا زیادہ شعوری مداخلت کرنی
ہی پڑے گی)

مذکورہ بالا اقتباس میں دو باتیں پیش کی گئی ہیں، ایک اسلوب کا وجود اور دوسرے الفاظ کا انتخاب۔لیکن اس کے علاوہ بہت سے عوامل وعناصر مداخلت کا سبب بنتے ہیں۔جس طرح کسی تحریر میں مختلف عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے اسی طرح ترجمے میں بھی مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں کیونکہ مترجم کو تو خیالات کی منتقلی کے لیے دوطرفہ جنگ کرنی ہوتی ہے اولاً تو خود خیالات ہی اس کے اپنے نہیں ہوتے دوسرے زبان کی تبدیلی مزید بہت ساری مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔مترجم کو دو الگ الگ تہذیبوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ہر زبان کا اپنا مخصوص سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور جغرافیائی ماحول ہوتا ہے۔اس لیے مترجم کو اصل زبان کی ان خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی زبان کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔دونوں پہلوؤں کی رعایت سے ترجمے میں تبدیلی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔چنانچہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ترجمہ ہوگا جس کے متعلق یہ دعوی کیا جاسکے کہ اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔چینی نظریہ ساز لیو یا منگ بالکل صراحت سے یہ بات کہتا ہے کہ کوئی ترجمہ بغیر مداخلت کے وجود پذیر نہیں ہوسکتا 18۔ ملٹک مارکو مداخلت کو ترجمے کا لازمی جز مانتا ہے 19۔ جسف ورشیرن بھی اسی نظریے کا موید ہے۔اس کے خیال میں ہر مترجم یا ترجمان دوران ترجمہ یا ترجمانی لازمی طور پر مداخلت سے کام لیتا ہے 20۔

اتنی بات تو مسلم اور متفق علیہ ہوجاتی ہے کہ ترجمے میں مداخلت کی حیثیت ایک لازمی عنصر کی ہے۔تمام ماہرین فن ترجمہ نگاری اور عملی ترجمے سے وابستہ افراد اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں؛ مجبور بایں معنی کہ چاہے اس عمل کو وہ خیانت سمجھتے ہوں یا ضرورت بہر حال تردید کی کوئی صورت موجود نہیں ہے۔یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جب ایک زبان کا متن دوسری زبان میں منتقلی کے بعد ترجمہ شدہ متن کی صورت میں سامنے آتا ہے تو اصل متن اور ترجمہ شدہ متن دونوں ایک دوسرے سے کئی محاذوں پر مختلف ہوجاتے ہیں، اس سے نہ انکار ممکن ہے نہ احتراز اور نہ ہی اس کے بغیر ترجمے کا وجود ممکن ہے۔

ترجمہ دو اجنبی زبان بولنے والے افراد کے درمیان انجام پانے والی سرگرمی ہے جو علامیوں کی منتقلی سے انجام پاتی ہے۔ دوران منتقلی ایک مترجم کو بے انتہا دشواریوں اور مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ وہ بہت سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے، کچھ مسائل حل ہو جاتے ہیں اور کچھ لاینحل ہی رہ جاتے ہیں جس کی وجہ سے دوسری زبان میں علامیے کی رمز کشائی اصل زبان کے علامیے سے مختلف ہو جاتی ہے یا ہم آہنگ نہیں رہ پاتی۔ عدم یکسانیت کا نہ پایا جانا ایک مسلمہ اصول ہے؛ لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تغیر و تبدل کا یہ عمل کیوں، کب، کیسے، کہاں، کس سے اور کس قدر صادر ہوتا ہے؟ ترجمے کے جس نظریے میں یہ اور اس قسم کے مختلف سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس کے لیے اس وقت جو اصطلاح رائج ہے وہ ہے ''مداخلت''۔

مداخلت کی لغوی تحقیق سے بنیادی طور پر دو معنی سامنے آتے ہیں ایک عمومی شمولیت، دوسرے اصلاح و تبدیلی کے لیے شمولیت۔ مداخلت کی اصطلاحی تحقیق سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ جب ترجمے کا عمل انجام دیا جاتا ہے تو اس میں لسانی، تہذیبی، ثقافتی اور سماجی عناصر کی شمولیت کی بنا پر تغیر و تبدل ناگزیر ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ مداخلت کچھ خاص مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو لفظ و اصطلاح دونوں معنوں میں کلی مطابقت پائی جاتی ہے۔ یعنی شمولیت ہوتی ہے، شمولیت کے باعث تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے اور تغیر و تبدل کے پیچھے خاص مقصد بھی کارفرما ہو سکتا ہے۔

معنوی تحقیق میں منفی اور مثبت رجحان کا جو پہلو سامنے آیا ہے اس کو مدنظر رکھ کر گفتگو کریں تو ترجمے میں یہ دونوں رجحان کارفرما نظر آتے ہیں۔ اگر ترجمے میں جو تبدیلی یا اثر اندازی ہو رہی ہے وہ اس لیے ہے کہ متن کی مزید اصلاح ہو جائے اور اس کو وقوفی ماحول سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو اس صورت میں یہ مداخلت مثبت شمار کی جائے گی لیکن اگر اس کے برخلاف تبدیلی یا مداخلت متن کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے لیے کی جائے تو اس میں منفی پہلو پیدا ہو جائیں گے۔

ترجمے کے عمل کے دوران دو قسم کی مداخلتیں ہوتی ہیں: شعوری، غیر شعوری۔ اسباب و عوامل اور نوعیت سے قطع نظر ترجمے میں جو بھی مداخلت ہوگی وہ یا تو شعوری ہوگی۔ اس کے پیچھے

مترجم کا ارادہ کارفرما ہوگا، یا غیر شعوری ہوگی۔اس میں مترجم کی دانستہ کوشش یا فیصلے کا دخل نہیں ہوگا۔

شعوری مداخلت

ترجمے میں ہونے والی وہ مداخلت جس میں مترجم کے ادراک اور ارادے کا دخل ہو، مترجم یا ترجماتی ادارے کی پالیسی ومنصوبہ بندی کی کارفرمائی ہو، مترجم کے خاص ماحول، مزاج اور شناخت کا نتیجہ ہو یا لغوی ولسانی تقاضے کی تکمیل ہو، بہرصورت عمل ترجمہ میں انجام پانے والی یہ تمام سرگرمیاں شعوری مداخلت کا حصہ ہوں گی۔ شعوری مداخلت سے ترجمے کو مختلف رخ دیا جاتا ہے،اس کا مقصد اور اس کی افادیت طے ہوتی ہے،تہذیبی رنگ و شناخت کو دوسرے تہذیبی سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس میں مثبت ومنفی رجحانات پیدا کیے جاتے ہیں۔وقوفی ماحول، تسہیل، ڈسکورس اور ثقافت جیسے عوامل کی وجہ سے متن کو قابل رسا بنایا جاتا ہے۔ہدفی قارئین کے مزاج و مذاق کو ملحوظ رکھ کر متن کو قابل قرات بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ان عوامل کی پاسداری کرتے ہوئے الفاظ، معانی،قواعد،اسلوب، صنف، ہیئت وغیرہ مختلف سطحوں پر مداخلت کرنی پڑتی ہے۔مترجم کو دونوں زبانوں کے درمیان قابل قبول ہم آہنگی پیدا کرنی پڑتی ہے۔اس میدان میں مترجم کو ہر ہر قدم پھونک کر اور سوچ سوچ کر اٹھانا پڑتا ہے؛ مثالی صورت جس میں اصل کا کوئی حصہ ترجمے میں ضائع نہ، عملی ترجمے کے میدان میں ایک خیال موہوم ہی نظر آتا ہے۔ مترجم اصل زبان ومتن کا سرا تھامنے کی کوشش کرتا ہے تو ہدفی زبان ومتن کا سرا ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے اور ہدفی زبان ومتن کی رعایت کرتا ہے تو اصل زبان بالخصوص متن بے وفائی کی شکایت کرنے لگتا ہے، ایسی حالت میں دونوں سروں کو پکڑ کر آگے بڑھنا انتہائی دقت طلب ومحنت طلب کام ہے۔ ہر سنجیدہ مترجم پوری ایمانداری سے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ دونوں میں توازن قائم رکھا جائے اور راہ اعتدال اپنائی جائے۔جس قدر اعتدال وتوازن ہوگا ترجمہ اسی قدر بہتر مانا جائے گا۔

بسا اوقات مداخلت کے ذریعے اصل متن میں کتر بیونت کر کے عزائم ومنصوبوں کی تکمیل بھی کی جاتی ہے۔اپنی منشا کے مطابق معانی اخذ کر کے پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے،سیاسی مقاصد کے حصول میں مدد لی جاتی ہے۔اس قسم کے تمام امور شعوری مداخلت کے ذریعے ہی ممکن ہوتے ہیں۔

شعوری مداخلت میں ان امور پر غور کیا جاتا ہے کہ ترجمے کے دوران مترجم کن عوامل کی

بنیاد پر مداخلت کرتا ہے، وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے مترجم کو مداخلت کرنی پڑتی ہے، ان اسباب وعوامل کی رعایت کس حد تک ملحوظ رکھی جاتی ہے یا رکھی جاسکتی ہے، کن کن مقامات پر مداخلت کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں، کس قسم کی مداخلت متن کو بہتر بناتی ہے اور کون سی مداخلت متن کو خاص مقصد کے حصول کا ذریعہ بناتی ہے؟

غیر شعوری مداخلت

اس بات کا پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے کہ ترجمہ درحقیقت مسلسل متبادلات لانے کا عمل ہے۔ مترجم ہر لمحہ اصل زبان کے بالمقابل ہدفی زبان کے متبادل کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں بہت سے مقامات پر ایسی تبدیلی یا تغیر ہو جاتا ہے جس میں قصد وارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کے پس پردہ کسی قسم کی منصوبہ بندی یا پالیسی کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح کی تبدیلی یا مداخلت میں سب سے اہم کردار مترجم کی ذات ادا کرتی ہے؛ کیونکہ مترجم ہی عمل ترجمہ کی انجام دہی کرتا ہے۔

ہر مصنف کا اپنا خاص مزاج، لیاقت، استعداد، نقطۂ نظر اور عقیدہ ہوتا ہے، مخصوص ماحول اور تہذیب وثقافت میں اس کی نشو ونما ہوتی ہے۔ ایک خاص سماجی افعال کے اثرات اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس کو اسی ماحول اور رنگ میں اظہار فن کرنا ہوتا ہے، وہ جس زبان کو ذریعہ ترسیل بناتا ہے اس کا اپنا خاص رچاؤ ہوتا ہے۔ اس کی ساختیات وشعریات دوسری زبانوں سے مختلف ہوتی ہیں جس کی باریکیاں مصنف کے ذہن و دماغ میں گھر کی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کا اسلوب وطرز تحریر سب پر اس کی جھلک ہوتی ہے۔ مصنف جو کچھ تخلیق کرتا ہے وہ اسی ماحول میں تخلیق کرتا ہے۔ مصنف کے ساتھ جڑی یہ تمام خصوصیات مترجم کے ساتھ بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ لسانی، تہذیبی، معاشرتی، ثقافتی اثرات اس پر بھی مصنف کی ہی طرح طاری ہوتے ہیں لیکن اس کے سامنے یہ دشواری ہوتی ہے اسے اپنے اس خاص رنگ اور ذہنی ساخت سے ہٹ کر کسی غیر تہذیب کے پروردہ کی روح کو اپنی ذات پر طاری کرنا ہوتا ہے جو ناممکن تو نہیں لیکن انتہائی دشوار ضرور ہے اور بے انتہا کوششوں کے باوجود بھی اپنے رنگ و آہنگ سے بالکلیہ انقطاع ممکن نہیں ہے۔ اپنے وجود کو کلی طور پر اس طرح منہا کر دینا یا اپنی ساخت و پرداخت کے تمام اثرات

سے خود کو اس طرح پاک وصاف یا بے نیاز کر لینا کہ عمل ترجمہ میں اس کی جھلک بھی باقی نہ رہے ایک کار دشوار ہے؛ کیونکہ یہ چیزیں کسی بھی فرد کے ساتھ اس طرح پیوست ہوتی ہیں جیسے مقناطیس کے ساتھ قوت کشش؛ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی پیرا گراف کا ترجمہ یکساں صلاحیت و تجربے کے کئی افراد کرتے ہیں تو ان کے ترجموں میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جملہ ہے "He is no more" اس کے دسیوں متبادلات ہو سکتے ہیں جیسے مر گئے، انتقال کر گئے، انتقال فرما گئے، وفات پا گئے، اس دنیا میں نہیں رہے، دنیا سے کوچ کر گئے، دار فانی کو کوچ کر گئے، رحلت فرما گئے، مالکِ حقیقی سے جا ملے، آخرت کو سدھارے وغیرہ۔ اسی ایک جملے پر غور کریں تو دو چیزیں نکل کر سامنے آتی ہے، اول یہ کہ انگریزی جملے میں He واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اس کا لفظی اور درست ترجمہ ''گیا''، ''ملا''، ''سدھارا'' بھی ہو سکتا ہے ،لیکن اگر مترجم اس کے بجائے ''گئے''، ''ملے''، ''سدھارے'' استعمال کر رہا ہے تو اس کی پہلی وجہ تو سیاق ہے یعنی کس شخص کے متعلق بات ہو رہی ہے، کوئی عام آدمی ہے یا کوئی خاص شخصیت۔ دوسری چیز یہ ہے کہ شخصیت کے احترام کے لیے ''ملا'' کے بجائے ''ملے'' کا تصور مترجم کی صوابدید پر منحصر ہے جو اس کی ذاتی تربیت اور ترجیحات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ فرق مترجم کی اندرونی وفطری ساخت کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایک شخص کسی کے لیے ''گیا'' ہو سکتا ہے اور دوسرے کے لیے ''گئے''۔ مترجم اس سلسلے میں معذور ہوتا ہے کیونکہ وہ اس قسم کے الفاظ کا انتخاب کسی خاص پالیسی کے تحت عموماً نہیں کرتا۔

اسی طرح القاب وغیرہ کے استعمال کا مسئلہ ہے۔ اولاً تو اس میں لسانی مزاج کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے دوسرے تہذیبی سانچے کا بھی فرق ہوتا ہے مثلاً اردو میں القاب وآداب کے بے شمار الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو انگریزی زبان کے مزاج کا حصہ نہیں ہیں۔ اگر ترجمہ میں کسی ایسی شخصیت کا ذکر ہے جس سے مترجم واقف نہیں ہے یا ہے تو اس کے نزدیک اسے وہ وقار واہمیت حاصل نہیں ہے تو اس کے لیے آداب کے تقاضے ملحوظ نہیں رکھے گا بلکہ یوں کہیں کہ اس کو اس جانب توجہ ہی نہیں ہوگی، مثلاً ماہرین ترجمہ نگاری مونا بیکر، جرمی منڈے، وینوٹی وغیرہ کا نام آتا ہے تو ہم بڑی آسانی کے ساتھ لکھ دیتے ہیں ''مونا بیکر کہتی ہے'' اور اسی کے بعد اگلی سطر میں کسی اردو ماہر ترجمہ کا نام آتا ہے خواہ وہ اس میدان میں مذکورہ شخصیات سے کہیں کم تر ہو تو بھی ہم اس

کے ساتھ ''فلاں کہتے ہیں، رقم طراز ہیں، لکھتے ہیں'' استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی چیزوں میں توقیر یا تذلیل کا منشا نہیں ہوتا بلکہ سراسر ذہنی پرداخت اور ''روحانی سکون'' کا مسئلہ ہوتا ہے۔

اسی طرح جملوں میں الفاظ کے استعمال وغیرہ میں بھی مترجم انتخاب سے کام لیتا ہے۔ انتخاب کبھی شعوری بھی ہوتا ہے اور کبھی غیر شعوری بھی۔ نیز اس کا دارومدار بہت کچھ متن کی نوعیت پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ کوئی مترجم Blind کے لیے لفظ ''اندھا'' استعمال کرتا ہے اور دوسرا ''نابینا'' استعمال کرتا ہے۔ الفاظ کی بندش اور جملوں کی چستی میں بھی مترجم کا نادانستہ عمل کارفرما ہوتا ہے۔ ایک انگریزی جملے How so sweet is he کا ترجمہ ایک شخص ''وہ شخص کتنا پیارا ہے'' کرتا ہے اور دوسرا ''کتنا پیارا ہے وہ شخص'' کرتا ہے۔ نحوی ساخت اور بلاغت کی رو سے دونوں جملوں کی حیثیت جداگانہ ہے لیکن ہر شخص کو اس کا ادراک ہو اور اس کے بعد وہ اسے استعمال کرے ایسا نہیں ہوتا ہے۔ البتہ بعد میں مدیر زبان وغیرہ اس بات پر گرفت کرتے ہیں یا کرسکتے ہیں۔

اس قسم کی مداخلت کی بے شمار مثالیں مل جائیں گی، سب کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف ایک بات ہے اور وہ یہ کہ مشق ومزاولت اور تجربہ اس طرح کی مداخلت کی شناخت کے قابل بنا دیتا ہے۔ مترجم کو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی ذات کی شناخت کرے، وہ یہ محسوس کرنے کی کوشش کرے کہ کہاں وہ خود شامل ہو رہا ہے۔ غیر شعوری مداخلتوں کے متعلق صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کو تربیت و مشق کے ذریعہ تحت الشعور لایا جائے؛ تاکہ ایسا نہ ہو کہ ترجمے میں مصنف کی جھلک کم مترجم کا چہرہ زیادہ نظر آنے لگے۔

حوالہ جات

1۔ مرزا حامد بیگ، ترجمے کا فن، ص42

2۔ ایضاً، ص47

3۔ ایضاً، ص52

4۔ ایضاً، ص77

5۔ ایضاً، ص71

6۔ کلیم الدین احمد، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ص194

7۔ مرزا حامد بیگ، ترجمے کا فن، ص83

8۔ خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، ص12

9۔ مرزا حامد بیگ، ترجمے کا فن ص94

10۔ خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، ص26

11۔ محمد حسن عسکری، گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے، مشمولہ ترجمے کا فن اور روایت، قمر رئیس، ص115

12۔ مرزا حامد بیگ، ترجمے کا فن، ص50

13۔ شہباز حسین، ترجمے کی اہمیت، مشمولہ ترجمے کا فن اور روایت، قمر رئیس، ص180

14۔ Sarma, M. M. (2008). Translating Shakespeare Intervention and Universals in Translation. Trans-Kom, 74-87. Retrieved from http://www.trans-kom.eu/bd01nr01/trans-kom_01_01_06_Sarma_Translating_Shakespeare.20080707.pdf

15۔ خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، ص123

16۔ ایضاً، ص123

17۔ Munday, J. (2007). Translation as intervention. London: Continuum. pg,18-19

18۔ Munday, J. (2007). Translation as intervention. London: Continuum. pg, 54

19۔ Miletich, M. Reading gender in translation: Translator's intervention in Isaac Chocron's. Retrieved June 15, 2017, from http://gradworks.umi.com/35/56/3556840.html

20۔ Munday, J. (2007). Translation as intervention. London: Continuum. pg, 76

محمد طارق، شعبۂ ترجمہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر ہیں۔

29 نومبر 2018: نائب شیخ الجامعہ پروفیسر شکیل احمد کی الوداعی تقریب کا ایک منظر۔

9 جنوری 2019: یونیورسٹی کے اکیسویں ''یوم تاسیس'' سے خطاب کرتے ہوئے
سابق وائس چانسلر آگرہ و روہیلکھنڈ یونیورسٹیز پروفیسر محمد مزمل۔

5 فروری 2019: سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس ''فارسی زبان و ادب میں دکن (ہند) کا حصہ''
سے خطاب کرتے ہوئے سابق پارلیمانی اسپیکر، جمہوریہ اسلامی ایران پروفیسر غلام علی حدّ ادعادل۔

ISSN : 2455-0248

Adab-o-Saqafat

(Bi-Annual Research & Refereed Journal)

Issue No.: 8 **March, 2019**

Editor: **Mohd. Zafaruddin**

20نومبر 2018: یونیورسٹی کے ساتویں جلسۂ تقسیم اسناد کا ایک منظر۔

28فروری2019: تیسری اردو سائنس کانگریس میں ''توضیحی فرہنگ غذا اور تغذیہ'' کے اجرا کا ایک منظر۔

Directorate of Translation & Publications

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032, Telangana (India)

E-mail: dtpmanuu@gmail.com

website: manuu.ac.in, Mobile: 09347690095